نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (سورہ یوسف:۱)

ہم بیان کرتے ہیں ترے پاس بہت اچھا بیان

احسن القصص

(تفسیر سورۂ یوسف)

مؤلف

مولانا انوار احمد اعظمی خیرآبادی

استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

احسن القصص
(تفسیر سورۂ یوسف)

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ (سورہ یوسف:۳) ﴾

ہم بیان کرتے ہیں ترے پاس بہت اچھا بیان

احسن القصص

(تفسیر سورۂ یوسف)

مؤلف

مولانا انوار احمد اعظمی خیرآبادی

استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	احسن القصص (تفسیر سورۂ یوسف)
مؤلف	:	مولانا انوار احمد اعظمی
صفحات	:	۵۲۲
قیمت	:	
تعداد	:	
طبع اول	:	۱۴۲۶ھ ۲۰۰۵ء
طبع دوم	:	۱۴۳۴ھ ۲۰۱۳ء
طبع سوم	:	۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱		۳۴
۲	عرض مؤلف	۳۵
۳	دعائیہ کلمات: حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ	۳۷
۴	مقدمہ: حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ	۳۹
۵	زمانۂ نزول اور تعداد آیات ورکوع	۴۲
۶	وجہ تسمیہ	۴۲
۷	ماقبل سے ربط	۴۲
۸	فائدہ	۴۳
۹	شان نزول	۴۳
۱۰	واقعۂ یوسف علیہ السلام ہی کا انتخاب کیوں؟	۴۴
۱۱	واقعۂ یوسف علیہ السلام کو مرتب ومکمل بیان کرنے کی وجہ	۴۴
۱۲	فضیلت	۴۵
۱۳	مضامین سورہ کا خلاصہ	۴۶
۱۴	ترکیب ولغات	۴۷
۱۵	حروف مقطعات کے معنی کیا ہیں؟	۴۷
۱۶	معارف وحقائق	۴۸

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۷	ترکیب	۵۰
۱۸	معارف وحقائق	۵۰
۱۹	عربی زبان ہی اصل زبان ہے	۵۰
۲۰	قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل کرنے کی وجہ	۵۱
۲۱	تنبیہ	۵۳
۲۲	کیا قرآن کریم میں کوئی کلمہ غیر عربی نہیں ہے؟	۵۴
۲۳	قرآن کریم کامل ومکمل کتاب ہے	۵۴
۲۴	ترکیب ولغات	۵۶
۲۵	معارف وحقائق	۵۷
۲۶	یہ واقعہ احسن قصص کیوں؟	۵۸
۲۷	کیا قرآن کریم دوسری آسمانی کتابوں سے بے نیاز کر دینے والی کتاب ہے؟	۵۸
۲۸	ترکیب ولغات	۶۱
۲۹	معارف وحقائق	۶۲
۳۰	سجدہ سے کیا مراد ہے؟	۶۳
۳۱	خالہ بمنزلہ ماں کے ہے	۶۴
۳۲	اذ قال یوسف لابیہ الآیۃ کا مفہوم	۶۵
۳۳	ترکیب ولغات	۶۷

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۴	معارف وحقائق	۶۸
۳۵	قال یا بُنَیَّ لا تقصص کا مفہوم	۶۸
۳۶	برادران یوسف علیہ السلام کے حسد کی وجہ	۶۸
۳۷	خواب کی حقیقت	۶۹
۳۸	خواب کی قسمیں	۶۹
۳۹	خواب کے جزءِ نبوت ہونے کا مطلب	۷۱
۴۰	ہر شخص سے خواب کا بیان کرنا درست نہیں	۷۲
۴۱	فائدہ	۷۲
۴۲	خواب کی تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا ضروری نہیں	۷۳
۴۳	فائدہ	۷۴
۴۴	ترکیب ولغات	۷۵
۴۵	معارف وحقائق	۷۵
۴۶	وکذالک یجتبیک الآیۃ کا مفہوم	۷۵
۴۷	کیا برادران یوسف علیہ السلام نبی تھے؟	۷۷
۴۸	انبیاء علیہم السلام قبل نبوت بھی معصوم ہوتے ہیں	۷۷
۴۹	معارف وحقائق	۷۹
۵۰	حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہر انسان کے لئے عبرت ہے	۷۹
۵۱	برادران یوسف علیہ السلام کی تعداد اور ان کے اسماء	۸۰

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۵۲	ترکیب ولغات	۸۲
۵۳	معارف وحقائق	۸۳
۵۴	حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے والہانہ محبت کیوں تھی؟	۸۳
۵۵	ضلال سے کیا مراد ہے؟	۸۴
۵۶	ترکیب ولغات	۸۵
۵۷	معارف وحقائق	۸۵
۵۸	اقتلوا یوسف الآیة کا مفہوم	۸۶
۵۹	فائدہ	۸۸
۶۰	ترکیب ولغات	۹۰
۶۱	برادران یوسف علیہ السلام کا آپس میں مشورہ	۹۰
۶۲	ترکیب ولغات	۹۲
۶۳	معارف وحقائق	۹۳
۶۴	ارسله معنا غدا الآیة کا مفہوم	۹۳
۶۵	حضرت یعقوبؑ کے دل میں بھیڑیئے ہی کا خیال کیوں آیا؟	۹۳
۶۶	ترکیب ولغات	۹۸
۶۷	معارف وحقائق	۹۸
۶۸	فلما ذهبوا به الآیة کا مفہوم	۹۸
۶۹	واقعہ کی تفصیل	۱۰۰

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۷۰	کیا یہ وحی، وحی رسالت ونبوت تھی؟	۱۰۱
۷۱	کنویں میں رہنے کی مدت	۱۰۲
۷۲	فائدہ	۱۰۳
۷۳	معارف وحقائق	۱۰۴
۷۴	کیا ہر آنسو حقیقت ہوتا ہے؟	۱۰۴
۷۵	ترکیب ولغات	۱۰۶
۷۶	معارف وحقائق	۱۰۶
۷۷	دوڑ میں مقابلہ کرنا بہترین خصلت ہے	۱۰۶
۷۸	قالوا یا ابانا الآیۃ کا مفہوم	۱۰۸
۷۹	ترکیب ولغات	۱۰۹
۸۰	معارف وحقائق	۱۱۰
۸۱	بیٹوں کی صداقت کا امتحان	۱۱۰
۸۲	عجوبۂ روزگار پیراہن	۱۱۱
۸۳	فائدہ	۱۱۲
۸۴	اپنی رائے پر اصرار درست نہیں	۱۱۲
۸۵	حضرت یوسف علیہ السلام کو تلاش نہ کرنے کی وجہ	۱۱۳
۸۶	ترکیب ولغات	۱۱۴
۸۷	معارف وحقائق	۱۱۵

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۸۸	فائدہ	۱۱۶
۸۹	وجاء ت سیارۃ الآیۃ کا حاصل	۱۱۸
۹۰	ترکیب ولغات	۱۲۰
۹۱	معارف وحقائق	۱۲۱
۹۲	وشروہ بثمن بخس الآیۃ کا مفہوم	۱۲۱
۹۳	ترکیب	۱۲۳
۹۴	معارف وحقائق	۱۲۳
۹۵	تین اعلیٰ درجہ کے قیافہ شناس	۱۲۴
۹۶	تمکین فی الارض کا مفہوم	۱۲۵
۹۷	تاویل احادیث کے علم سے کیا مراد ہے؟	۱۲۵
۹۸	سب کچھ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے	۱۲۶
۹۹	کنعان کے کنویں سے مصر کے بازار میں	۱۲۷
۱۰۰	حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے محل میں	۱۲۷
۱۰۱	ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہے	۱۲۸
۱۰۲	واللہ غالبٌ علیٰ امرہ کی ایک جھلک	۱۲۹
۱۰۳	ترکیب ولغات	۱۳۲
۱۰۴	معارف وحقائق	۱۳۲
۱۰۵	عقل اور جسمانی نشوونما کی تکمیل کس عمر میں ہوئی	۱۳۲

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۰۶	عالم اور حکیم کے درمیان فرق	۱۳۳
۱۰۷	قرآن کریم کا حکیمانہ اسلوب	۱۳۴
۱۰۸	ولما بلغ اشده الآية کا مفہوم	۱۳۴
۱۰۹	امام طبری کی رائے	۱۳۵
۱۱۰	ترکیب ولغات	۱۳۶
۱۱۱	معارف وحقائق	۱۳۶
۱۱۲	وغلقت الابواب الآية کا مفہوم	۱۳۷
۱۱۳	کیا اللہ کے علاوہ کسی کو رب کہنا جائز ہے؟	۱۴۰
۱۱۴	ظالم کو کبھی کامیابی نہیں ملتی	۱۴۰
۱۱۵	زنا کی حرمت عقل ونقل دونوں سے ثابت ہے	۱۴۱
۱۱۶	وراودته التي الآية کا حاصل	۱۴۱
۱۱۷	احسان فراموش کبھی کامیاب نہیں ہوتے	۱۴۲
۱۱۸	تنبیہ	۱۴۲
۱۱۹	ترکیب ولغات	۱۴۳
۱۲۰	معارف وحقائق	۱۴۴
۱۲۱	حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے "ھم" یعنی قصد وارادہ میں فرق	۱۴۴
۱۲۲	برھان رب کی تحقیق	۱۴۵
۱۲۳	السوء اور الفحشاء کے معنی	۱۴۷

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۲۴	مخلَص اور مخلِص کے درمیان فرق کی وضاحت	۱۴۸
۱۲۵	ولقد همّتْ وهَمَّ بها کی تفسیر	۱۴۸
۱۲۶	صاحب قصص القرآن کی تحقیق	۱۴۹
۱۲۷	ترکیب ولغات	۱۵۲
۱۲۸	حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے استباق میں فرق	۱۵۲
۱۲۹	معارف وحقائق	۱۵۳
۱۳۰	وغلقت الابواب میں صیغۂ جمع اور الباب میں صیغۂ واحد لانے کی وجہ	۱۵۳
۱۳۱	استبقاالباب الآیۃ کا حاصل	۱۵۵
۱۳۲	فائدہ	۱۵۶
۱۳۳	ترکیب ولغات	۱۵۷
۱۳۴	معارف وحقائق	۱۵۸
۱۳۵	فائدہ	۱۵۸
۱۳۶	حقیقت حال سے پردہ اٹھانے کی وجہ اور غیب سے صحیح فیصلہ کا انتظام	۱۵۸
۱۳۷	شاہد کی دوسری تفسیر	۱۶۰
۱۳۸	زلیخا کے رشتہ دار کو شاہد بنانے کی حکمت	۱۶۰
۱۳۹	شیر خوارگی کے زمانہ میں کلام کرنے والے بچوں کی تعداد	۱۶۰
۱۴۰	زلیخا کی چال بازی پر تنبیہ	۱۶۲

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۴۱	عورتوں کا مکر نہایت خطرناک ہوتا ہے	۱۶۳
۱۴۲	ایک سوال اور اس کا جواب	۱۶۳
۱۴۳	عزیز مصر کے مشتعل نہ ہونے کی وجہ	۱۶۴
۱۴۴	فائدہ	۱۶۴
۱۴۵	حضرت یوسف علیہ السلام سے عزیز مصر کی معذرت	۱۶۵
۱۴۶	زلیخا سے طلب معافی کا مطالبہ	۱۶۵
۱۴۷	کوشش کے باوجود معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا	۱۶۶
۱۴۸	معارف وحقائق	۱۶۷
۱۴۹	زلیخا پر انگشت نمائی کرنے والی عورتیں	۱۶۸
۱۵۰	لفظ الشغاف کی تحقیق	۱۶۸
۱۵۱	ضلال مبین کے معنی	۱۶۹
۱۵۲	وقال نسوة الآية	۱۶۹
۱۵۳	معارف وحقائق	۱۷۱
۱۵۴	عورتوں کی گفتگو کو مکر کہنے کی وجہ	۱۷۱
۱۵۵	طنز وتعریض کرنے والی عورتوں کو دعوت دینے کی وجہ	۱۷۲
۱۵۶	لفظ متکا کی تحقیق	۱۷۲
۱۵۷	فلما سمعت بمكرهن الآية کا مفہوم	۱۷۴
۱۵۸	حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن وجمال	۱۷۵

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۵۹	لفظ اکبرن کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول	۱۷۶
۱۶۰	قطع ید کی تحقیق	۱۷۶
۱۶۱	ان هذا الاملک کریم کہنے کی وجہ	۱۷۸
۱۶۲	ترکیب ولغات	۱۷۹
۱۶۳	زلیخا کا کھل کر اپنے عشق کا اقرار کر لینے کی وجہ	۱۸۰
۱۶۴	معنیٰ استعصام کی تحقیق	۱۸۰
۱۶۵	معارف وحقائق	۱۸۱
۱۶۶	زلیخا کا کھل کر دھمکی پر اتر آنے کی وجہ	۱۸۱
۱۶۷	لیسجنن میں نون ثقیلہ اور لیکونا میں نون خفیفہ لانے کی وجہ	۱۸۳
۱۶۸	صاحب جاہ وثروت کا دستور	۱۸۳
۱۶۹	قید خانہ کی تاریخ	۱۸۴
۱۷۰	ترکیب ولغات	۱۸۵
۱۷۱	معارف وحقائق	۱۸۶
۱۷۲	حضرت یوسف علیہ السلام کی دعاء کا حاصل	۱۸۶
۱۷۳	حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا عصمت کے منافی ہرگز نہیں	۱۸۸
۱۷۴	مصیبت کو معصیت پر ترجیح دینا منتہائے کمال ہے	۱۸۸
۱۷۵	تقویٰ اور پرہیز گاری پر ناز واعتماد نہیں کرنا چاہئے	۱۸۹
۱۷۶	فائدہ	۱۸۹

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۷۷	رب السجن الخ قید کی طلب نہیں استقامت کا اعلان ہے	۱۹۰
۱۷۸	عرش الٰہی کے سایہ میں	۱۹۱
۱۷۹	ترکیب	۱۹۳
۱۸۰	معارف وحقائق	۱۹۳
۱۸۱	فاستجاب له ربه الآیة کا مفہوم	۱۹۵
۱۸۲	قید خانہ میں رہنے کی مدت	۱۹۶
۱۸۳	فائدہ	۱۹۶
۱۸۴	ترکیب	۱۹۷
۱۸۵	معارف وحقائق	۱۹۸
۱۸۶	خمر کی وجہ تسمیہ	۱۹۸
۱۸۷	حضرت یوسف علیہ السلام کو محسن کہنے کی وجہ	۲۰۰
۱۸۸	قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن عمل	۲۰۱
۱۸۹	لطیفہ	۲۰۳
۱۹۰	حقیقت یا افسانہ	۲۰۳
۱۹۱	فائدہ	۲۰۴
۱۹۲	ترکیب	۲۰۵
۱۹۳	معارف وحقائق	۲۰۶
۱۹۴	تعبیر رؤیا کا علم کیوں دیا گیا	۲۰۶

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۹۵	قال لا یاتیکما طعام الآیة کا مفہوم	۲۰۶
۱۹۶	فائدہ	۲۰۸
۱۹۷	اظہار کمال علی الاطلاق مذموم نہیں	۲۰۸
۱۹۸	ترکیب	۲۱۰
۱۹۹	معارف وحقائق	۲۱۰
۲۰۰	واتبعتُ ملة آبائی الآیة کی تفسیر	۲۱۰
۲۰۱	آباء واجداد اور حسب ونسب پر فخر کی حیثیت	۲۱۱
۲۰۲	ضابطۂ خداوندی	۲۱۳
۲۰۳	جماعت انبیاء سے کفر وشرک ممکن نہیں	۲۱۳
۲۰۴	فائدہ	۲۱۴
۲۰۵	ایمان باللہ اور توحید فضل خداوندی ہے	۲۱۴
۲۰۶	ترکیب	۲۱۶
۲۰۷	معارف وحقائق	۲۱۶
۲۰۸	لفظ صاحب سے خطاب کی وجہ	۲۱۷
۲۰۹	اللہ ہی کی بندگی لازم ہے	۲۱۸
۲۱۰	سوال وجواب	۲۱۸
۲۱۱	ما تعبدون من دونه الآیة کا مفہوم	۲۱۹
۲۱۲	شرک کا جواز نہ عقل سے ثابت ہے نہ نقل سے	۲۲۰

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۲۱۳	تکوینی طور پر حکم صرف اللہ ہی کا نافذ ہے اور حکم تشریعی بھی صرف اسی کا حق ہے	۲۲۰
۲۱۴	ایک سوال اور اس کا جواب	۲۲۱
۲۱۵	ترکیب ولغات	۲۲۲
۲۱۶	معارف وحقائق	۲۲۲۳
۲۱۷	ساقی اور نانبائی کے خواب کی تعبیر	۲۲۳
۲۱۸	حضرت یوسف علیہ السلام نے الہام یا وحی الٰہی سے تعبیر بتائی تھی	۲۲۳
۲۱۹	ترکیب	۲۲۵
۲۲۰	معارف وحقائق	۲۲۵
۲۲۱	فانسٰہ الشیطان الآیۃ کے بارے میں مفسرین کے اقوال	۲۲۶
۲۲۲	نسیان کی نسبت شیطان کی جانب کرنے کی وجہ	۲۲۷
۲۲۳	قید خانہ میں رہنے کی مدت	۲۲۷
۲۲۴	غیر اللہ سے استعانت شان انبیاء سے فروتر ہے	۲۲۸
۲۲۵	استعانت بغیر اللہ کا حکم	۲۲۸
۲۲۶	فائدہ	۲۲۹
۲۲۷	ترکیب ولغات	۲۳۰
۲۲۸	معارف وحقائق	۲۳۲
۲۲۹	ماقبل سے ربط	۲۳۴

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۲۳۰	فرعون کا خواب	۲۳۵
۲۳۱	بلاغت	۲۳۶
۲۳۲	صنعت طباق کی تعریف	۲۳۶
۲۳۳	ترکیب ولغات	۲۳۷
۲۳۴	معارف وحقائق	۲۳۷
۲۳۵	جو تعبیر پہلے دی جائے وہی واقع ہو جاتی ہے	۲۳۸
۲۳۶	بلاغت	۲۳۹
۲۳۷	مبالغہ کی تعریف	۲۳۹
۲۳۸	ترکیب ولغات	۲۴۰
۲۳۹	معارف وحقائق	۲۴۰
۲۴۰	وادَّکر بعد امة الآیة کا مفہوم	۲۴۲
۲۴۱	حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر شاہ مصر کے سامنے	۲۴۲
۲۴۲	حضرت یوسف علیہ السلام کا نام نہ لینے کی وجہ	۲۴۳
۲۴۳	ترکیب	۲۴۴
۲۴۴	معارف وحقائق	۲۴۴
۲۴۵	صدیق کی تعریف	۲۴۴
۲۴۶	ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صدیق سے خطاب کیوں کیا؟	۲۴۵
۲۴۷	لفظ افتنا استعمال کرنے کہ وجہ	۲۴۵

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۲۴۸	بلاغت	۲۴۶
۲۴۹	براعت استہلال کی تعریف	۲۴۶
۲۵۰	کمال صبر واستقلال	۲۴۶
۲۵۱	فائدہ	۲۴۷
۲۵۲	ترکیب	۲۴۸
۲۵۳	معارف وحقائق	۲۴۹
۲۵۴	سنین کے معنی کی وضاحت	۲۴۹
۲۵۵	قراءت دأبا کی تحقیق اور تعبیر کا بیان	۲۵۰
۲۵۶	قال تزرعون الآیة کا مفہوم	۲۵۱
۲۵۷	علامہ عثمانی کا بیان	۲۵۳
۲۵۸	قرآن کریم کی بلاغت کلام کا اعجاز	۲۵۴
۲۵۹	قرآن کریم خدا کا کلام ہے	۲۵۴
۲۶۰	حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں پڑنے والا قحط	۲۵۵
۲۶۱	بلاغت	۲۵۵
۲۶۲	ترکیب	۲۵۷
۲۶۳	معارف وحقائق	۲۵۷
۲۶۴	شاہ مصر کی طلب اور حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب	۲۵۸
۲۶۵	معاملہ کی تحقیق کا سوال کرنے کے بجائے دریافت حال کے سوال کی وجہ	۲۵۹

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۲۶۶	بادشاہ کے پیغام پر فوراً لبیک نہ کہنے کی وجہ	۲۵۹
۲۶۷	حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح وتوصیف اور نبی اکرم ﷺ کا عجز وانکسار	۲۶۰
۲۶۸	واقعہ کی تحقیق میں امرأۃ عزیز کا ذکر نہ کرنا	۲۶۲
۲۶۹	علم دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی کا زینہ ہے	۲۶۲
۲۷۰	فائدہ	۲۶۳
۲۷۱	لوگوں کو بدگمانی سے بچانا اور خود سے تہمت کا دور کرنا ضروری ہے	۲۶۳
۲۷۲	لطیفہ	۲۶۵
۲۷۳	فائدہ	۲۶۵
۲۷۴	ترکیب	۲۶۶
۲۷۵	لفظ خطب کی تحقیق	۲۶۶
۲۷۶	معارف وحقائق	۲۶۷
۲۷۷	واقعہ کی تحقیق	۲۶۷
۲۷۸	ترکیب ولغات	۲۷۰
۲۷۹	معنی نفس کی تحقیق	۲۷۰
۲۸۰	معارف وحقائق	۲۷۱
۲۸۱	ذالک لیعلم الآیۃ کا مفہوم	۲۷۱
۲۸۲	خائن کو کبھی کامیابی نہیں ملتی	۲۷۲
۲۸۳	پیغمبرانہ شرافت	۲۷۲

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۲۸۴	عصمت و پاکبازی رب العزت کی رحمت وعنایت سے حاصل ہوتی ہے	۲۷۳
۲۸۵	نفس انسانی کی ترکیب	۲۷۳
۲۸۶	ذالک لیعلم الآیة کے بارے میں مفسرین کے اقوال	۲۷۶
۲۸۷	نفس انسانی کی تین حالتیں	۲۷۹
۲۸۸	لطیفہ	۲۸۰
۲۸۹	بلاغت	۲۸۱
۲۹۰	ترکیب	۲۸۲
۲۹۱	معارف وحقائق	۲۸۲
۲۹۲	حضرت یوسف علیہ السلام شاہ مصر کے دربار میں	۲۸۲
۲۹۳	''مکین امین'' فضائل ومناقب کی تمام اقسام کو شامل ہے	۲۸۵
۲۹۴	شاہ مصر کی طلب پر حضرت یوسف علیہ السلام کا مشورہ	۲۸۶
۲۹۵	ترکیب ولغات	۲۸۷
۲۹۶	معارف وحقائق	۲۸۷
۲۹۷	قال اجعلنی الآیة کا مفہوم	۲۸۷
۲۹۸	اپنی تعریف اور طلب ولایت کا جواز	۲۸۸
۲۹۹	بوقت ضرورت فاسق اور کافر حکمرانوں کے عہدہ کو قبول کر لینا بھی درست ہے	۲۸۹

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۰۰	کبھی فاسق اور کافر حکمراں کے عہدہ کو طلب کرنا ضروری ہو جاتا ہے	۲۹۰
۳۰۱	عطاء خداوندی کی بوالعجبی	۱۹۱
۳۰۲	حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح	۲۹۲
۳۰۳	ترکیب	۲۹۴
۳۰۴	معارف وحقائق	۲۹۵
۳۰۵	وکذالک مکنا لیوسف فی الارض کا مفہوم	۲۹۵
۳۰۶	سلطنت وحکومت عطاء خداوندی ہے	۲۹۶
۳۰۷	آخرت کا اجر وثواب سب سے بہتر ہے	۲۹۶
۳۰۸	حضرت یوسف علیہ السلام ہمہ وقت صفت تقویٰ سے متصف تھے	۲۹۷
۳۰۹	ولا نضیع اجر المحسنین الآیۃ عام ضابطہ خداوندی ہے	۲۹۸
۳۱۰	حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے تمکین فی الارض	۲۹۸
۳۱۱	نوٹ	۲۹۹
۳۱۲	قحط سالی سے محفوظ رہنے کی تدبیر یوسفی	۲۹۹
۳۱۳	غلہ حاصل کرنے کی غرض سے برادران یوسف کی مصر روانگی	۲۹۹
۳۱۴	ترکیب	۳۰۱
۳۱۵	معارف وحقائق	۳۰۱
۳۱۶	برادران یوسف علیہ السلام دربار یوسفی میں	۳۰۱
۳۱۷	بلاغت	۳۰۲
۳۱۸	ترکیب ولغات	۳۰۳

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۱۹	معارف وحقائق	۳۰۴
۳۲۰	الاترون الآیة بطور احسان نہیں بلکہ بنیامین کو لانے کی ترکیب کے طور پر ہے	۳۰۵
۳۲۱	مواقع ضرورت پر حکام کی طرف سے راتب بندی کا حکم	۳۰۶
۳۲۲	بھائیوں کے ساتھ مدارات اور والد محترم کی خبر گیری نہ کرنے کی وجہ	۳۰۷
۳۲۳	ترکیب ولغات	۳۰۹
۳۲۴	معارف وحقائق	۳۱۰
۳۲۵	تنبیہ	۳۱۱
۳۲۶	پونجی واپس کردینے کی وجہ	۳۱۱
۳۲۷	وقال لفتیٰنه الآیة کا مفہوم	۳۱۳
۳۲۸	ترکیب ولغات	۳۱۵
۳۲۹	معارف وحقائق	۳۱۶
۳۳۰	پونجی واپس مل جانے پر برادران یوسف علیہ السلام کا تأثر	۳۱۶
۳۳۱	ترکیب	۳۲۰
۳۳۲	معارف وحقائق	۳۲۰
۳۳۳	بنیامین کے معاملہ میں عہد وپیمان کے بعد بیٹوں پر اعتماد کرلینے کی وجہ	۳۲۰
۳۳۴	اسباب ظاہری کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں	۳۲۲
۳۳۵	الا ان یحاط بکم الآیة کا مفہوم	۳۲۲

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۳۶	کمال نبوت	۳۲۳
۳۳۷	بھروسہ صرف اللہ ہی پر رکھنا چاہئے	۳۲۴
۳۳۸	قرآن کریم کا اعجاز	۳۲۴
۳۳۹	ترکیب	۳۲۵
۳۴۰	معارف وحقائق	۳۲۵
۳۴۱	برادران یوسف علیہ السلام کی دوبارہ مصر کے لئے روانگی اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدبیر	۳۲۵
۳۴۲	نظر بد کا لگ جانا حق ہے	۳۲۷
۳۴۳	نظر بد کا علاج	۳۲۷
۳۴۴	نظر بد نہ لگنے کی تدبیر	۳۲۸
۳۴۵	تدبیر سے تقدیر نہیں بدلتی	۳۲۸
۳۴۶	توکل کی تعریف	۳۲۹
۳۴۷	توکل کی قسمیں	۳۲۹
۳۴۸	بلاغت	۳۳۲
۳۴۹	ترکیب ولغات	۳۳۳
۳۵۰	حضرت یعقوبؑ کا ارمان تو پورا ہو گیا مگر تقدیر تدبیر پر غالب آ کر رہی	۳۳۴
۳۵۱	حضرت یعقوب علیہ السلام تقدیر کے بالمقابل تدبیر کے مؤثر ہونے کے ہرگز قائل نہیں تھے	۳۳۴

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۵۲	حضرت یعقوب علیہ السلام بڑے ہی صاحب علم تھے	۳۳۴
۳۵۳	علم سے کون سا علم مراد ہے	۳۳۶
۳۵۴	تقدیر کے محکم ومبرم ہونے سے اکثر لوگ غافل ہیں	۳۳۶
۳۵۵	ترکیب ولغات	۳۳۸
۳۵۶	معارف وحقائق	۳۳۸
۳۵۷	حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی ملاقات	۳۳۸
۳۵۸	ترکیب ولغات	۳۴۲
۳۵۹	لفظ سقایۃ کی تعریف	۳۴۲
۳۶۰	لفظ عیر کی تحقیق	۳۴۳
۳۶۱	معارف وحقائق	۳۴۵
۳۶۲	فلما جھزھم الآیۃ کا مفہوم	۲۴۵
۳۶۳	بنیامین کو روک لینے کی ترکیب	۳۴۶
۳۶۴	ظن غالب کی بنا پر حکم لگانا درست ہے	۳۴۷
۳۶۵	بلاغت	۳۴۷
۳۶۶	ترکیب ولغات	۳۴۸
۳۶۷	معارف وحقائق	۳۴۸
۳۶۸	مفقود اور معدوم کے درمیان فرق	۳۴۸
۳۶۹	ترکیب	۳۵۰

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۷۰	لفظ صواع کی تحقیق	۳۵۰
۳۷۱	مخصوص انعام کا اعلان کرنا اور حق مالی کا ضامن بننا درست ہے	۳۵۱
۳۷۲	ترکیب	۳۵۳
۳۷۳	تاء قسمیہ کی تحقیق	۳۵۳
۳۷۴	معارف وحقائق	۳۵۴
۳۷۵	برادران یوسف علیہ السلام نے حقیقتاً چوری نہیں کی تھی	۳۵۴
۳۷۶	ترکیب	۳۵۶
۳۷۷	قالوا فما جزاء ہ الآیۃ کا مفہوم	۳۵۶
۳۷۸	ترکیب ولغات	۳۵۷
۳۷۹	معارف وحقائق	۳۵۷
۳۸۰	شریعت یعقوبی میں چوری کی سزا	۳۵۷
۳۸۱	کذالک نجزی الظالمین کا مفہوم	۳۵۸
۳۸۲	ترکیب ولغات	۳۶۰
۳۸۳	معارف وحقائق	۳۶۲
۳۸۴	حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب تلاشی کی نسبت مجازاً ہے	۳۶۲
۳۸۵	فائدہ	۳۶۲
۳۸۶	لفظ ''کید'' کے بارے میں ایک ضابطہ	۳۶۵
۳۸۷	مصر کے قانون میں چور کی سزا	۳۶۵

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۳۸۸	نرفع درجات من نشاء میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف اور جلالت علم کا بیان ہے	۳۶۷
۳۸۹	ذات خداوندی پر علم کی انتہا ہو جاتی ہے	۳۶۷
۳۹۰	فائدہ (۱)	۳۶۹
۳۹۱	فائدہ (۲)	۳۶۹
۳۹۲	کمال علم وفضل کا دعویٰ کسی کے لئے درست نہیں	۳۶۹
۳۹۳	فائدہ	۳۶۹
۳۹۴	ترکیب	۳۷۱
۳۹۵	معارف وحقائق	۳۷۱
۳۹۶	حضرت یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام اور اس کی تفصیل	۳۷۱
۳۹۷	چوری کے الزام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا تاثر	۳۷۴
۳۹۸	قال انتم شر مکانا کا مفہوم	۳۷۵
۳۹۹	ترکیب	۳۷۸
۴۰۰	معارف وحقائق	۳۷۸
۴۰۱	قالوا یا ایها العزیز الآیة کا مفہوم	۳۷۸
۴۰۲	قال معاذالله الآیة کا مفہوم	۳۷۹
۴۰۳	فائدہ	۳۸۰
۴۰۴	ترکیب ولغات	۳۸۱

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۴۰۵	معارف وحقائق	۳۸۲
۴۰۶	برادران یوسف علیہ السلام کے مشورہ کی وجہ	۳۸۳
۴۰۷	فلما استیئسوا منه الآیة کا حاصل	۳۸۴
۴۰۸	بڑے بھائی کی رائے	۳۸۴
۴۰۹	ایمان باللہ کی ایک چنگاری بھی حق کی رہ نمائی کے لئے کافی ہے	۳۸۹
۴۱۰	ترکیب	۳۹۰
۴۱۱	معارف وحقائق	۳۹۰
۴۱۲	وما شهدنا الآیة کا مفہوم	۳۹۲
۴۱۳	ایک مرتبہ اعتبار کھو دینے کے بعد آدمی قابل اعتبار بڑی مشکل سے بنتا ہے	۳۹۵
۴۱۴	حضرت یوسفؑ کا حضرت یعقوبؑ کو اپنی اطلاع نہ دینے کی وجہ	۳۹۶
۴۱۵	واقعہ کی تحقیق سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے گریز کی وجہ	۳۹۶
۴۱۶	ترکیب	۳۹۸
۴۱۷	معارف وحقائق	۳۹۸
۴۱۸	حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی بات پر اعتبار کیوں نہیں کیا؟	۳۹۸
۴۱۹	جزع فزع کے بغیر مصائب پر صبر کر لینا صبر جمیل ہے	۴۰۰
۴۲۰	ترکیب ولغات	۴۰۲
۴۲۱	معارف وحقائق	۴۰۳
۴۲۲	نئی چوٹ سے پرانے زخم کا ہرا ہو جانا فطرت انسانی میں داخل ہے	۴۰۳

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۴۲۳	اناللہ الخ امت محمدیہ کی خصوصیت ہے	۴۰۵
۴۲۴	بلاغت	۴۰۶
۴۲۵	ترکیب ولغات	۴۰۷
۴۲۶	معارف وحقائق	۴۰۸
۴۲۷	قالوا تاللہ سے مالا تعلمون تک کا مفہوم	۴۰۹
۴۲۸	حضرت یعقوب علیہ السلام کی شکایت صبر جمیل کے منافی نہیں	۴۱۰
۴۲۹	ترکیب ولغات	۴۱۱
۴۳۰	معارف وحقائق	۴۱۱
۴۳۱	تحسس اور تجسس کے درمیان فرق	۴۱۲
۴۳۲	یا بُنيّ اذهبوا الآية کا مفہوم	۴۱۳
۴۳۳	اللہ کی رحمت سے مایوسی کافرین کا شیوہ ہے	۴۱۴
۴۳۴	بلاغت	۴۱۵
۴۳۵	ترکیب ولغات	۴۱۶
۴۳۶	معارف وحقائق	۴۱۷
۴۳۷	فلما دخلوا الآية کا مفہوم	۴۱۷
۴۳۸	حاجت روا سمجھے بغیر مخلوق کے سامنے عجز وانکسار درست ہے	۴۱۸
۴۳۹	نکمی اور گھٹیا چیزوں کی تفصیل	۴۱۸
۴۴۰	کیا اولاد انبیاء کے لئے صدقہ لینا جائز ہے	۴۲۰

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۴۴۱	ترکیب	۴۲۳
۴۴۲	معارف وحقائق	۴۲۴
۴۴۳	حضرت یوسف علیہ السلام اور بھائیوں کے درمیان تعارف	۴۲۵
۴۴۴	صبر واتقا کا انجام	۴۲۶
۴۴۵	ہر معصیت کا صدور جہالت کی بنا پر ہوتا ہے	۴۲۷
۴۴۶	صبر وتقویٰ ہر مصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے	۴۲۷
۴۴۷	کیا اپنے لئے دعوی تقویٰ درست ہے؟	۴۲۸
۴۴۸	تنبیہ	۴۲۸
۴۴۹	ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام یا حضرت اسحاق علیہ السلام	۴۲۹
۴۵۰	ذبح عظیم	۴۲۹
۴۵۱	ترکیب	۴۳۴
۴۵۲	ایثار اور تخریب کے معنی	۴۳۴
۴۵۳	معارف وحقائق	۴۳۵
۴۵۴	حضرت یوسف علیہ السلام کا حلم وعفو	۴۳۶
۴۵۵	نظر اگر قضا وقدر پر رہے تو پھر کسی سے اختلاف نہ ہو	۴۳۷
۴۵۶	والد محترم کی حالت وکیفیت کے بارے میں استفسار	۴۳۸
۴۵۷	بقمیصی سے مراد کوئی خاص کرتا ہے یا عام؟	۴۳۸
۴۵۸	حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مکاشفہ	۴۳۹

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۴۵۹	کسی کا پیراہن بینائی کے عود کا کوئی مادی سبب نہیں ہے	۴۳۹
۴۶۰	واتونی باھلکم اجمعین کا مفہوم	۴۴۰
۴۶۱	بلاغت	۴۴۱
۴۶۲	ترکیب ولغات	۴۴۲
۴۶۳	معارف وحقائق	۴۴۳
۴۶۴	ولما فصلت العیر الآیۃ کا مفہوم	۴۴۴
۴۶۵	بلاغت	۴۴۶
۴۶۶	ترکیب ولغات	۴۴۷
۴۶۷	معارف وحقائق	۴۴۷
۴۶۸	پیراہن یوسف علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کا واپس آجانا بطور معجزہ ہے	۴۴۸
۴۶۹	دیار محبوب سے چلنے والی ہوا میں محبّ کی بیماری کا علاج بھی ہوا کرتا ہے	۴۴۹
۴۷۰	مبشر کو انعام دینا سنت انبیاء ہے	۴۵۰
۴۷۱	ترکیب ولغات	۴۵۱
۴۷۲	معارف وحقائق	۴۵۱
۴۷۳	فوراً دعاء مغفرت نہ کرنے کی وجہ	۴۵۲
۴۷۴	حضرت یعقوب علیہ السلام کی دعاء اور اس کی قبولیت	۴۵۳

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۴۷۵	ایک سوال اور اس کا جواب	۴۵۴
۴۷۶	صراحتاً معافی نہ مانگنے کی وجہ	۴۵۵
۴۷۷	ترکیب	۴۵۷
۴۷۸	معارف وحقائق	۴۵۷
۴۷۹	حضرت یعقوب علیہ السلام مصر کے شاہی محل میں	۴۵۷
۴۸۰	وقال ادخلوا مصر ان شاء اللہ آمنین کا مفہوم	۴۵۸
۴۸۱	بلاغت	۴۶۰
۴۸۲	ترکیب	۴۶۱
۴۸۳	معنی عرش کی تحقیق	۴۶۲
۴۸۴	ورفع ابویه علی العرش و خروا له سجداً کا مفہوم	۴۶۲
۴۸۵	وخروا له سجداً سے کیا مراد ہے؟	۴۶۳
۴۸۶	اول ملاقات میں سجدہ نہ کرنے اور مصر میں آ کر سجدہ کرنے کی وجہ	۴۶۶
۴۸۷	خواب کی تعبیر کتنے دنوں بعد ظاہر ہوئی	۴۶۸
۴۸۸	وقد احسن بی میں احسن لطف کے معنی میں ہے	۴۶۸
۴۸۹	وقد احسن بی الآیة کا مفہوم	۴۷۰
۴۹۰	حضرت یوسف علیہ السلام کی کریم النفسی	۴۷۰
۴۹۱	حضرات انبیاء مصائب پر صبر کیساتھ شکر کا پہلو بھی نکال لیتے ہیں	۴۷۱
۴۹۲	بلاغت	۴۷۲

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۴۹۳	ترکیب	۴۷۳
۴۹۴	معنیٰ فاطر کی تحقیق	۴۷۳
۴۹۵	معارف وحقائق	۴۷۳
۴۹۶	تاویل احادیث سے کیا مراد ہے؟	۴۷۴
۴۹۷	حضرت یوسف علیہ السلام کی شکر گذاری	۴۷۵
۴۹۸	توفني مسلما سے موت کی تمنا مراد نہیں ہے	۴۷۵
۴۹۹	کیا موت کی تمنا ہر حال میں ممنوع ہے؟	۴۷۷
۵۰۰	صالحین سے کون لوگ مراد ہیں؟	۴۸۱
۵۰۱	حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق تاریخ اور توراۃ وغیرہ کا بیان	۴۸۲
۵۰۲	حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات	۴۸۲
۵۰۳	اولاد	۴۸۳
۵۰۴	اہم اخلاقی مسائل	۴۸۳
۵۰۵	ترکیب	۴۹۱
۵۰۶	معارف وحقائق	۴۹۱
۵۰۷	رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اثبات	۴۹۱
۵۰۸	بلاغت	۴۹۳
۵۰۹	ترکیب	۴۹۴
۵۱۰	معارف وحقائق	۴۹۴

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۵۱۱	ماقبل سے ربط اور شان نزول	۴۹۴
۵۱۲	وما اکثر الناس الآیۃ کا مفہوم	۴۹۵
۵۱۳	انبیاء علیہم السلام طالب اجرت نہیں ہوتے	۴۹۵
۵۱۴	بلاغت	۴۹۵
۵۱۵	ترکیب	۴۹۶
۵۱۶	معارف وحقائق	۴۹۶
۵۱۷	دنیا کی ہر چیز خدا کی وحدانیت پر دال ہے	۴۹۶
۵۱۸	وما یؤمن اکثرھم باللہ الاوھم مشرکون کا مفہوم	۴۹۸
۵۱۹	بنی اسماعیل میں بت پرستی کو سب سے پہلے رواج دینے والا شخص	۵۰۰
۵۲۰	بلاغت	۵۰۱
۵۲۱	عقل مندی کا تقاضا	۵۰۱
۵۲۲	ترکیب	۵۰۳
۵۲۳	معارف وحقائق	۵۰۳
۵۲۴	توحید خالص کا مفہوم	۵۰۴
۵۲۵	ومن اتبعنی سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں	۵۰۵
۵۲۶	فریضۂ دعوت کی انجام دہی اسی کا حق ہے جو بصیرت تامہ رکھتا ہو	۵۰۶
۵۲۷	مدعی اتباع کے لئے پیغام رسانی لازم ہے	۵۰۶
۵۲۸	ترکیب	۵۰۸

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۵۲۹	معارف وحقائق	۵۰۸
۵۳۰	وما ارسلنامن قبلک الآیة کامفہوم	۵۰۹
۵۳۱	تنبیہ	۵۱۰
۵۳۲	آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے	۵۱۰
۵۳۳	ترکیب	۵۱۲
۵۳۴	معارف وحقائق	۵۱۲
۵۳۵	ماقبل سے ربط	۵۱۲
۵۳۶	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جواب کا حاصل	۵۱۴
۵۳۷	عذاب الٰہی وقت موعود پر آکر رہتا ہے	۵۱۵
۵۳۸	تنبیہ(۱)	۵۱۶
۵۳۹	تنبیہ(۲)	۵۱۶
۵۴۰	تنبیہ(۳)	۵۱۷
۵۴۱	فائدہ	۵۱۷
۵۴۲	ترکیب	۵۱۸
۵۴۳	معارف وحقائق	۵۱۸
۵۴۴	لقد کان فی قصصهم الآیة کامفہوم	۵۱۸
۵۴۵	ضروریات دین کے تمام اصولی مباحث قرآن میں موجود ہیں	۵۲۰
۵۴۶	وهُدیً ورحمةً لقوم یومنون کامفہوم	۵۲۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

احسن القصص (تفسیر سورۂ یوسف) پہلی بار ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰۵ء میں طبع ہوئی اور ایک سال کے قلیل عرصہ میں ہی ختم ہوگئی، دوبارہ اشاعت کے لئے ضروری معلوم ہوا کہ نظر ثانی کرلی جائے، لیکن جب نظر ثانی سے فراغت ہوئی تو معتد بہ اضافہ کی بنا پر مستقلاً کتابت کا مسئلہ سامنے آ گیا جس کی وجہ سے تاخیر ہوتی گئی، اب بفضلہٖ تعالیٰ دوبارہ طبع ہوکر منظر عام پر آ رہی ہے، رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کے فائدے کو عام وتام بنائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت، آمین۔

انوار احمد اعظمی خیر آبادی

جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۵ فروری ۲۰۱۳ء

عرض مؤلف

أحسن القصص (تفسیر سورہ یوسف) میرے اس تفسیری مطالعہ کا حاصل ہے، جو میں نے جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں سورۂ یوسف کی تدریس کے دوران بطور یادداشت جمع کر رکھے تھے، اس سلسلے میں جو محنت وعرق ریزی میرے لئے ممکن ہوسکتی تھی اس میں، میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی، اب یہی یادداشتیں ترتیب وتسوید اور کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر آرہی ہیں۔ میں کسی قابل نہ پہلے تھا اور نہ اب ہوں، یہ سب صرف اور صرف اسی ذات پاک کی توفیق وعنایت سے ممکن ہوا جس کا یہ کلام ہے، ورنہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہوں۔

اس سلسلے میں جن بزرگوں اور احباب کی رہنمائی وکرم فرمائی اور ان کا تعاون حاصل رہا، ان کے تئیں میرا دل تشکر وامتنان کے جذبات سے لبریز ہے، بالخصوص:

☆ مرشدی ومخدومی حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی متعنا اللہ بطول حیاتہ وبدوام فیوضہ، جنھوں نے غایت شفقت وکرم کی بنا پر اس کتاب کا ایک ایک حرف ملاحظہ فرمایا اور اپنے گراں قدر مشوروں اور مفید اصلاحات سے نوازا۔ باری تعالیٰ آپ کے سایۂ شفقت وعاطفت کو تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور اپنے شایان شان اجر عطا فرمائے۔

☆ مخدوم مکرم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ جن کی توجہات وعنایات ابتدائے تدریس سے مجھے حاصل ہیں، مولانا موصوف نے اپنی تمامتر مصروفیات

کے باوجود اس پر ایک قیمتی مقدمہ تحریر فرمایا، جزاکم اللہ خیرا الجزاء

☆ برادر مکرم مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب غازی پوری (مقیم جدہ) اگر ان کی سعی وکاوش اور توجہ وعنایت شامل نہ ہوتی تو کتاب اس شکل میں نہ آپاتی۔

☆ برادر عزیز مولانا ضیاء الحق خیرآبادی سلمہٗ (مدرس مدرسہ شیخ الاسلام، ومدیر ماہنامہ ضیاء الاسلام، شیخوپور) کتابت کا دشوار گزار مرحلہ انھیں کی توجہ سے حل ہوا۔

بارك الله في علمه وعمله -

انوار احمد اعظمی خیرآبادی
جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۷/ جولائی ۲۰۰۵ء

دعائیہ کلمات

از: حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہٗ

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بنارس، ورُکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مولانا انوار احمد صاحب اعظمی خیرآبادی ایک باصلاحیت اور صاحب استعداد مدرس ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ تحریر وتصنیف کا بھی اچھا اور صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں، قرآن پاک کے تفسیری درس کے دوران انھوں نے ایک قابل قدر کام یہ کیا کہ جو کچھ طلبہ کے سامنے درسگاہ میں پیش کرنا تھا اسے قلم بند کرلیا، اس طرح شفاہی (تقریری) درس کے ساتھ تحریری درس بھی تیار ہوگیا۔ اللہ برکت دے، درس کے مطالعہ کا یہ طریقہ بہت خوب ہے، استاذ کے لئے بھی، اور طالب علم کے لئے بھی، مثل ہے کہ **العلم صید والکتابة قید**، علم شکار ہے، اور لکھ لینا اس کے لئے قید ہے، اس طرح انھوں نے علم کے ایک خاص ذخیرے کو محفوظ کرلیا۔

اسے شائع کرنے سے پہلے انھوں نے ازراہِ حسن ظن مجھے مطالعہ واصلاح کے لئے دیا، میں نے حرفاً حرفاً اسے پڑھا، جہاں جہاں ضرورت سمجھی اس میں اصلاح وترمیم کی، مولانا موصوف نے میرے تصرفات کو بخوشی قبول کیا، بحمداللہ ''احسن القصص'' سورۂ

یوسف کی معتبر و مستند تفسیر ہوگئی ہے۔

حق تعالیٰ قرآن کریم کی اس خدمت کو قبول فرمائیں، اور اس سے طلبہ اور علماء کو نیز عام مسلمانوں کو نفع بخشیں، اور مؤلف کو دنیا و آخرت دونوں میں بہترین اجر سے نوازیں۔ آمین

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب

یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۰ر جولائی ۲۰۰۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَة

از: حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ

(صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ)

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، اور اس کلام کی فضیلت دوسرے تمام کلاموں پر ایسی ہے، جیسی اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے۔ (ترمذی و دارمی)

یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں اگلوں پچھلوں کی خبریں ہیں، لوگوں کے مابین معاملات کا اس میں حکم ہے، یہ ایک فیصلہ کن کلام ہے، ہزل نہیں ہے، ..... یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، یہ ذکر حکیم ہے، اس میں خواہشات نفس کجی نہیں پیدا کر سکتیں، نہ زبانیں اس میں التباس و اشتباہ ڈال سکتیں، علماء اس سے آسودہ ہو کر بے نیاز نہیں ہوتے، بکثرت دہراتے رہنے سے یہ پرانا نہیں ہوتا اور اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ (مشکوٰۃ شریف، کتاب فضائل القرآن)

کلام الٰہی کا معجزہ یہ ہے، کہ یہ کتاب دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے، سب سے زیادہ پڑھائی جاتی ہے، اس کے کلمات و حروف کی اتنی خدمت کی گئی ہے، اور کی جاتی ہے، اسی طرح اس کے معانی و مفاہیم پر اتنا غور و تدبر کیا گیا ہے، اور کیا جاتا ہے، کہ یہ بات کسی اور کتاب کو حاصل نہیں، پھر یہ بات بھی ہے کہ جو لوگ کلام الٰہی کی

خدمت میں مصروف ہیں، خواہ کسی نوع کی خدمت ہو، تجوید وقرأت کی رو سے ہو یا نشر واشاعت کی راہ سے، یا بیان ومعانی کے لحاظ سے، یا اس پر ایمان اور عمل کی جدوجہد کے راستے سے، یہ تمام خدمتیں، اس کتاب پر احسان نہیں ہیں، بلکہ اس کتاب کا، کتاب کے نازل کرنے والے کا احسان ہے خدمت کرنیوالوں پر کہ ان خدمتوں میں لگا لپٹا کر دنیا وآخرت کی سعادت سے نوازتے ہیں، جس نے اسے سیکھا، اور جس نے اسے سکھایا، اسے زبان نبوت سے ''خیر کم'' سب سے بہتر ہونے کی بشارت ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اپنا احسان نہ سمجھو کہ بادشاہ کی خدمت کررہے ہو، اس کا احسان مانو کہ خدمت میں تم کو لگا رکھا ہے، جس نے کسی عنوان سے قرآن کریم کی خدمت کی اس نے بڑی سعادت پائی، اور جس کی خدمت بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگئی، اس کے مرتبوں کو اللہ ہی جانے، بے چارہ انسان کیا جانے۔

فاضل گرامی مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی، استاذ جامعہ اسلامیہ مظفر پور ایک خاص مدت سے درس وتدریس کی راہ سے قرآن کریم کی خدمت میں مصروف ہیں، ابتداء ہی سے قرآن کریم کی تفسیر ان کے درس میں رہی ہے۔

سورۂ یوسف کی یہ تفسیر ان کے درس کا ایک جامع نمونہ ہے، انھوں نے اپنے تلامذہ کی سہولت کے لئے اپنے تفسیری مطالعہ کا حاصل، جسے درس میں طلبہ کے سامنے آجانا چاہئے، قلمبند کردیا ہے، تاکہ طلبہ اس کی نقلیں اپنے پاس محفوظ کرلیں۔ اور یہ درس دیر تک اپنے الفاظ وکلمات کے ساتھ زندہ اور تروتازہ رہے، لیکن قلمی مخطوطے صرف ان تلامذہ کے دائرے میں محدود رہ جاتے ہیں، خیال ہوا کہ اسے عمدہ کتابت

وطباعت کے ساتھ عام کردیا جائے، تو قرآن کریم کے دوسرے طالب علموں کے بھی کام آئے، اور اصحاب درس کے بھی سامنے ایک نمونہ رہے، اور دوسرے عام اردو داں اور اردو خواں حضرات بھی قرآن کریم کی اس خدمت سے اپنی استعداد کے بقدر استفادہ کریں۔

مولانا موصوف نے بڑی محنت سے تفسیری خزانہ کا مطالعہ کیا ہے، اور اس سے ایک اچھا خاصا ذخیرہ نکالا، اور اسے سلیقے سے ترتیب دے کر ناظرین کے سامنے پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو خدمت کی توفیق دی، اسے حسن خدمت بنانا، پھر اسے حسن قبول عطا فرمانا، آخرت میں کارآمد بنانا، دنیا میں اس کے نفع کو عام کرنا سب اسی بارگاہ کی مہربانی ہے، اور امید ہے کہ حق تعالیٰ یہ مہربانی فرمائیں گے۔

ونحن نقول كما قال الخليل وابنه الذبيح صلوات الله عليهما وسلامه : ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم .

اعجاز احمد اعظمی
مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ

زمانۂ نزول اور تعداد آیات ورکوع

سورۂ یوسف کا نزول رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے ابتدائی دور یعنی ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے مکی زندگی میں ہوا ہے، اس میں کل ایک سو گیارہ آیات اور بارہ رکوع ہیں، اس سورت میں از اوّل تا آخر مسلسل ایک ہی سرگذشت بیان کی گئی ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگذشت جوان کی حیات طیبہ کی مکمل تاریخ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہؒ تابعی سے منقول ہے کہ شروع کی تین آیات ۱، ۲، ۳ مدنی ہیں، (البحر ج ۵ ص ۲۷۶) قرطبی، کشاف اور تفسیر کبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی روایت سے منقول ہے کہ آیت نمبر ۷ بھی مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:- قرآن کریم کی سورتوں کے نام توقیفی ہیں، یعنی خداوند قدوس کے بتانے سے متعین کئے گئے ہیں، باری تعالیٰ نے جس سورت کا جو نام اپنے رسول ﷺ کو بتایا وہ سورت اسی نام کے ساتھ موسوم کر دی گئی، اس سورہ کا نام بھی ''سورۂ یوسف'' اللہ تعالیٰ کے بتانے ہی سے رکھا گیا ہے، اور ظاہری وجہ یہ ہے کہ اس میں بطور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات مبارکہ کا واقعہ مکمل و مفصل مذکور ہے۔

ماقبل سے ربط:- باعتبار ترتیب سورہ یوسف سے پہلے سورہ ہود واقع ہے جس میں سات انبیاء یعنی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم وعلی نبینا الصلاۃ والسلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس کا واضح اور اہم مقصد دو باتوں کو بتانا ہے، ایک یہ کہ ان واقعات سے عبرت

ونصیحت حاصل کی جائے اور صالحین کے طریقہ کو اختیار کیا جائے جو رُشد وہدایت اور وصول الی اللہ کا ضامن ہے، اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے، اور اس سورہ یوسف میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد لوگوں کیلئے عبرت ونصیحت اور حضور انور ﷺ کو تسلی دینا ہے، کہ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی ایذاء رسانی پر صبر کیا اور دنیا وآخرت دونوں کی کامیابی سے ہمکنار ہوئے، اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنے اقارب واباعد اور قوم کی ایذاؤں پر صبر سے کام لیجئے، ان شاء اللہ بہت جلد آپ بھی کامیاب وکامران ہوں گے۔

"مناسبة هذه السورة لما قبلها جمع قصص الأنبياء فإن ما قبلها ذكر فيها سبع قصص الأنبياء وهذه من محاسن قصص الأنبياء و أيضاً ليتسلى النبي ﷺ بما وقع الأنبياء من أذى الأقارب و الأباعد علىٰ ما وقع له من أذى قومه الأقارب و الأباعد". (حاشیہ جلالین ص ۱۸۹)

فائدہ:- اقارب واباعد اور قوم کی ایذ رسائیوں پر صبر وتحمل سے کام لینے پر جس کامیابی وکامرانی کی بشارت مقصود تھی وہ بفضل خداوندی بہت جلد ظہور پذیر ہونا شروع ہوگئی، چنانچہ نبوت کے کل تیرہویں سال آپ ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے اور اسلامی نظام حکومت کی طرح ڈالی تو دوسرے ہی سال سے کامیابیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ۸ھ تک فتح مکہ پر اس کی تکمیل ہوگئی، اور پھر کامیابی وکامرانی کا وہ دور آیا کہ دنیا نے نہ ویسی کامیابی وکامرانی کبھی دیکھی اور انشاء العزیز قیامت تک دیکھ سکے گی۔

شان نزول:- حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے کسی واقعہ

کے بیان کرنے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسفؑ کو نازل فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی۔ (مظہری ج۵ ص۱۳۵)

اور تفسیر کبیر میں مرقوم ہے کہ علماء یہود نے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا امتحان لینے کیلئے رؤساء مکہ کے ذریعہ آپ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ اولادِ یعقوبؑ جو فلسطین کے علاقہ کنعان میں آباد تھی وہ مصر کیسے پہونچی؟ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ کیا ہے؟ اس پر سورہ یوسف نازل ہوئی، اور واقعہ کی پوری تفصیل کو بیان فرما کر آپ کی نبوت ورسالت پر مہر تصدیق ثبت کردی گئی۔

واقعہ یوسف علیہ السلام ہی کا انتخاب کیوں؟:- یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی نبوت ورسالت کی تصدیق کے واسطے یہود نے خصوصیت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے واقعہ کا انتخاب کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے واقعات کی بہ نسبت غیر معروف تھا، اور تورات میں بھی کوئی خاص تفصیل مذکور نہ تھی، لہٰذا اس کو صحیح صحیح اور پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنا وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہ تھا، اور ظاہر ہے کہ وحی الٰہی کا کسی کے پاس آنا اس کی نبوت ورسالت کی دلیل ہے، اس لئے تصدیقِ نبوت کے واسطے یہود نے حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے واقعہ کا انتخاب کیا۔ (واللہ اعلم)

واقعہ یوسف علیہ السلام کو مرتب ومکمل بیان کرنے کی وجہ:- قرآن کریم میں جن انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گے ہیں وہ غیر مرتب اور تکرار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، یعنی واقعہ کا ایک حصہ ایک سورت میں ہے، تو دوسرا دوسری سورت میں، نیز ایسا بھی ہوا ہے کہ واقعہ کے جزءِ اخیر کو پہلے اور اوّل کو بعد میں بیان کیا گیا ہے، اور ایک ہی واقعہ کو مختلف سورتوں میں بار بار بھی بیان کیا گیا ہے، مگر

اس کے برخلاف حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے مرتب و مسلسل اور بغیر تکرار کے بیان فرمایا ہے، اس کی وجہ ایک تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ واقعہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے رسول اللہ ﷺ سے کسی واقعہ کے سنانے کی درخواست پر نازل کیا گیا ہے، لہٰذا پورا واقعہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ نازل کیا گیا، تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے سننے سے محظوظ ہوں، یا یہ کہ یہود کے کہنے پر مشرکین مکہ کے سوال کے جواب میں نبوتِ محمدی ﷺ کی تصدیق کے طور پر نازل کیا گیا ہے، اس لئے پورے واقعہ کو مسلسل و مرتب نازل کیا گیا، تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت عیاں اور واضح ہو کر ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے آجائے۔ (ماخوذ از "بیان القرآن")

دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم اگرچہ تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے، مگر گذشتہ اقوام و ملل کے حالات و واقعات اپنے اندر بہت سی حکمت و عبرت لئے ہوئے ہوتے ہیں، اسی بنا پر قرآن کریم نے ان کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن قرآن کریم کا مقصد اصلی چونکہ عبرت و موعظت ہے، اس لئے واقعات کے جس حصہ کو جہاں بیان کرنا مناسب تھا اسے بغیر کسی ترتیب کے وہاں بیان فرمادیا، مگر یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ تاریخ و واقعہ نگاری بھی مستقل ایک فن ہے، جس میں واقعات کو ترتیب اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، اس لئے قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان فرمایا تاکہ تاریخ لکھنے والوں کیلئے ایک دستاویز رہے کہ واقعات کے بیان کا انداز کیا ہونا چاہئے، تفصیل کہاں، اور کتنی ہونی چاہئے اور اختصار کتنا اور کس انداز کا ہونا چاہئے۔

فضیلت:- حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے غلاموں اور گھر والوں کو سورہ یوسفؑ کی تعلیم دو کیونکہ جس

مسلمان نے اس کی تلاوت کی، اور اپنے گھر والوں اور غلاموں کو اس کی تعلیم دی تو اللہ تعالیٰ سکراتِ موت کو اس پر آسان کر دیں گے اور اسے ایسی قوت عطا کریں گے جو اسے کسی مسلمان پر حسد کرنے سے محفوظ کر دے گی، ابن کثیرؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، ابن عطاءؒ کا قول ہے کہ اگر کسی غمگین کے سامنے سورہ یوسفؑ کی تلاوت کی جائے تو اس کا غم وحزن ختم ہو جائے گا، اور اسے فرحت وسرور کی کیفیت حاصل ہوگی، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں کلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یہود کی ایک جماعت نے سورہ یوسفؑ کو سنا تو وہ ایمان لے آئی، اس لئے کہ سورہ یوسفؑ مفہوماً ان کی کتاب تورات میں موجود تھی۔

عن ابن عباس أن طائفة من اليهود حين سمعوا رسول الله ﷺ يتلو هذه السورة أسلموا لموافقتها ما عندهم.

(دلائل النبوۃ ج۶ ص۲۷۶، ابن کثیر، ج۲ ص۴۲۰، مظہری ج۵ ص:۱۳۵)

مضامین سورہ کا خلاصہ:- سورہ یوسفؑ میں چار دعوے مذکور ہیں: (۱) عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، (۲) مالک وکارساز اور متصرف ومختار بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے، (۳) رسول اللہ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے، (۴) انبیاء سابقین کی طرح آپ ﷺ پر مصائب آئیں گے لیکن آخرکار کامیابی اور فتح وظفر آپ ﷺ ہی کے قدم چومے گی۔ (جواہر القرآن ج۲ ص۵۱۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ: یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی۔

ترکیب ولغات:- تلک اسم اشارہ مبتداء اور ''ایات الکتاب المبین'' اس کی خبر ہے، ''الٓرٰ'' یہ حروف حروفِ مقطعات کہے جاتے ہیں، ان کو مقطعات کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ حروف اگر چہ ایک ساتھ ملا کر لکھے جاتے ہیں، مگر پڑھنے اور تلفظ میں ہر حرف الگ الگ اور کاٹ کاٹ کر پڑھا جاتا ہے۔

حروف مقطعات کے معنی کیا ہیں؟:- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت اور بہت سے تابعین سے مختلف سورتوں میں مذکور حروف مقطعات کے مختلف معنی منقول ہیں، مثلاً یہ کہ یہ حروف ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ آئے ہیں، یا یہ کہ یہ ایک کلام کے ختم اور دوسرے کی ابتداء پر دلالت کے لیے ذکر کیے گئے ہیں، مگر وہ سب کے سب ظنی اور تخمینی ہیں، ان حروف کے معنی کے سلسلہ میں بے غبار بات وہی ہے جو خلفاء راشدین، جمہور صحابہ وتابعین اور تبع تابعین سے منقول ہے کہ سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات متکلم اور مخاطب یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے، جسے کوئی تیسرا سمجھ سکتا ہے اور نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اسی بنا پر صاحب جلالین ان حروف کی تفسیر ''اللہ أعلم بمرادہ بذٰلک'' سے کرتے ہیں، یعنی ان حروف سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے، اس کا علم صرف اسی کو ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بطور راز ان حروف کے معانی کا علم دیا گیا ہو، اور اس کی تبلیغ سے صراحتاً منع کر دیا گیا ہو، یہی وجہ ہے کہ ان حروف کی توضیح وتشریح کے متعلق آپ ﷺ سے کچھ منقول نہیں ہے، یہ حروف غالباً ان اسرار

خداوندی میں سے ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں، لہذا بہتر یہی ہے کہ ان کو راز ہی رہنے دیا جائے، اور تحقیق و تفتیش کی سعی لا حاصل نہ کی جائے کیوں کہ ان حروف کی مراد کے جاننے پر ہمارے دین اور دنیا کا کوئی کام موقوف نہیں ہے، باقی یہ اعتراض کہ جب ان حروف کے مخاطب ہم ہیں تو پھر ان کا معنیٰ بھی ہمیں معلوم ہونا چاہئے، کوئی وزن نہیں رکھتا، اس لئے کہ معنیٰ کا علم نہ ہونے کے باوجود بھی ہمارے لئے ان میں بہت سے فوائد ہیں، مثلاً ان پر ایمان لانا اور ان کی تلاوت کرنا اجر عظیم کا باعث ہے، اور نہ جانے کتنے معنوی فوائد ہیں جو ان کی تلاوت پر ہمیں حاصل ہوتے رہتے ہیں اور ہم ان سے نہ تو واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی ہمیں ان کا احساس ہوتا ہے۔

''ایات'' جمع ہے ایۃٌ کی بمعنی نشانی، حکم خداوندی، پیغامِ الٰہی، دلیل، معجزہ، آیت کے اصلی معنی ہیں ظاہری نشانی کے اور اسی اعتبار سے قرآن مجید کی آیت کو آیت کہتے ہیں کہ گویا کلام کے ختم ہو جانے کی علامت ہے۔

''الکتاب'' سے مراد قرآن کریم ہے۔

''المبین'' اسم فاعل بمعنی کھولنے والا، ظاہر کرنے والا۔

معارف و حقائق

مفسرین کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ آیات کی اضافت الکتاب کی جانب من تبعیضیہ کے معنی میں ہے، اور ''تلک'' سے اشارہ ہے آیات قرآنی کی جانب، چنانچہ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ آیات اس قرآن کریم کی بعض آیات ہیں، جس کا اعجاز عیاں اور ظاہر اور معانی صاف، واضح اور فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہیں، جس میں حرام و حلال اور حدود و احکام کی تمام تفصیلات موجود ہیں، (تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۳۴) اور جس کی عملی تعلیمات میں کسی قسم کا کوئی اخفاء

وابہام نہیں ہے، اور علمی مسائل بالکل صاف، سادہ اور متفق علیہ ہیں، (تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۵۷۳) اور جس کا منجانب اللہ ہونا یک دم واضح اور جن احکام وشرائع یا مواعظ ونصائح پر وہ مشتمل ہے وہ نہایت روشن اور صاف ہیں، (فوائد عثمانی ص ۳۱۱) اور یہ اس قرآن کریم کی بعض آیات ہیں جو ہر شعبۂ زندگی میں ایک معتدل اور سیدھا سادھا نظامِ حیات عطا کرنے والا اور حق و باطل کے درمیان دو اور دو چار کی طرح دوٹوک فیصلہ کردینے والا اور اسرار وحکمِ خداوندی سے مملو ہے۔

اور بعض کی رائے یہ ہے کہ "تلک" سے اشارہ ہے آیات سورت کی جانب اور "الکتاب" سے مراد یہاں یہی سورہ یوسفؑ ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوجائیں گے کہ یہ اس سورت کی آیات ہیں جن کا من جانب اللہ ہونا ہر غور وتدبر کرنے والے کے لئے بالکل واضح اور ظاہر ہے، اس صورت میں آیات الکتاب میں اضافت بتقدیر لام ہوگی، (مدارک ج ۲ ص ۲۱۰) یا آیت کریمہ کا مفہوم شانِ نزول کے اعتبار سے یہ ہے کہ یہ اس سورت کی آیات ہیں جو یہود پر ان کے سوال کے جواب کو واضح کردینے والی ہے۔ (تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۳۴)

✿✿✿

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ

(ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تا کہ تم سمجھ لو)

ترکیب:- أَنْزَلْنَاهُ خبر ہے، إِنَّ کی، قُرْآنًا حال اور عَرَبِيًّا اس کی صفت ہے، تَعْقِلُوْنَ محلاً مرفوع خبر ہے لعل کی۔

معارف وحقائق

أَنْزَلْنَاهُ میں ضمیر غائب ھا راجع ہے قرآن کی طرف، قرآن سے اگر پورا قرآن مراد ہے جیسا کہ وہی ظاہر اور مناسب حال ہے، تو بات بالکل واضح ہے، اور اگر مراد یہ سورہ یوسف علیہ السلام ہے، تو پھر اس کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اسم جنس ہے، اور اسم جنس کا اطلاق جس طرح کل پر ہوتا ہے ایسے ہی جزء پر بھی ہوتا ہے، لہٰذا لفظِ قرآن سے جس طرح پوری کتاب کو مراد لینا درست ہے، اسی طرح کتاب کی کسی سورت کا مراد لینا بھی درست ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ غلبۂ استعمال کی بنا پر جب بھی لفظ قرآن بولا جاتا ہے، تو پوری کتاب مراد ہوا کرتی ہے، زجاج نحوی اور ابن الانباری سے منقول ہے کہ ضمیر غائب کا مرجع خبر یوسف علیہ السلام ہے، مگر یہ قول ضعیف ہے۔ (روح المعانی ج۶ ص۳۶۳)

عربی زبان ہی اصل زبان ہے:- ابن عساکر اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی زبان عربی تھی، مگر اکل شجرہ کی بنا پر وہ سلب ہوگئی، اور ان کی زبان سُریانی ہوگئی، اور بعدِ توبہ پھر عربی ہوگئی، اور عبدالملک بن حبیب کا بیان ہے کہ زمین پر اُترنے کے بعد حضرت

آدم علیہ السلام کی زبان عربی تھی، پھر طولِ زمانہ سے مبدل بہ سُریانی ہوگئی، جوارضِ سوریہ یعنی جزیرہ کی طرف منسوب ہے، پھر کشتی نوح علیہ السلام پر سوار ہونے والوں کی زبان سُریانی ہی تھی سوائے جُرہم نامی ایک شخص کے کہ اس کی زبان عربی تھی، پھر اس کے ذریعہ عربی زبان کا شیوع ہوا، البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے خالص فصیح عربی زبان میں گفتگو کی وہ سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں (روح المعانی، ج:۶، ص:۳۶۴) یعنی اصل زبان تو شروع سے ہی عربی تھی مگر اس میں دوسری زبانوں کی آمیزش ہوگئی تھی، اس آمیزش کو ختم کر کے سب سے پہلے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خالص فصیح عربی زبان کو رائج کیا۔

قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل کرنے کی وجہ:- قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اصل زبان عربی ہے، جیسا کہ مذکورہ بیان سے معلوم ہوا، دوسرے یہ کہ قرآن پورے عالم کی ہدایت ورہنمائی کے لئے اور رہتی دنیا تک کے لئے نازل کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے لئے اس زبان کو منتخب کیا گیا جو اپنی وسعت وہمہ گیری کے لحاظ سے دنیا کی تمام زبانوں سے فائق اور اعلیٰ و اشرف ہے، چنانچہ اس کی وسعت تو اس بات سے ثابت ہے کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کیلئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں، جبکہ دوسری زبانیں اس وصف سے خالی ہیں، اور اس کی اشرفیت کا ثبوت یہ ہے کہ آسمان کی دفتری زبان عربی ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، اور لوحِ محفوظ کی زبان بھی عربی ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ. (بروج:۲۱/۲۲)

اور پھر جنت جو انسانوں کا دائمی اور اصلی ٹھکانہ ہے، اس کی زبان بھی عربی

ہے، اور خود نبی کریم ﷺ کی زبان بھی عربی ہے، آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

عن ابن عباسؓ قال : قال رسول الله ﷺ أحبوا العرب لثلاث لأني عربي، والقرآن عربي، وكلام أهل الجنة عربي.

(المستدرک ج ۴ ص ۸۷، وأخرجہ البیہقی فی شعب الایمان نمبر ۱۶۱۰)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ علامہ ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مضمون ثابت ہے اور یہ حدیث درجہ حسن سے کم نہیں ہے۔

(معارف القرآن ج ۵ ص ۲۱۴ بحوالہ فیض القدیر شرح جامع صغیر ج ۱ ص ۱۷۹)

تیسرے یہ کہ قرآن کریم کے اول مخاطب عرب ہیں، اور قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے قیام قیامت تک کیلئے نازل کیا گیا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے اوّل مخاطبین اسے خوب اچھی طرح جان اور سمجھ لیں، اور اس کے معارف وحقائق سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں، تاکہ وہ سہولت اور آسانی کے ساتھ اسے دوسروں تک پہونچا سکیں، اور پھر اس طریقہ سے اس کی تعلیمات عام ہو کر تمام انسانوں تک پہونچ سکے اور لوگ اس سے رُشد وہدایت حاصل کر سکیں۔

چوتھے یہ کہ دوسری تمام زبانوں کے مقابلہ میں عربی زبان کا سیکھنا نہایت سہل اور آسان ہے، اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے ہر شخص کو اس سے فطری طور سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ ممالک جن کی زبانیں عربی نہیں تھیں جب صحابہ کرام ؓ وہاں پہونچے اور ان کو قرآن کی تعلیم دی تو انھوں نے بآسانی اسے سیکھ لیا، اور اسے اپنی اصلی اور حقیقی زبان بنالیا اور اب تک ان کی ملکی زبان عربی ہے، مصر، عراق اور شام وغیرہ ممالک اس کا بین ثبوت ہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ ایک دین، ایک کتاب اور ایک نبی پر قیامت تک کے

لئے پوری دنیا کو متحد و متفق کرنا مقصود تھا، اس لئے ضروری ہوا کہ آخری آسمانی کتاب کسی ایک زبان میں اتاری جائے، اور اس پر پوری دنیا کو متحد و متفق کیا جائے، اپنی بہتیری خصوصیات کی بنا پر عربی زبان اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب تھی، اسلئے خداوند قدوس نے اپنی آخری کتاب کے لئے اسی زبان کا انتخاب فرمایا۔

آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل فرمایا جو تمام زبانوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ داشرف، فصیح و بلیغ، منضبط اور ہمہ گیر زبان ہے، اور اول مخاطبین کی زبان ہے، تاکہ وہ اسے خوب اچھی طرح سمجھ بوجھ کر اس کی روشنی کو پورے عالم میں پھیلا سکیں، اور پوری دنیا اس کے نور سے منور اور روشن ہوجائے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: لَعَلَّ بطور استعارہ تبعیہ یہاں لام تعلیل کے معنی میں استعمال ہے۔ (روح المعانی ج۶ ص۳۶۷)

(**تنبیہ**) مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے "قرآناً عربیاً" کا ترجمہ قرآن "فصیح" کیا ہے، اور اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر "عربی زبان کا قرآن" ترجمہ کیا جائے تو دائرۂ خطاب سمٹ کر صرف اہل عرب تک محدود رہ جاتا ہے، لیکن عربی کے معنی فصاحت سے بیان کرنے والے اور خود کلامِ فصیح اور واضح کے ہیں، اور یہاں یہ معنی لینے سے خطاب عامۃ الناس کی طرف رہتا ہے، (تفسیر ماجدی ج۲ ص۵۷۳) مگر مولانا مرحوم کا یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ "عربیاً" کے معنی اگرچہ فصیح کے بھی آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جمہور مفسرین نے یہاں "عربی زبان کا قرآن" ہی ترجمہ کیا اور مراد لیا ہے، اور اس ترجمہ پر یہ اعتراض کہ اس سے دائرۂ خطاب سمٹ جاتا اور محدود ہوجاتا ہے، تو یہ اعتراض بھی درست معلوم نہیں ہوتا،

کیونکہ یہاں دو باتوں کا بتانا مقصود ہے، ایک قرآن کریم کی عظمت وشرافت کہ قرآن سب سے باعظمت واشرف کتاب ہے، اس لئے سب سے زیادہ اشرف واعلیٰ زبان میں اسے نازل کیا گیا، دوسرے یہ بات بتانی مقصود ہے کہ اس کو عربی زبان میں اسلئے نازل کیا گیا تا کہ اس کے اوّل مخاطب اہل عرب اسے خوب اچھی طرح سمجھ کر دوسروں تک پہونچا سکیں۔

کیا قرآن کریم میں کوئی کلمہ غیر عربی نہیں ہے؟:- إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا سے استدلال کرتے ہوئے امام ابوعبید لغوی فرماتے ہیں کہ قرآن میں کوئی کلمہ غیر عربی نہیں ہے، مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہدؒ اور عکرمہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ غیر عربی کلمہ بھی قرآن میں موجود ہے،، مثلاً سِجِّيل ، اَلْيَمّ ، إِسْتَبْرَق وغیرہ، جمہور کے نزدیک صحیح اور مختار یہی دوسرا قول ہے، البتہ تطبیق کی راہ اختیار کی جائے تو دونوں قولوں کی صحت ثابت ہوجاتی ہے، کیونکہ علم اصول نحو میں یہ بات ثابت ہے کہ جب ایک یا ایک سے زائد کلمہ ایک لغت سے دوسری لغت میں منتقل کرلیا گیا اور دوسری لغت والوں نے اس کو اپنی لغت کی طرح استعمال کرنا شروع کردیا، اور وہ دوسری لغت میں شائع اور مستعمل ہوگیا تو وہ اسی لغت کا کلمہ بن جاتا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے جب غیر عربی لفظ کو اپنے اندر داخل کرلیا تو وہ عربی زبان ولغت کا کلمہ ہوگیا، لہٰذا ابوعبید کی رائے بھی اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔ (اعراب القرآن ج ۲ ص ۳۷۷)

قرآن کریم کامل ومکمل کتاب ہے:- قرآن کریم خداوند قدوس کی نازل کردہ آخری کتاب اور قیامت تک کیلئے دستورِ حیات ہے، لہٰذا اسے زبان، رسول، فرشتہ، حصّۂ ارض اور ماہِ نزول ہر اعتبار سے کامل ومکمل کرکے نازل کیا گیا، چنانچہ اس کی زبان عربی رکھی گئی جو تمام زبانوں میں سب سے اعلیٰ واشرف، فصیح وبلیغ، سب

سے زیادہ وسیع اور منضبط زبان ہے، رسول کی حیثیت سے نبی آخر الزماں سید الاولین والآخرین ﷺ کا انتخاب فرمایا گیا، جن کے صدقے اور طفیل میں اس جہان کو وجود عطا کیا گیا، اور اسے محمد رسول اللہ ﷺ تک پہونچانے کے لئے فرشتوں میں سب سے اعلیٰ وبرتر فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا انتخاب فرمایا گیا، اور نزول کے واسطے سطحِ ارض کے اس حصہ کو منتخب کیا گیا جو ام القریٰ کے لقب سے موسوم ہے، اور جہاں سے زمین کی ابتداء ہوئی ہے، ابتدائے نزول کا مہینہ وہ رکھا گیا جو سب سے زیادہ رحمتوں اور برکتوں والا ہے، جس میں سرکش شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔

أنزل أشرف الكتب بأشرف اللغات، علىٰ أشرف الرّسل بسفارة أشرف الملائكة، وكان ذٰلك في أشرف بقاع الأرض، وابتدئ إنزاله في أشرف شهور السنة، وهو رمضان، فكمل من كل الوجوه. (ابن کثیر ج۲ ص:۴۲۲)

✿✿✿✿✿

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ.

ہم بیان کرتے ہیں ترے پاس بہت اچھا بیان، اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن اور تو تھا اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں۔

ترکیب ولغات:- القصص منصوب ہے مصدر یعنی مفعول مطلق ہونے کی بناپر "ای أحسن الاقتصاص" یعنی ہم آپؐ سے سابقہ امتوں اور زمانہ گذشتہ کے واقعات کو بہترین اور سب سے اچھے اُسلوب وانداز میں بیان کرتے ہیں، یا "القصص" سے مراد قصہ ہے، اس وقت وہ منصوب ہوگا مفعول بہ ہونے کی بناپر، یعنی یوسفؑ کا واقعہ بہترین واقعہ ہے، "بِمَا أَوْحَيْنَا" میں ما مصدریہ ہے، "ای بایحائنا إلیک" "وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ" إن مخففہ من المثقلہ ہے، "من قبلہ" میں ضمیر راجع ہے ماأوحینا کی جانب، (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۳۵، مدارک ج۲ ص۲۱۱) یعنی جسے ہم اپنی وحی کے ذریعہ بیان کررہے ہیں اور شان یہ ہے کہ ہمارے بیان کرنے سے پہلے آپ ﷺ اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے۔

اوّلاً اس لئے کہ آپ ﷺ امی محض تھے سرے سے لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہ تھے، اور نہ آپ ﷺ کو یہ واقعہ اپنے ذوق ووِجدان سے ہی معلوم تھا، ثانیاً اس لئے کہ نفس واقعہ اگرچہ "بائبل" وغیرہ میں موجود تھا مگر دست بردِ زمانہ سے وہ افسانوی رنگ اختیار کرچکا تھا اور دیومالائی قصہ بن چکا تھا، حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ باقی نہیں رہ گیا تھا، جس کی بناپر اصل اور صحیح واقعہ کا جاننا بجز وحی الٰہی کے ممکن نہ تھا۔

نَـقُـصُّ جمع متکلم (ن) ہم قصہ بیان کرتے ہیں، جو حقیقتِ واقعہ کو بیان کرے اسے قاص کہا جاتا ہے۔

''والقاص الذی یأتی بالقصة علیٰ حقیقتها'' (مدارک ج۲ص۲۱۰)

أحسن اسم تفضیل بمعنی بہت اچھا أوحینا باب افعال سے ہم نے وحی بھیجی، غافلین اسم فاعل جمع مذکر بمعنی بے خبر۔

معارف و حقائق

آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

یعنی اس وحی کے ذریعہ جو قرآن کی صورت میں ہم نے نازل فرمائی ہے، ہم ایک نہایت اچھا بیان، نہایت حسین طرز میں تم کو سناتے ہیں، جس سے اب تک اپنی قوم کی طرح تم بھی بے خبر تھے، گو واقعہ کتب تاریخ اور بائبل میں پہلے سے موجود تھا، مگر محض ایک افسانہ کی صورت میں تھا، قرآن کریم نے اس کے ضروری اور مفید اجزاء کو ایک عجیب ترتیب اور بلیغ ومؤثر انداز میں بیان فرمایا، جس نے نہ صرف پہلے تذکرہ نویسوں کی کوتاہیوں پر مطلع کیا بلکہ موقع بموقع نہایت ہی اعلیٰ نتائج کی طرف رہنمائی کی، اور قصہ کے ضمن میں علوم وہدایات کے ابواب مفتوح کئے، یہ بات کہ خداوند قدوس کی تقدیر کو کوئی چیز روک نہیں سکتی اور خدا جب کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا جہاں مل کر بھی اپنی ساری امکانی تدابیر سے اسے محروم نہیں کرسکتا، صبر واستقامت، دنیوی واُخروی کامیابی کی کلید ہے، حسد وعداوت کا انجام خُذلان ونقصان کے سوا کچھ نہیں، عقل انسانی بڑا شریف جوہر ہے، جس کی بدولت آدمی بہت سی مشکلات پر غالب آتا اور اپنی زندگی کو کامیاب بنالیتا ہے، اخلاقی شرافت اور پاکدامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں بھی آخرکار معزز بنادیتی ہے، یہ اور اس قسم کے بے شمار حقائق

ہیں جن پر اس ''أَحْسَنَ الْقَصَص'' کے ضمن میں متنبہ فرمایا ہے۔ (فوائد عثمانی ص ۳۱۲)

یہ واقعہ أَحْسَنِ قَصَص کیوں؟:- قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو ''أَحْسَنَ الْقَصَص'' کہا ہے، اس لئے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ ونصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں، درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دلکش اور زمانہ کے عروج وزوال کی زندہ یادگار ہے، یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور اُبھرنے کی ایسے بولتی ہوئی تصویر ہے، جو کسی توضیح وتشریح کی محتاج نہیں رہتی، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فردِ یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زا تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانے کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لئے چن لیا تھا، اور شرفِ نبوت سے نوازا تھا۔

قرآن عزیز تورات کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص واقوام کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے، بلکہ وہ جن واقعاتِ تاریخی کو بیان کرتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، اور وہ عبرت وموعظت اور تذکیر وپند کا مقصدِ وحید ہے۔

پس جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں، مثلاً رُشد وہدایت کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر واستقامت، رضا وتسلیم کے مظاہرے، افراد واقوام کے عروج واقبال کے وقائع، خدائے تعالیٰ کے عدل ورحم کی کرشمہ سازیاں، انسانی اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام ومآل، عصمت اور ضبط نفس کی عجوبہ کاریاں تو بلاشبہ وہ ''احسن قصص'' ہے، اور کتاب ماضی کا وہ حسین ورق ہے جو اپنی شانِ زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۲۸۱/۸۲)

کیا قرآن کریم دوسری آسمانی کتابوں سے بے نیاز کردینے والی

کتاب ہے؟:- قرآن کریم خداوند قدوس کی آخری کتاب اور پہلی تمام کتابوں کے لئے ناسخ ہے، اور اپنی جامعیت و اعجاز کی بنا پر پہلی تمام کتابوں سے مستغنی اور بے نیاز کر دینے والی اور قیامِ قیامت تک کے لئے ایک رہنما اُصول ہے، لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے رُشد و ہدایت اور اضافۂ علم کے لئے نہ کسی دوسری آسمانی کتاب کی ضرورت ہے اور نہ اس کے پڑھنے سے کوئی فائدہ! اور ایک موقع پر تو رسول اللہ ﷺ سے صراحتاً اس کی ممانعت بھی منقول ہے، ایک دفعہ کا واقعہ ہے، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اہل کتاب سے ان کی کتاب کی ایک نقل چمڑے میں رکھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، (وہ نقل تورات کی تھی) حضور انور ﷺ نے پوچھا عمر تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ میں نے کہا یہ کتاب (تورات) کی نقل ہے، اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لئے میں نے اسے حاصل کیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ سننا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دونوں رُخسار غصہ کی وجہ سرخ ہو گئے، چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے "الصلوٰۃ جامعۃ" کی ندا دی گئی (کسی اہم معاملہ میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اکٹھا کرنا ہوتا تو الصلوٰۃ جامعۃ کی آواز لگائی جاتی تھی، صحابہ کرام معاملہ کی نزاکت کو محسوس فرما کر فوراً مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہو جایا کرتے تھے) انصارِ مدینہ کے کانوں میں جب یہ آواز پہونچی تو انھوں نے آپس میں کہا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی بات پر غصہ آ گیا ہے، مسلح ہو جاؤ، یہ کہہ کر انصار نے رسول اللہ ﷺ کے منبر کو بغرض حفاظت ہر چہار جانب سے گھیر لیا، رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! مجھے ایسے کلمات عطا کئے گئے ہیں جو جامع اور خاتم ہیں، (یعنی تمام گذشتہ آسمانی کتابوں کا ایک مختصر خلاصہ مجھے عطا کر دیا گیا ہے) میں ان کلمات کو

تمہارے پاس ایک روشن اور صاف ستھری شکل میں لے کر آیا ہوں تم ان کے بارے میں تردد نہ کرو، اور پس وپیش میں پڑنے والوں سے دھوکہ نہ کھاؤ، حضرت عمر ﷺ کہتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ میں اللہ کے رب ہونے کو، اور اسلام کے دین ہونے کو، اور آپ ﷺ کے رسول ہونے کو دل سے پسند کرتا ہوں، رسول اللہ ﷺ اس کے بعد منبر سے نیچے تشریف لے آئے، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کیلئے میری اطاعت کے بغیر چارہ نہ ہوتا، حضور ﷺ کے الفاظ یہ ہیں: "لو كان موسىٰ حيّاً لما وسعه إلا اتباعي".

(أخرجه احمد رقم ١٥١٣٧، مجمع الزوائد ج١ص ٤٢٠/٤٢١، حدیث نمبر ٨٠٦، ٨١٠، ابن کثیر ج ٤ ص ٧٢٣/ حاشیہ تفسیر مظہری ج ٥ ص ١٣٥)۔

إِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِأَبِيْهِ يٰأَبَتِ إِنِّيْ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِيْ سَاجِدِيْنَ.

جس وقت کہا یوسفؑ نے اپنے باپ سے، اے باپ میں نے دیکھا خواب میں گیارہ ستاروں کو، اور سورج کو اور چاند کو، دیکھا میں نے ان کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے۔

ترکیب ولغات:- کوکب بمعنی ستارہ جمع کواکب أَحْسَنَ الْقَصَص کو اگر مفعول بہ مانا جائے اور مراد حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہو تو إِذْ قَالَ يُوْسُف، أَحْسَنَ الْقَصَص سے بدل اشتمال ہوگا، یا یہ کہ إذ قال محلاً منصوب ہے، أذکر فعل مقدر کی بنا پر، اس صورت میں إذ قال، أذکر کا مفعول بہ ہوگا، معنی یہ ہوں گے کہ "اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا"۔

یٰـا أبت مقولہ ہے قول کا اور إنـی رأیت ندا کا جواب ہے، رأیت أحد عشر پورا جملہ إن کی خبر ہے، اور رأیت ثانی رأیتُ اول کی تاکید ہے، یا جملہ مستانفہ برائے تاسیس ایک سوال مقدر کا جواب ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے "إِنِّـيْ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا" کہا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان سے سوال کیا کہ تم نے ان کو کس کیفیت کے ساتھ دیکھا؟ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا "رَأَيْتُهُمْ لِيْ سَاجِدِيْنَ"۔

لـی ساجدین میں جار مجرور کی تقدیم اہتمام شان کے واسطے ہے، اور اس میں فواصل کی رعایت بھی ملحوظ ہے، کیونکہ اس کے ماقبل اور مابعد کی آیات یـا اور نون پر ختم ہوئی ہیں۔

یوسف عبری زبان کا علم ہے، یہاں مراد حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں، امام بخاریؒ اور امام احمد بن حنبلؒ دونوں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا نسب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراهیم علیهم الصلاة والسلام"۔ (بخاری شریف ۴۶۸۸)

رأیتُ مشتق ہے رؤیا بمعنی خواب سے نہ کہ رؤیت سے، ارشادِ خداوندی لاتقصص رؤیاک اور هٰذا تأویل رؤیای سے اسی بات کی تائید ہو رہی ہے۔

معارف و حقائق

أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ. ابونعیم اور بیہقی نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے (اور حاکم نے مستدرک میں اس روایت کو امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے) کہ "ایک یہودی نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ محمد (ﷺ) ان ستاروں کے ناموں کو بوضاحت بیان کرو جن کو یوسفؑ نے خواب میں دیکھا تھا، آپ ﷺ خاموش رہے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر ان کے بارے میں آپ کو اطلاع دی، حضور ﷺ نے اس یہودی سے پوچھا: اگر میں ان کا نام بتادوں تو کیا تم مسلمان ہو جاؤ گے؟ اس نے کہا ہاں! تو آپ ﷺ نے ان ستاروں کے مندرجہ ذیل نام بتائے، (۱) جرثان، (۲) الطارق، (۳) الذبال، (۴) قابس، (۵) عمودان، (۶) الفلیق، (۷) المصبح، (۸) الضروح، (۹) وثاب، (۱۰) الفرغ، (۱۱) ذوالکتفین، (۱۲) سورج، اور (۱۳) چاند، اس پر اس یہودی نے آپ کے قول کی تصدیق کی۔ (تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۳۶، مدارک ج ۲ ص ۲۱۱)

وعن جابرؓ (واسم اليهودي عند البيهقي البستاني) وهو قال: يامحمد! أخبرني عن النجوم التي رآهن يوسفؑ، فسكت فنزل جبرئيلؑ فأخبره بذاک. فقال عليه السلام إن أخبرک هل تسلم؟ قال نعم الخ.

(المستدرک ج۴ص۳۹۶، دلائل النبوۃ ج۶ص۲۷۷)

قدرے فرق کے ساتھ ابن کثیر نے بھی مذکورہ ناموں کا تذکرہ کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق گیارہ ستاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور شمس وقمر سے مراد والدین ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ شمس سے مراد والدہ اور قمر سے والد مراد ہیں، مگر راجح یہ ہے کہ شمس سے والد اور قمر سے والدہ مراد ہیں۔ (ابن کثیر ج۲ص۴۲۵، تفسیر مظہری ج۵ص۱۳۶)

سجدہ سے کیا مراد ہے:- رَأَيْتُهُمْ لِيْ سَاجِدِيْنَ دیکھا میں نے ان کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سجدہ کرنا ذوی العقول کی صفت ہے، اور ستارے ذوی العقول میں داخل نہیں ہیں، تو پھر ان کے سجدہ کرنے کے کیا معنی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ستاروں کو صاحب عقل قرار دے کر سجدہ کرنے کی نسبت ان کی جانب کردی گئی، اور ضمیر ذوی العقول کو ان کی جانب راجع کردیا گیا ہے۔

تاریخی روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کا نام راحیل مذکور ہے، اور مشہور یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب ان کے چھوٹے بھائی بنیامین پیدا ہوئے تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی خالہ لیا سے نکاح کرلیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جب خواب دیکھا تھا اور پھر جب اس کی تعبیر سامنے آئی تو یہی لیا حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں تھیں، مگر راجح اور

صحیح یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جس وقت خواب دیکھا تھا اس وقت ان کی والدہ راحیل زندہ تھیں، اور جب خواب کی تعبیر سامنے آئی ہے اس وقت بھی وہ حیات تھیں جیسا کہ محمد بن اسحاق اور ابن جریر کی روایت سے پتہ چلتا ہے۔

خالہ بمنزلہ ماں کے ہے:- مشہور روایت کے مطابق آیت کریمہ "ورفع أبويه على العرش" میں والدہ سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی خالہ ہی ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ خالہ بمنزلۂ ماں کے ہوتی ہے، اور اگر وہ والد کے نکاح میں ہوں تو ان کا بمنزلہ ماں کے ہونا اور بھی مؤکد ہو جاتا ہے، مگر محمد بن اسحاق اور ابن جریر فرماتے ہیں کہ رؤیت خواب کے وقت اور جب اس کی تعبیر ظاہر ہوئی ہے اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے والد اور حقیقی والدہ حیات تھیں۔

قال محمد بن اسحاق وابن جریر "كان أبوه وأمه يعيشان" وقال ابن جریر "لم يقم دليلٌ علىٰ موت أمه" وظاهر القرآن يدل علىٰ حياتها۔ (ابن کثیر ج۵ ص۷۵۹)

حضرت یوسف علیہ السلام نے مذکورہ خواب اس وقت دیکھا تھا جبکہ ابھی وہ بچے تھے، بقول صاحب مظہری ومدارک اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔

"كان ابن ثنتي عشرة سنةً يومئذٍ ۔ (مدارک ج۲ ص۲۱۱)

"سَاجِدِيْنَ." مراد سجدۂ تعظیمی ہے نہ کہ تشریعی وتعبدی، کیونکہ سجدہ تشریعی و تعبدی تو خداوند قدوس کے علاوہ کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے، ارشاد خداوندی ہے

أم كنتم شهدآءَ إذ حضر يعقوبَ الموتُ اذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدى، قالوا نعبدُ الٰهك و اٰله اٰبآئكَ ابراهيم و اسمٰعيل و اسحٰق الٰهاً واحدا، ونحن له مسلمون. (بقرہ۱۳۳)

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب علیہ السلام کے موت، جب کہا

اپنے بیٹوں کو تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد، بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں کے رب کی جو کہ ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق ہیں وہی ایک معبود ہے، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

البتہ دنیا میں سجدۂ تعظیمی کا رواج ضرور رہا ہے، اور ممکن ہے کہ شریعت یعقوبی اور پہلی شریعتوں میں جائز رہا ہو، مگر شائبہ شرک کی بنا پر شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اسے حرام قرار دے دیا گیا۔

صاحب مدارک نے یہاں سجدہ سے مراد انقیاد و تذلل لیا ہے۔ (مدارک ج ۲ ص ۲۱۱)

اذ قال یوسف لابیه الآیة کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ بحالت خواب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر ان کو سجدہ کر رہے ہیں، تو اس کی تعبیر معلوم کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنا خواب والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام سے بیان فرمایا، والد محترم نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس کی تعبیر بیان فرمائی اور خواب کو انتہائی مبارک قرار دیا، جس سے خواب اور اس کی تعبیر کا مسلم حقیقت ہونا معلوم ہوتا ہے، اور جو لوگ خواب کی حقیقت کے منکر ہیں ان کی غلطی واشگاف ہو کر سامنے آجاتی ہے، حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے کہ "رویائے صالحہ اللہ کی طرف سے ہے، اور برا خواب شیطان کی طرف سے، لہٰذا اگر تم میں سے کوئی اچھا خواب دیکھے تو اس کو اسی سے بیان کرے جس کو وہ پسند کرتا ہے، اور اگر تم میں سے کوئی برا خواب دیکھے تو اپنی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دے، اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ لے۔

عن أبی قتادةؓ یقول سمعت رسول اللہ ﷺ یقول : الرؤیا من اللہ والحلم من الشیطان ، فإذا رأی أحدکم شیئاً یکرھه فلینفث عن یسارہٖ ثلٰث مرّاتٍ ثم لیتعوذ من شرھا فإنھا لا تضرہ " وفی روایةٍ ولا تقصھا إلا علیٰ وادٍّ . (ابوداؤد ص٦٨٥)

✿✿✿✿✿

قَالَ يَابُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ.

کہا اے بیٹے مت بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں کے آگے پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب، البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن۔

ترکیب ولغات:- یَابُنَیَّ اے پیارے بیٹے! ابنی ابن کی تصغیر ہے، کم سن ہونے کی بنا پر بطور شفقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے تصغیر کا صیغہ استعمال فرمایا، رؤیاک اپنا خواب، لفظ رؤیا عموماً نیند کی حالت میں دیکھی جانے والی اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے، مگر اس کا استعمال بیداری کی حالت میں آنکھ سے دیکھی جانے والی اشیاء کے لئے بھی ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وما جعلنا الرؤیا التی أریناک إلا فتنةً للناس میں رؤیا سے مراد حالت بیداری میں آنکھ سے دیکھنا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں رؤیا کی تفسیر ''رؤیا عین'' سے کی ہے۔

''قال ابن عباس هی رؤیا عین أُرِیها رسول الله ﷺ لیلة أُسرِی''. (بخاری شریف، کتاب التفسیر ۴۷۱۶، ص ۶۸۶)

إخوتک تیرے بھائی، إخوة جمع ہے أخ کی، کیداً مصدر ہے کاد کا، لفظ کید اچھی، بری ہر طرح کی تدبیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یہاں مراد بری تدبیر ہے، جسے مکر کہتے ہیں، یابُنَی کا جملہ مقولہ ہے قول کا اور لاتقصص ندا کا جواب ہے، فیکیدوا لک میں لام تاکید کے لئے ہے۔

معارف و حقائق

قال یا بُنَیَّ لا تقصص کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے پیارے بیٹے تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے ہرگز بیان نہ کرنا اس لئے کہ خواب کی تعبیر بالکل واضح اور ظاہر ہے، بھائیوں کے لئے اس کا جان لینا کچھ مشکل نہیں ہے، اور علاّتی (باپ شریک) ہونے کی بنا پر ان کو پہلے ہی سے تم سے بغض وعناد ہے، بہت ممکن ہے کہ تمہارا خواب جان لینے کے بعد وہ تمہارے درپے آزار ہو جائیں اور یہ کچھ بعید اس لئے نہیں ہے، کہ عناد تو ان کو پہلے ہی سے ہے، اور پھر شیطان الگ گھات لگائے بیٹھا ہے، وہ بھائیوں کو تمہارے خلاف اُکسا کر ایذاء دہی کی کوشش سے کبھی باز نہیں آسکتا۔

برادرانِ یوسف علیہ السلام کے حسد کی وجہ:- حضرت یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے تھے جن میں سے دس دوسری بیویوں سے اور حضرت یوسف علیہ السلام و بن یمین ایک بیوی راحیل کے بطن سے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام اوّل تو بڑھاپے کی اولاد تھے، دوسرے یہ کہ حُسن ظاہری و باطنی دونوں سے آراستہ تھے، حسن ظاہری تو ایسا تھا کہ دنیا میں کسی اور کو ویسا حسن و جمال نہیں دیا گیا، چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث معراج کی روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے باقی آدھا سارے جہاں میں تقسیم ہوا ہے۔

فإذا أنا بيوسف ، إذا هو قد أوتي شطر الحسن . (مسلم شریف ح ۱۶۲)

تیسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں شروع ہی سے نہایت سنجیدہ پُر وقار، عقل و خرد کی دولت سے آراستہ، انتہائی حلیم و بُردبار، ہر

اچھے کام کی طرف مائل اور برائیوں سے متنفر رہنے والے تھے اور مزید برآں ان کی پیشانی پر نورِ نبوت بھی درخشاں تھا۔

بالائے سرش زہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی

ان تمام اسباب کے ہوتے ہوئے اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کا میلان طبعی طور جو اللہ کے نبی ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف نہ ہوتا تو پھر کس کی طرف ہوتا، جبکہ سلسلہ نبوت کو انھیں سے تابانی ملنی تھی، اور انھیں کے ذریعہ اسے نشوونما پانا تھا، الحاصل حضرت یعقوب علیہ السلام کو دوسرے بیٹوں کے مقابلہ میں مذکورہ وجوہات کی بنا پر حضرت یوسف علیہ السلام سے نہ صرف یہ کہ بے حد محبت تھی بلکہ والہانہ عشق تھا، جس نے برادران یوسف کو آتش حسد میں مبتلا کر دیا تھا، اور ان کی آتشِ حسد اس وقت تیز تر ہوگئی جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس وقمر ان کو سجدہ کر رہے ہیں، اور چھپانے کے باوجود بھائیوں کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تھا، اور پھر یہ آتش حسد یہاں تک بھڑکی کہ ایک دن بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا، جس کا بیان دوسری آیت میں آرہا ہے۔

خواب کی حقیقت:- نیند یا بے ہوشی کی حالت میں نفس انسانی جب ظاہری بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کی قوت خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی پڑتی ہیں اسی کا نام خواب ہے۔

خواب کی قسمیں:- رسول اللہ ﷺ سے خواب کی تین قسمیں منقول ہیں، جن میں سے دو باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ایک صحیح ہے مگر وہ بھی کبھی خارجی عوارض کی بنا پر فاسد اور نا قابل اعتبار ہو جاتی ہے، دونوں باطل قسموں کی تفصیل یہ ہے کہ خواب میں انسان جو مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری

کی حالت میں انسان جو صورتیں دیکھتا رہتا ہے، وہی خواب میں متشکل ہو کر نظر آجاتی ہیں ،اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے، (چنانچہ بسا اوقات وہ بحالت خواب ہنستا اور مسکراتا نظر آتا ہے، اور کبھی اس کے چہرے سے خوف و دہشت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیداری کے بعد بھی اس پر وہی کیفیت طاری رہتی ہے جو خواب میں اسے نظر آرہی تھی) خواب کی یہ دونوں قسمیں باطل اور بے حقیقت ہیں جن کی نہ تو کوئی اصلیت ہے اور نہ اُن کی کوئی واقعی تعبیر ہو سکتی ہے، ان میں سے پہلی قسم کو "حدیث النفس" اور دوسری کو "تسویل شیطانی" کہا جاتا ہے، اور خواب کی تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو وہ اپنے بندہ کو کسی بات پر متنبہ کرنے کے لئے، یا خوشخبری دینے کے لئے اپنے خزانۂ غیب سے عطا کرتا ہے۔

عن أبی هريرةؓ عن النبی ﷺ قال الرؤيا ثلث، فالرؤيا الصالحة بشریٰ من الله، والرؤيا تحزين من الشيطان، ورؤيا مما يحدث به نفسه.

(ابوداؤد ص ۶۸۵)

طبرانی میں بسند صحیح یہ حدیث منقول ہے کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے رب سے شرف ہم کلامی حاصل کرتا ہے۔

عن عبادة عن النبی ﷺ أنه قال : هو كلام يكلم به ربک عبده فی المنام. (معجم کبیر ج ۲۵ ص ۲۳۸/۲۳۹)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سچے خواب کو اجزاءِ نبوت میں سے چھیالیسواں جز یعنی اللہ کی طرف سے الہام قرار دیا ہے۔

عن عبادة بن الصامت عن النبی ﷺ قال: رؤيا المومن جزء

من ستة واربعين جزأ من النبوة. (ابوداؤد ص ۶۸۵)

خواب کے جزءِ نبوت ہونے کا مطلب:- سچے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں جز اس لئے قرار دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نبوت کا سلسلہ تیئیس سال تک جاری رہا، ان میں سے پہلی ششماہی میں یہ وحی الٰہی خوابوں کی صورت میں آتی رہی، باقی پینتالیس ششماہیوں میں جبرئیل امینؑ کی پیغام رسانی کی صورت میں آئی، اس حساب سے سچے خواب وحی نبوت کا چھیالیسواں جز ہوئے، اور جن روایات میں کم وبیش عدد مذکور ہے، ان میں یا تو تقریبی کلام کیا گیا ہے یا یہ کہ وہ سند کے اعتبار سے ساقط ہیں۔ (تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۳۷، معارف القرآن ج ۵)

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ خواب کو جزءِ نبوت اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ انسان بسا اوقات خواب میں ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی طاقت وقوت سے باہر ہوتی ہیں، مثلاً آسمان پر اُڑنا یا قلب ماہیت کا ہونا، یا غیب کی ایسی چیزیں جو اس کی قدرت میں نہ تھیں، تو ان کا ذریعہ بجز امداد والہامِ خداوندی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، جو اصل میں خاصۂ نبوت ہے، اس لئے اس کو (علم) نبوت کا ایک جز قرار دیا گیا۔

الرؤيا جزءٌ من النبوة لأن فيها ما يعجز ويمتنع كالطيران وقلب الاعيان والاطلاع علىٰ شئ من علم الغيب وعلى الجملة فإن الرؤيا الصادقة من الله وإنها من النبوة. (قرطبی ج ۲ ص ۴۲۱)

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ رؤیا (سچے خواب) اللہ کی جانب سے ہیں، اور حُلم (یعنی جھوٹی آرزوئیں) شیطان کی جانب سے ہیں۔

قال ﷺ الرؤيا من الله والحلم من الشيطان.

(بخاری شریف ح ۵۷۴۷، مسلم شریف ح ۲۲۶۱، ابوداؤد شریف ص ۶۸۵)

ہر شخص سے خواب کا بیان کرنا درست نہیں:- حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے خواب کا تذکرہ والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام سے کیا تو انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے سامنے اس کے تذکرہ سے منع فرمادیا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہ ہو اس کے سامنے خواب کو بیان نہیں کرنا چاہئے، نیز جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو اس سے بھی بیان نہیں کرنا چاہئے، حدیث نبوی ﷺ میں اس کی تصریح موجود ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ خواب نبوت کا چالیسواں جز ہے، اور خواب بیان تعبیر سے پہلے معلق رہتا ہے، اور جب اس کی تعبیر بیان کردی جائے تو اسی کے مطابق واقع ہوجاتا ہے، پس تم اپنے خوابوں کو انھیں سے بیان کرو جو عقلمند ہوں، اور تم سے تعلق رکھنے والے اور خیر خواہ ہوں۔

روی ابو رزین العقیلی أن النبی ﷺ قال الرؤیا جزء من أربعین جزءاً من النبوة (بخاری، حدیث: ۶۹۸۷/۶۹۸۸۔ مسلم، حدیث ۲۲۶۳/۲۲۶۴)

الرؤیا معلقة برجل طائر مالم یحدث بها صاحبها فإذا حدّث بها وقعت فلا تحدثوا بها إلا عاقلاً أو محباً أو ناصحاً (قرطبی ج۲ ص۴۲۰) ترمذی کی روایت میں الفاظ حدیث یہ ہیں: رؤیا المسلم من ستة وأربعین جزءاً من النبوة، وهی علیٰ رجل طائر مالم یتحدث بها، فإذا تحدث بها سقطت، قال الراوی وأحسبه قال: ولا یحدث بها إلا لبیباً أو حبیباً"۔ (ترمذی حدیث: ۲۲۷۸/۲۲۷۹/۲۲۸۰)

فائدہ:- الرؤیا علیٰ رجل طائر الخ بقول امام خطابی یہ ایک محاورہ اور مثل ہے، جس چیز کے لئے قرار وثبات نہ ہو تو اس کے لئے اہل عرب یہ جملہ استعمال کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ چڑیا جس طرح فضائے آسمان میں اڑتی اور متحرک رہتی ہے اسی وہ چیز بھی متحرک رہتی ہے جو اس کے پر سے لگی ہوئی ہوتی ہے، یعنی اسے بھی قرار و

ثبات نہیں ہوتا، ٹھیک یہی معاملہ خواب کا بھی ہے کہ جب تک اس کی تعبیر نہ بیان کردی جائے اس وقت تک اس کے اثر کا ظہور نہیں ہوتا، لیکن جب تعبیر بیان کردی جائے تو پھر بیان کردہ تعبیر کے مطابق اس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے، خواب کی جو تعبیر اول اول بیان کی جاتی ہے عموماً اسی کے مطابق اس کے اثر کا ظہور ہوتا ہے (بشرطیکہ کسی نہ کسی درجہ میں اس کا تعلق اس سے ہو، بالکل بے بنیاد نہ ہو) اس لئے رسول اکرم ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنا خواب اسی سے بیان کرو جو تم سے الفت ومحبت رکھتا ہو، ذی رائے ہو، اور تعبیر رؤیا کے فن سے واقفیت رکھتا ہو، کیوں کہ وہ تعبیر ایسی بیان کرے گا جو فرحت وسرور کا باعث ہوگی، اور خواب اگر نہایت اچھا ہو، اور اس کی تعبیر بھی بالکل عیاں ہو تو بھی اسے تعلق رکھنے والے، متقی اور پرہیزگار اور خواب کے رموز واسرار سے واقف شخص سے ہی بیان کرنا چاہئے تاکہ عمدہ سے عمدہ تعبیر سامنے آئے جو انبساط و سرور میں اور زیادہ اضافہ کردے۔

خواب کی تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا ضروری نہیں:- اگر کسی شخص نے کوئی خواب دیکھا اور اس کی تعبیر بھی دے دی گئی تو بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی تعبیر فوراً ظاہر ہوجائے، بلکہ بسا اوقات خواب کی تعبیر کافی تاخیر سے ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مذکورہ خواب کی تعبیر تقریباً چالیس سال کے بعد ظاہر ہوئی، ایسے ہی رسول اللہ ﷺ نے ۶ھ میں عمرہ ادا کرنے کا خواب دیکھا، مگر اسی سال اس کی تعبیر سامنے نہیں آئی بلکہ ایک سال بعد ظاہر ہوئی، چنانچہ ۶ھ میں عمرہ کا احرام باندھ کر آپ ﷺ مع اصحاب مقام حدیبیہ تک تشریف لے گئے مگر بچند وجوہ وہیں احرام کھول کر مدینہ منورہ واپس چلے آئے، پھر ۷ھ میں ٹھیک ایک سال بعد عمرہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

فائدہ:- ۶ھ میں چودہ سو جاں نثار صحابہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ تک پہونچ جانے کے باوجود رسول اکرم ﷺ کے عمرہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ یہ ہوئی کہ مکہ مکرمہ جہاں خانۂ کعبہ واقع ہے وہ ابھی تک مشرکین مکہ کے تسلط اور قبضہ میں تھا، اور وہ ابھی تک آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے، لہذا حدیبیہ کے مقام پر متعدد شرائط کے ساتھ ان سے دس سال تک جنگ بندی پر معاہدہ ہوا جس میں یہ بھی طے ہوا کہ آپ ﷺ مع اصحاب آئندہ سال آ کر عمرہ ادا کریں، چنانچہ قرارداد کے مطابق آپ ﷺ اس وقت واپس ہو گئے اور پھر پورے ایک سال بعد اصحاب کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے جا کر عمرہ ادا فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاوِيْلِ الْأَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰى آلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ أَتَمَّهَا عَلٰى أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ.

اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو تیرا رب اور سکھلائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا اور پورا کرے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھر پر جیسا کہ پورا کیا تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم اور اسحاق پر، البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا۔

ترکیب ولغات:- يَجْتَبِيْكَ وہ تجھ کو منتخب کرے گا، چن لے گا، اجتباء کے معنی ہیں مہتم بالشان کاموں کے لئے چن لینا، **ويعلمك**، اور تجھ کو سکھائے گا، باب تفعیل سے، تاویل مشتق ہے اَول سے بمعنی اصل کی طرف لوٹنا، حقیقت کو بیان کرنا، أحادیث، کہانیاں، باتیں حدیث کی جمع ہے، ہر وہ کلام جو انسان تک پہونچ سکے خواہ بذریعہ سماعت، خواہ بذریعہ وحی، عالم خواب میں ہو یا بحالت بیداری، اس کو حدیث کہتے ہیں۔ یتم، افعال سے وہ پورا کرتا ہے، **نعمة** بمعنی انعام۔

يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ کا جملہ جواب ہے ندا کا یا مستانفہ ہے، جو قائم مقام قول کے ہے، اور جملہ **ويعلمك** مستانفہ ہے، اور یتم پورا جملہ معطوف ہے، **يعلمك** پر، اور جملہ أتمها صلہ ہے اسم موصول کا، ابراہیم، واسحاق عطف بیان ہے ابویک کا، اور إن ربک علیم حکیم تعلیل کے حکم میں ہے۔

معارف وحقائق

وكذالك يجتبيك الآية کا مفہوم:- وكذالك یعنی جس

طرح اللہ تعالیٰ نے ایسے عظیم الشان خواب کے ذریعہ جو عظمت وشرافت پر دلالت کرتا ہے، آپ کو منتخب کرلیا ہے اسی طرح وہ آپ کو نبوت ورسالت اور دنیاوی سلطنت وحکومت کے لئے بھی چن لے گا، چنانچہ خواب کے تقریباً چالیس سال بعد اس انتخاب کا بھی اظہار ہوگیا کہ آپ ملک مصر کی سلطنت وحکومت کے مالک بنادیئے گئے۔

ویعلمک مجاہد اور کئی ایک مفسرین کا قول ہے کہ تعبیر خواب کا علم عطا کرے گا، یعنی خواب کو سن کر ذہانت وفطانت سے اس کی تعبیر بتادینا، ہر بات کے موقع ومحل کو سمجھنا، اور معاملات کے عواقب ونتائج کو فوراً پرکھ لینا، یا خدا اور پیغمبروں کے ارشادات، اقوام واُمم کے قصص اور کتب منزلہ کے مضامین کی تہہ تک پہونچ جانا، یہ سب چیزیں **تاویل الاحادیث** کے تحت مندرج ہوسکتی ہیں۔ (فوائد عثمانی ص ۳۲۱)

ویتم نعمته: اور عطاء نبوت کے ذریعہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرے گا، اور نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی عطا کرے گا، رنج وغم اور محنت ومشقت سے نکال کر چین وسکون کی زندگی عطا کرے گا، اور پورے خاندان یعقوب علیہ السلام کو شدائد ومحن سے نکال کر راحت وآرام، فارغ البالی اور خوش حالی کی زندگی سے نوازے گا، اور ان کی نسل سے بڑے بڑے انبیاء ورسل پیدا کرے گا۔

کما أتمها: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پردادا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو اپنی نعمتوں سے نواز کر نارِ نمرود کو ان کے لئے بردوسلامتی بنادیا، **قُلْنَا يَانَارُ كُوْنِيْ بَرْداً وَّسَلَاماً عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ** (انبیاء:۶۹) اور اس سے نجات عطا کرکے مقام خلت پر فائز کیا، اور دادا اسحاق علیہ السلام کو بھی نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا، حضرت یوسف علیہ السلام کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام بھی اللہ کے برگزیدہ نبی ہیں مگر تواضعاً انھوں نے اپنا نام نہیں لیا۔

"إن ربک علیم حکیم": بلاشبہ اللہ بڑا جاننے والا ہے، اس کے لئے کسی کو کوئی فن سکھا دینا ذرا بھی مشکل نہیں، اور وہ خوب جانتا ہے کہ کون منصب نبوت ورسالت کے لائق ہے، اور کون لائق نہیں ہے۔ "اور حکمت والا ہے" یعنی اس کا ہر کام مبنی بر حکمت ہوتا ہے، کہ اپنی حکمت کے مطابق جسے چاہتا ہے علم وحکمت اور فضل وکمال سے نوازتا ہے، اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا، خواہ وہ ہماری عقل میں آئے یا نہ آئے۔ (ماخوذ از روح المعانی ج ۶ ص ۳۸۱)

کیا برادران یوسف علیہ السلام نبی تھے؟:- "وعلیٰ آل یعقوب"، بعض حضرات نے آیت کے اس جملہ، اور آیت کریمہ "قولوا آمنا باللہ وما أنزل إلینا وما أنزل إلیٰ إبراهیم وإسماعیل وإسحاق ویعقوب والأسباط" میں لفظ "اسباط" سے برادران یوسف کی نبوت پر استدلال کیا ہے، کہ توبہ کے بعد اللہ نے ان کو بھی نبی بنا دیا تھا، مگر عقل ونقل ہر اعتبار سے یہ استدلال غلط ہے، اس لئے کہ نہ تو قرآن کریم میں ہی اس کا کوئی تذکرہ ہے، اور نہ لغتاً وعقلاً ہی اس کی تائید ہوتی ہے، اور نہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی اس کے بارے میں کچھ منقول ہے۔

ذکر الشیخ ابن تیمیہؒ فی مؤلف له خاص فی هٰذه المسئلة ماملخصه: الذی یدل علیه القرآن واللغة والاعتبار أن أخوة یوسفؑ لیسوا بأنبیاء ولیس فی القرآن ولا عن النبی ﷺ بل ولا عن أحدٍ من أصحابهؓ (روح المعانی ج ۶ ص ۳۷۵)

انبیاء علیہم السلام قبل نبوت بھی معصوم ہوتے ہیں:- اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبل نبوت بھی کبائر کے ارتکاب سے منزہ اور پاک ہوتے ہیں، یعنی قبل نبوت بھی ان سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہوسکتا،

جیسا کہ بعد نبوت اس کا صدور نہیں ہوسکتا، راجح قول کے مطابق وہ صغائر کے صدور سے بھی منزہ اور پاک ہوتے ہیں، اور برادران یوسف علیہ السلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک دو نہیں بلکہ مسلسل کبائر کا ارتکاب کرتے رہے ہیں، مثلاً والدین کی نافرمانی، قطع رحمی، اپنے مسلمان بھائی کے قتل کا اقدام، اس کو غلام بنا کر فروخت کر ڈالنا، صریح جھوٹ اور حیلے بنانا، بھائی پر ناحق جان بوجھ کر چوری کا الزام لگانا، "إن یسرق فقد سرق أخ له من قبل" وغیر ذلك، کیا قبل نبوت بھی کسی نبی کی جانب ان حرکات شنیعہ کی نسبت کی جاسکتی ہے؟ (العیاذ باللہ) (روح المعانی ج۶ ص۳۷۶) البتہ یہ بات ضرور ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے اپنی ان حرکات شنیعہ سے سچی توبہ کرلی تھی اور پھر ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں گذری، والدین بھی ان سے راضی اور خوش ہوگئے تھے، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی "لاتثریب علیکم الیوم" کا اعلان فرما کر ان کو معاف کردیا تھا، لہٰذا ان کو اللہ کا ولی ضرور کہا جاسکتا ہے۔

(پہلے رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

✿✿✿✿✿

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَإِخْوَتِهٖ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِيْنَ.

البتہ ہیں یوسف علیہ السلام کے قصہ میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کے لئے۔

معارف وحقائق

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہر انسان کے لئے مرقع عبرت ہے:

''لقد کان فی یوسف، الآیة'' قسم مقدر کا جواب ہے، ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے جبکہ رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ مکرمہ ہی میں مقیم تھے، کہ آپ ﷺ کا آوازہ اور آپ ﷺ کی شہرت مدینہ منورہ پہونچ چکی تھی، چنانچہ یہودِ مدینہ نے آپ کی نبوت ورسالت کی صداقت کا امتحان لینے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کا انتخاب کیا، اور اپنے چند آدمیوں کو اس کام کے لئے مکہ مکرمہ روانہ کیا، ان لوگوں نے براہ راست یا مشرکین مکہ کے واسطے سے یہ سوال کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ملک شام سے مصر کس طرح پہونچی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ کیا ہے؟ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورہ یوسف علیہ السلام کو نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے یہ سورہ پڑھ کر ان کو پورا واقعہ تفصیل سے بتایا، مطلب یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے واقعہ میں یہود اور مشرکین مکہ کے لئے جنھوں نے آپ کی نبوت کا امتحان لینے کے لئے یہ سوال کیا تھا، اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کی بڑی نشانیاں اور انصاف سے کام لینے والوں کے لئے بڑی عبرت ونصیحت کی باتیں ہیں۔

یہود اور مشرکین مکہ سے قطع نظر مفسرین نے آیت کریمہ کا یہ مفہوم بھی بیان فرمایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ فی نفسہ غیر سائلین اور عام لوگوں کے لئے بھی اپنے اندر بڑی نشانیاں، حکمتیں اور عبرتیں لئے ہوئے ہے، کہ بھائیوں نے بغض وحسد کی بنا پر ہلاک کر دینے کی غرض سے جس بچے کو کنویں میں ڈال دیا تھا، اور پھر اپنا غلام بتا کر قافلہ والوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے کس طرح اسے مصر جیسے متمدن ملک اور عزیز مصر کے پاس پہونچا دیا، اور ایک دن اسی بے یار و مددگار مظلوم کو ملک مصر کا والی اور حاکم بنا دیا، اور اس کے برعکس جن بھائیوں نے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی ان کو دست نگر اور محتاج بنا کر اسی مظلوم بچے کے سامنے کھڑا کر دیا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں سے کوئی انتقام نہیں لیا بلکہ ''لاتثریب علیکم الیوم'' کہہ کر ان کے تمام کالے کرتوتوں پر قلم عفو کھینچ دیا۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کامیاب اور کامران بنایا اور ایک دن وہ آیا کہ ظالموں کو سرِ ندامت جھکانا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے انھیں معاف کر دیا، ٹھیک اسی طرح وہ دن بھی آنے والا ہے کہ حضور اکرم ﷺ بھی کامیاب وکامران ہوں گے، اور آپ ﷺ کے اعزا واقارب اور اہل مکہ جو آپ ﷺ کی ایذا دہی میں ہمہ تن مشغول ہیں ان کو بھی آپ ﷺ کے سامنے نادم ورسوا ہونا پڑے گا، اور آپ ﷺ بھی ''لاتثریب علیکم الیوم'' فرما کر انھیں معاف کر دیں گے، فتح مکہ کے بعد یہ منظر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

برادران یوسف علیہ السلام کی تعداد اور ان کے اسماء:- حضرت یوسف علیہ السلام کے کل گیارہ بھائی تھے جن کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(۱) روبیل، (۲) شمعون، (۳) لاوی، (۴) یہوذا، (۵) زیالون، (۶) شجر، تفسیر مظہری میں یشجر مذکور ہے۔ ان کی ماں کا نام لیّا بنت لیان تھا۔ چار بھائی حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو باندیوں سے تھے، (۷) دان، (۸) نفتالی، ان کی ماں کا نام بلھا تھا، (۹) جاد، (۱۰) اشران، دونوں کی ماں کا نام زلفہ تھا، (۱۱) حضرت یوسف علیہ السلام، (۱۲) بنیامین، یہ دونوں راحیل بنت لیان کے بطن سے تھے۔

(مختصر قرطبی ج ۲ ص ۴۲۳، تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۴۲)

إذ قالوا ليوسف وأخوه أحب إلىٰ أبينا منا ونحن عصبة ، إن أبانا لفي ضلال مبين.

جب کہنے لگے البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم ان سے قوت والے لوگ ہیں، البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے ۔

ترکیب ولغات:- "إذ" مفعول بہ ہے أذكر فعل مقدر کا، ليوسف میں لام جواب قسم کے مضمون جملہ کی تاکید کے لئے ہے، عبارت کی تقدیر واللہ ليوسف ہے اور جملہ ليوسف مقولہ ہے قول کا، ونحن عصبة جملہ حالیہ ہے، إن أبانا الخ جملہ مستانفہ ہے۔

مفرد ہونے کے باوجود أحب یہاں حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی بنیامین دونوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "أحب" اسم تفضیل ہے، جو واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث ہر ایک کے لئے یکساں ہے، "أخوه" میں أخ کی اضافت ضمیر واحد کی طرف ہے، حالانکہ وہ سب بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین دونوں ایک ماں سے تھے، اور بقیہ بھائی دوسری ماؤں سے، تو بنیامین کے علاوہ دوسرے حقیقی نہیں بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے علاتی بھائی تھے۔

وإنما قالوا :وأخوه وهم إخوته أيضاً لأن أمهما كانت واحدةً ، وإنما قيل أحب في الاثنين لأن أفعل مما لا يفرق فيه بين الواحد وما فوقه ولا بين المذكر والمؤنث. (مدارک ج۲ ص۲۱۲)

عصبة طاقتور جماعت، فراء نحوی کا قول ہے کہ لفظ عصبة دس اور دس سے

زیادہ کے لئے بولا جاتا ہے۔

قال الفراء العصبة هی العشرة فمازاد۔ (مظہری ج۵ ص۱۴۳)

ایک قول یہ ہے کہ ایک سے لے کر دس تک کے درمیانی عدد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ''والعصبة مابین الواحد الی العشر'' (مختصر قرطبی ج۲ ص۴۲۳) مجاہد کہتے ہیں کہ دس سے پندرہ تک کے درمیانی عدد کے لئے بولا جاتا ہے، ''قال مجاهد مابين العشرة إلىٰ خمسة عشرة'' (قرطبی) قاموس میں مذکور ہے کہ دس سے لے کر چالیس تک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ''قال مابين العشرة إلىٰ الاربعين'' كذا فی القاموس . (قرطبی)

معارف و حقائق

حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے والہانہ محبت کیوں تھی؟:-

حضرت یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے تھے، چھ لیّا کے بطن سے، چار دو باندیوں بلہا اور زلفہ سے اور حضرت یوسف علیہ السلام و بنیامین لیّا کی حقیقی بہن راحیل سے، حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کے علاوہ ایک تو سب بھائیوں میں چھوٹے تھے، دوسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن و جمال اور باطنی فضل وکمال سے بھی نوازا تھا، اور مزید برآں یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہونے والے پیغمبر تھے، جس کا حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم تھا، اس لئے ان کا طبعی میلان تمام بھائیوں کے مقابلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سب سے زیادہ تھا، اور سب سے چھوٹا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا حقیقی بھائی ہونے کی بنا پر دوسرے علاّتی بھائیوں کے مقابلہ میں بنیامین سے بھی تعلق زیادہ تھا، برادرانِ یوسف علیہ السلام کو باپ کا یہ طرزِ عمل گوارا نہ تھا، چنانچہ ایک نے دوسرے سے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ تو بڑا ہی اندھیر ہے کہ ایک طاقتور

جماعت اور کڑیل جوان ہونے کی وجہ سے وقت پر کام آنے والے تو ہم ہیں، اور یہ دونوں بچے ہیں، پھر ہمارے مقابلہ میں ان کو ترجیح دینا باپ کی کھلی غلطی ہے۔

ضلال سے کیا مراد ہے؟:- "إن أبانا لفی ضلالٍ مبین" میں ضلال سے مراد دینی گمراہی نہیں ہوسکتی، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی ہیں اور بیٹوں کو یہ بات معلوم ہے لہٰذا بیٹے اگر ان کو دینی اعتبار سے گمراہ قرار دیتے تو کافر ہوجاتے، اور فرزندان یعقوب کا کافر نہ ہونا دلیل سے ثابت ہے، اور وہ یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی درخواست پر ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی، بلکہ ضلال سے مراد یہ ہے کہ ہمارے طاقتور جتھے کو چھوڑ کر ان دونوں کو ترجیح دینا باپ کی صریح غلطی ہے۔

"لیس المراد من الضلال، الضلال عن الدین، ولو اراد و ذالک لکفر وابه، بل المراد منه الخطاء فی التدبیر، یعنون به إنا انفع له فی امر الدنیا واصلاح معاشه، ورعی مواشیه، فنحن اولیٰ بالمحبة منهما فهو مخطیٔ خطاءً بیّنا فی ایثاره یوسف واخاه علینا فی صرف محبته الیهما". (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۴۳)

حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہی طرزِ عمل برادران یوسف کے حسد کا سبب بن گیا، اصل میں انھوں نے باعتبار عمر چھوٹا ہونے کو تو دیکھا مگر حقیقی عظمت و بڑائی کو نہ دیکھ سکے، ولم یعرفوا أن یوسف أکبر منهم بحسب الحقیقة. (روح البیان ج۴ ص۲۱۸)

اور چونکہ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کا بھی علم ہو چکا تھا اور ممکن ہے کہ وہ تعبیر سے بھی واقف ہوگئے ہوں، اس لئے انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے راستہ سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا، جس کا بیان اگلی آیت میں آرہا ہے۔

اُقْتُلُوْا يُوْسَفَ أَوِ طْرَحُوْهُ اَرْضاً يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْماً صَالِحِيْنَ ، قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَاتَقْتُلُوْا يُوْسَفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ.

مارڈالو یوسفؑ کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے تم پر توجہ تمہارے باپ کی اور ہو رہنا اسکے بعد نیک لوگ، بولا ایک بولنے والا ان میں، مت مارو یوسف کو اور ڈال دو اس کو گمنام کنویں میں کہ اُٹھا لیجائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے۔

ترکیب ولغات:- اوطرحوہ اس کو پھینک دو، باب فتح سے، یخل واحد مذکر غائب خلو اور خلاء مصدر، تنہا رہ جائے، خالص رہ جائے، وجہ (ج) وجوہ، توجہ، غیابۃ تاریک، جب کنواں، یلتقطہ إلتقاط باب افتعال سے چن لینا، اٹھالینا، سیارۃ بمعنی قافلہ، مؤنث ہے سیّار کا۔ اقتلوا جملہ مستانفہ ہے اور اطرحوہ معطوف ہے "اقتلو یوسف" پر۔ "یخل لکم وجہ أبیکم" جواب ہے شرط مقدر "أن تطرحوہ" کا اور "تکونوا" کا عطف "یخل لکم" پر ہے، قال قائل مستانفہ، اور لاتقتلوا مقولہ ہے قول کا، القوہ معطوف ہے لاتقتلوا پر، یلتقطہ بعض السیارۃ جواب ہے شرط مقدر أن تلقوہ کا، إن کنتم فاعلین جملہ شرطیہ مستانفہ ہے، اور جواب شرط فافعلوا محذوف ہے، تقدیر عبارت "إن کنتم فاعلین فافعلوا ھذا المقدار من التفریق" ہوگی۔

معارف و حقائق

وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ قتل کا مشورہ شمعون نے دیا تھا۔ کعب، دان کو اس کا

مجرم بتاتے ہیں، اور مقاتل کہتے ہیں کہ روبیل نے قتل کی رائے دی تھی۔

(تفسیر مظہری ج۵ ص۱۴۳)

قتل کا مشورہ دینے والا اصل میں کوئی ایک تھا، مگر قرآن کریم نے اس کی نسبت دسوں بھائیوں کی طرف کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مشورۂ قتل اگرچہ ایک نے دیا تھا مگر ایک کو چھوڑ کر سب اس پر راضی تھے، لہٰذا اکثریت کے راضی ہونے کی بنا پر مجازاً سب کی جانب نسبت کر دی گئی۔

"إنما أسند هٰذا القول إلیٰ جمیعهم مع أن القائل به کان واحداً منهم لأن الباقین رضوا به إلا من قال لاتقتلوا فاستند الفعل إلی الکل مجازاً لصحة إسناده إلیٰ أکثرهم لأجل رضائهم به". (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۴۳)

أوطرحوه أرضاً مراد ایسی جگہ ہے جو آبادی سے دور اور غیر معروف ہو کہ جہاں تک تلاش کے لئے جانے کا کسی کو وہم وگمان بھی نہ ہو۔

"أی منکورة مجهولة بعیدة عن العمران". (مدارک ج۲ ص۲۱۳)

یخل لکم وجه أبیکم جواب ہے امر کا یعنی جب یوسف موجود نہ ہوں گے تو باپ کی توجہ از خود تمہارے لئے خالص ہو جائے گی۔

"یقبل علیکم اقبالة واحدة لایلتفت عنکم إلیٰ غیرکم". (مدارک)

قوماً صالحین یعنی قتل کے گناہ سے توبہ کر کے نیک اور صالح بن جانا، یا مطلب یہ ہے کہ باپ سے عذر ومعذرت کر کے آئندہ ان کے ساتھ عمدہ اور اچھا سلوک کرنا، یا یہ کہ جب یوسف نہ ہوں گے تو باپ کی توجہ صرف تمہاری ہی جانب ہوگی، جس سے تمہارے دنیاوی معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔

اقتلوا یوسف الآیة کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہمت

کر کے ایک مرتبہ ارتکابِ قتل ناحق کا گناہ کرلوتا کہ یوسف کا کانٹا راستہ سے صاف ہو جائے اور پھر اللہ سے توبہ کر کے اور باپ سے معافی مانگ کر نیک اور صالح بن جانا، لوگ واقعہ کو چند دنوں تک یاد رکھیں گے اور پھر بھول جائیں گے، یا مفہوم یہ ہے کہ قتل کے بعد باپ سے عذر و معذرت کر لینا، پھر باپ کی توجہ کا مرکز تم ہی رہ جاؤ گے، اس طرح سے تمہارے دنیاوی تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔

"تائبین الی اللہ عما جنیتم فیعف اللہ عنکم، او صالحین مع ابیکم یصلح ما بینکم و بینہ بعذر تمھدونہ.....او صالحین امر دنیاکم فانہ ینتظم لکم بعدہ لخلو وجہ ابیکم".

(تفسیر مظہری ج۵ ص۱۴۴، مدارک ج۲ ص۲۱۳)

قال قائلٌ منھم مراد یہوذا ہے، قتادہ نے روبیل کو قرار دیا ہے، بغوی کہتے ہیں کہ پہلا قول اصح ہے۔ (مظہری)

"غیبت الجب" مراد ایسا کنواں ہے جو لوگوں کی نظروں سے غائب ہو، "ماغاب منہ عن عین الناظر" (مدارک) جس کنویں پر منڈیر نہ بنی ہو اور اس کی وجہ سے دکھائی نہ دیتا ہو اسے جُبّ کہا جاتا ہے۔

"الرّکیۃ التی لم تطو فاذا طویت فھو بئرٌ" (قرطبی) یا وہ حوض جو کنویں وغیرہ میں پانی سے ذرا اوپر بنا ہوا ہوتا ہے اسے جُب کہتے ہیں۔

"او طاق فی البئر فوق الماء". (بحر محیط ج۵ ص۲۸۴)

"یلتقطہ" ایسی گری پڑی چیز جو کسی کو بغیر طلب مل جائے وہ "لقطہ" کہلاتی ہے اور بغرض حفاظت راستہ میں گرے پڑے سامان کو اٹھا لینے کو "التقاط" کہا جاتا ہے۔

"فإن الالتقاط أخذ شیٔ مشرف علی الضیاع". (روح البیان ج۴ ص۲۱۹)

اگر وہ غیر جاندار ہے تو لقطہ اور جاندار ہے تو لقیط ہے، انسان کو لقیط اسی وقت کہا جائے گا جبکہ وہ بچہ ہو عاقل بالغ نہ ہو۔

''السیارۃ'' سفر کرنے والے قافلے، '' الجمع الذی یسیرون فی الطریق '' (قرطبی) بقول بغوی صحیح یہ ہے کہ عدم قتل کی رائے یہوذا نے دی تھی جو بھائیوں میں سب سے زیادہ حلیم، بردبار اور صائب الرائے تھا۔

''کان أحلمهم وأحسنهم رأیاً''۔ (بحر محیط ج ۵ ص ۲۸۴)

''یھوذا'' کا کہنا یہ تھا کہ قتل کرنا تو انتہائی شناعت و بے حیائی کی بات ہے اور ہمارا مقصد کہ یوسف باپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے قتل کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ اسے کسی گمنام کنویں میں ڈال دو، ممکن ہے کوئی قافلہ وغیرہ ادھر سے گزرے اور پانی بھرنے کی غرض سے کنویں پر جائے اور اسے نکال کر مالِ غنیمت کے طور پر اپنے ساتھ لے کر چلا جائے، لہٰذا اگر تم کو کچھ کرنا ہی ہے تو بس اتنے پر اکتفا کرو۔

یھوذا کے قول ''إن کنتم فاعلین '' سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ وہ نہ تو قتل کے حق میں تھا، اور نہ کسی اور دوسری کارروائی کے، مگر دوسرے بھائیوں سے مجبور ہو کر اس نے یہ کہا کہ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو بس کسی گمنام کنویں میں ڈالنے کے عمل پر ہی اکتفا کرو۔ (تفسیر کبیر ج ۱۸ ص ۷۷)

فائدہ:- زمانہ قدیم میں کنویں عموماً ایسے موقعوں پر ہوتے تھے جو عام رہ گذر ہو، قافلے ان کے پاس سے گذرتے تو ضرور پانی بھرتے، اور یہ تاریخ کی ایک معلوم حقیقت ہے کہ فلسطین کے جنوبی مشرقی علاقہ میں تجارتی قافلوں کی آمد و رفت ایک طرف فلسطین اور مصر اور دوسری طرف عرب اور مصر کے درمیان برابر رہا کرتی تھی،

(تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۵۸۲) مگر تفسیر قرطبی میں مذکور ہے کہ وہ کنواں جس میں برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈالا تھا، وہ شاہراہِ عام پر نہیں بلکہ کسی غیر معروف جگہ پر تھا، چنانچہ کوئی حجازی قافلہ بغرض تجارت مصر جارہا تھا اور راستہ بھول کر اس کنویں پر پہونچ گیا تھا۔

''أی رفقة مـــارّةٍ یسیرون من الشام إلی مصر فاخطئوا الطریق وهـا مـوا حتیٰ نـزلـوا قـریباً من الجبّ وکان الجب فی قفرةٍ بعیدةٍ عن العمران''. (م قرطبی ج ۲ ص ۴۲۷)

''یلتقطه بعض السیارة'' کنواں جس میں برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈالا تھا اس کے بارے میں تمام مفسرین، صاحب قرطبی، کبیر، نسفی اور مظہری وغیرہ نے یہی لکھا ہے کہ وہ آبادی سے دور چٹیل میدانی علاقہ میں واقع تھا اور کئی ایک نے اس کے غیر آباد ہونے کا بھی قول نقل کیا ہے مگر آیت کریمہ کے مذکورہ ٹکڑے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کنواں شاہراہِ عام پر تھا، جہاں سے عموماً قافلے وغیرہ گذرتے اور پانی لیا کرتے تھے، اور اسے غیبت الجب یعنی گمنام کنواں اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ آبادی سے دور تھا جہاں سے قافلے وغیرہ تو گذرتے تھے مگر آبادی کے لوگوں کی آمد و رفت وہاں نہیں تھی، (اور یہی بات اصح معلوم ہوتی ہے)۔

قَالُوْا يَا أَبَانَا مَالَكَ لَاتَأْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَإِنَّا لَهٗ لَنَاصِحُوْنَ.

بولے اے باپ کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں۔

ترکیب ولغات:- ''قالوا'' جملہ مستانفہ یا أبانا مقولہ ہے قول کا مالک پورا جملہ ندا کا جواب ہے، لاتأمنا، ک ضمیر خطاب سے حال ہے، اور إنا له لناصحون حال ہے یوسف سے یا لاتأمنا کی ضمیر مفعول سے۔

امام تفسیر مقاتل نے یہاں کلام خداوندی میں تقدیم وتاخیر کا قول کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ بیٹوں نے باپ سے کہا "أرسله معنا غداً يرتع ويلعب" کل یوسف کو ہمارے ساتھ جنگل جانے دیجئے تاکہ آسودگی کے ساتھ کھائے کھیلے، باپ نے جواب میں کہا "إني ليحزنني الخ" تو بیٹوں نے کہا "مالک لا تأمنا".

"قال مقاتل في الكلام تقديم وتاخير وذلك انهم قالوا "أرسله معنا" فقال أبوهم "إني ليحزنني" فحينئذٍ قالوا "مالک لا تأمنا". (مظہری ج۵ ص۱۴۵)

برادران یوسف کا آپس میں مشورہ:- برادران یوسف علیہ السلام نے پہلے آپس میں مشورہ کیا اور جب ایک بات طے کر چکے تو اب اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے ضرورت اس کی ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ سے حاصل کریں، اور اسے جنگل لے جا کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنائیں، چنانچہ اس کام کے لئے سب والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور نسب کا واسطہ دے

کر (تاکہ والد بآسانی راضی ہو جائیں) یہ کہا:

ابا جان آخر آپ یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہم پر اطمینان کیوں نہیں کرتے، یعنی ہمارے ساتھ جنگل وغیرہ آنے جانے کی آزادی کیوں نہیں دیتے، ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں، یعنی چھوٹا بھائی ہونے کی بنا پر اس کا پورا پورا خیال رکھیں گے، اور بھرپور شفقت ومحبت کا معاملہ کریں گے، فرزندان یعقوب کے طرزِ کلام سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں اس سے پہلے بھی وہ کبھی اس قسم کی درخواست کر چکے تھے، مگر انھوں نے ان کی درخواست کو رد کر دیا تھا۔

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَداً يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ. قَالَ إِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْ أَنْ تَذْهَبُوْا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَّأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُوْنَ ، قَالُوْا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذاً لَّخَاسِرُوْنَ.

بھیج اس کو ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں، بولا مجھ کو غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ، اور ڈرتا ہوں اس سے کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور تم اس سے بے خبر رہو۔

ترکیب ولغات:- "یرتع" آزادی اور وسعت کے ساتھ میووں وغیرہ کو کھائے، یتسع فی أکل الفواکه ونحوها فإن الرتع هو الاتساع فی الملذ.

(روح البیان ج۴ص۲۲۱)

"لعب" سے مراد وہ کھیل ہے جو مباح ہو جیسے شکار کرنا، تیر اندازی اور دوڑ وغیرہ، خود رسول اللہ ﷺ سے مباح کھیلوں کی اجازت ثابت ہے، چنانچہ حضرت جابر ؓ نے جب ایک ثیبہ عورت سے نکاح کرلیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کسی باکرہ عورت سے نکاح کیوں نہ کیا وہ تیرے ساتھ کھیلتی اور تو اس کے ساتھ کھیلتا۔

"أنه علیه السلام قال لجابر فهلا بکراً تلاعبها وتلاعبک".

(بخاری ومسلم ۷۹/۵۰۷/۱۵)

اور بچوں کے لئے ایک حد تک کھیل کود ضروری بھی ہے تاکہ ان کی جسمانی نشوونما اچھی ہو سکے۔ (م، قرطبی ج۲ص۴۲۴)

"یحزنني" مجھ کو غم میں ڈالتی ہے (ن) أخاف میں ڈرتا ہوں (س)۔

الذئب بھیڑیا، ج: ذئاب .

''أرسله'' جملہ مستانفہ قائم مقام قول کے، یرتع بغیر فا کے جواب ہے، شرط مقدر ''ان أرسل'' کا یلعب کا عطف یرتع پر ہے، وإنا له لحافظون ،معنا کی ضمیر متکلم یا أرسله کی ضمیر غائب سے حال ہے، قال إنني ليحزنني الخ، جملہ مستانفہ برائے بیان عذر ہے، إنني ليحزنني ،مقولہ ہے قول کا، اور يحزنني محلاً مرفوع خبر ہے إنّ کی ''أن تذهبوا به'' بتاویل مصدر محلاً مرفوع ''يحزن'' کا فاعل ہے، وأخاف کا عطف جملہ سابقہ پر ہے، أن يأكله بتاویل مصدر محلاً منصوب مفعول بہ ہے اور اس کا عامل ''أخاف'' ہے، ''وأنتم عنه غافلون'' محلاً منصوب حال واقع ہو رہا ہے، قالوا..... جملہ مستانفہ، أن يأكله الذئب مقولہ ہے قول کا، ''نحن عصبة جملہ حالیہ ہے، إنا إذا لخاسرون'' جواب قسم، اور جواب شرط محذوف ہے، جس پر جواب قسم دلالت کر رہا ہے۔

معارف و حقائق

ارسله معنا غداً الآية کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ابا جان! یوسف علیہ السلام کو بھی ہمارے ساتھ جنگل جانے کی اجازت دیدیجئے، تاکہ وہ بھی آزادی کے ساتھ پھلوں وغیرہ کو کھائے، اور کھیلے کودے، جس سے جسم میں طاقت وقوت پیدا ہو، ورنہ تو گھر میں بیٹھے رہنے سے اعضاء میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جائے گی، اور اچھا خاصا حسین وخوبصورت لڑکا صحیح نشوونما سے محروم ہونے کی بنا پر ناکارہ اور برباد ہو جائے گا۔ (روح البیان ج ۴ ص ۲۲۱)

''وإنا له لحافظون'' ''لام'' تاکید کے لئے ہے۔

اور اگر آپ کو اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں اس کو کوئی تکلیف اور گزند نہ پہونچ

جائے تو ہم آپ سے مؤکد وعدہ کرتے ہیں کہ یوسف کی مکمل حفاظت کریں گے، اور ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہونچنے دیں گے، اور بعضوں نے یرتع میں عین کے کسرہ اور یا کے حذف کا قول کیا ہے، اس صورت میں اس کا مادہ ''رعی'' ہوگا اور معنی یہ ہوجائیں گے کہ ابا جان! آپ یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تا کہ ہمارے ساتھ وہ بھی بکریاں چرائے۔ (مظہری ج ۵ ص ۱۴۵)

''قال إنني ليحزنني'': ليحزنني میں لام، لامِ ابتداء ہے۔

برادران یوسف کے پختہ وعدے کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ نہ بھیجنے کے سلسلے میں دو عذر بیان کئے، ایک تو یہ کہ یوسف کی جدائی اور تمہارے ساتھ جانے کا تصور ہی مجھے غمگین بنائے دیتا ہے، اس پر مزید خوف یہ ہے کہ وہ بچہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت اور بے خبری میں کوئی درندہ جانور بھیڑیا وغیرہ اسے پھاڑ کھائے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ معلوم تھا کہ برادران یوسف علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام سے حسد اور بغض ہے اور وہ یوسف کو نقصان پہونچانے کے درپے ہیں مگر صاف لفظوں میں اس کو ظاہر نہیں فرمایا تا کہ بگڑ کر وہ اعلانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہوجائیں، اور یہ بھی خیال کیا کہ اشارہ کنایہ سے ممکن ہے کہ وہ اپنی ظالمانہ سازش سے باز رہیں، اس لئے اشارہ اشارہ میں ان پر حقیقت حال واضح کردی کہ واقعی مجھ کو یوسف کے بارے میں تم سے اندیشہ ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''ان کو (بھائیوں کو) آگے چل کر بھیڑیئے کا بہانہ کرنا تھا، وہی ان کے (یعقوب علیہ السلام) کے دل میں خوف آیا''۔

(فوائد عثمانی ص: ۳۱۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ نہ بھیجنے

کا دو عذر بیان کیا ایک تو یہ کہ یوسف علیہ السلام کی جدائی کا تصور ہی میرے لئے سوہانِ روح ہے، دوسرے یہ کہ بچہ ہے کہیں تمہاری غفلت کی وجہ سے کسی بھیڑیئے وغیرہ کا لقمہ نہ بن جائے، بھائیوں نے اس دوسرے عذر کا جواب ''لئن اکلہ الذئب الـــخ'' کے ذریعہ دیا مگر پہلے عذر کا کوئی جواب نہیں دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ان کا حسد اور غیظ وغضب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اسی شدت محبت کی وجہ سے تھا۔

''ان حقدهم وغيظهم كان بسبب العذر الاول وهو شدة حبه له''. (تفسیر کبیر ج ۱۸ ص ۶۹)

حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں بھیڑیئے ہی کا خیال کیوں آیا؟:-

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں بھیڑیئے ہی کا خیال کیوں آیا کہ بیٹوں نے جب ان سے یہ درخواست کی کہ یوسف علیہ السلام کو ہمارے ساتھ جنگل جانے کی اجازت دیدیئے تو انہوں نے ساتھ نہ بھیجنے کا عذر یہ بیان فرمایا کہ میں اس بات سے خائف ہوں کہ کہیں بھیڑیا ان کو اپنا لقمۂ تر نہ بنالے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کنعان کے جنگل میں بھیڑیئے کثرت سے تھے اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں اسی کا خوف پیدا ہوا۔

''الذئاب كانت في أراضيهم كثيرة''. (تفسیر کبیر ج ۱۸ ص ۷۸)

اور بغوی سے منقول ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب میں حضرت یوسف علیہ السلام پر بھیڑیئے کو حملہ کرتے دیکھا تھا، جس کی وجہ سے ان کے دل میں بھیڑیئے کا خوف آیا۔

''وقال البغوي وذلك أن يعقوب رأى في المنام أن ذئباً شد

علیٰ یوسف فکان یخاف من ذٰلک".

مگر صاحب مظہری نے یہ کہہ کر کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بذریعہ وحی اور قطعی ہوتے ہیں اور ان کا وقوع لازم ہوتا ہے، مذکورہ قول کی تردید کی ہے۔

قال المظهری: "وهٰذا عندی لیس بشیٔ فإن رؤیا الأنبیاء وحی قطعی الوجود، ولو کان قد رأی ذٰلک لتحقق البتة. (مظہری ج۵ص۱۴۶)

مگر امام تفسیر قرطبی وغیرہ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے خواب کو اس توجیہ کے ساتھ درست قرار دیا ہے کہ بھیڑیئے سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے دس بھائی ہیں، چنانچہ صاحب معارف القرآن قرطبی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا کہ وہ کسی پہاڑی پر ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں کہ اچانک دس بھیڑیوں نے ان پر حملہ کر دیا، مگر پھر ایک بھیڑیئے ہی نے مدافعت کر کے چھڑا دیا، اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے" جس کی تعبیر بعد میں یہ ظاہر ہوئی کہ دس بھیڑیئے، دس بھائی تھے اور جس بھیڑیئے نے مدافعت کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا وہ بڑے بھائی یہوذا تھے، اور زمین میں چھپ جانا کنویں کی گہرائی سے کنایہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بنا پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انھیں کو بھیڑیا کہا تھا، مگر بہ مصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی۔ (معارف القرآن ج۵ص۱۳۱ بحوالہ قرطبی)

"قالوا لئن أکله الذئب" حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے خوف کا اظہار کیا تو برادران یوسف نے کہا ابا جان! آپ کیسی بات کرتے ہیں، کیا ہماری جیسی مضبوط طاقتور جماعت کے ہوتے ہوئے ایسا ہوسکتا ہے کہ ہمارے ایک کمزور اور

چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے اور ہم اس کی حفاظت نہ کر سکیں، اگر ایسا ہوا تو قسم بخدا ہم تو بڑے ہی خسارے اور گھاٹے میں ہوں گے۔

صاحب کشاف نے یہاں قسم کو مقدر مان کر تقدیر عبارت "واللہ لئن أکلہ الذئب لکنا خاسرین" ذکر کی ہے۔

قال صاحب الکشاف "ھذہ اللام تدل علیٰ إضمار القسم"

(تفسیر کبیر ج ۱۸ ص ۷۹، مدارک ج ۲ ص ۲۱۳)

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَأَجْمَعُوْا أَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَايَشْعُرُوْ نَ

پھر جب لے کر چلے اس کو اور متفق ہوئے کہ ڈالیں اس کو گمنام کنویں میں اور ہم نے اشارہ کر دیا اس کو کہ تو جتائے گا ان کو ان کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے۔

ترکیب ولغات:- "ذهبوا به" پورا جملہ محلاً مجرور مضاف الیہ ہے اور لما کا جواب جعلوه فيها محذوف ہے، اور ایک قول کے مطابق لما کا جواب قالوا یا أبانا إنا ذهبنا نستبق ہے، اور جملہ أجمعوا معطوف ہے ذهبوا پر، اور بتقدیر قد جملہ حالیہ بھی بن سکتا ہے، في غيبت الجب متعلق ہے يجعلوا کے، أوحينا جملہ مستانفہ ہے، اور کوفیین کے نزدیک بزیادتی واو لما کا جواب ہے جیسا کہ فلما أسلما وتله للجبين وناديناه میں ونادينا، لما کا جواب ہے، لَتُنَبِّئَنَّهُمْ، جواب ہے قسم مقدر کا ای واللہ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ، وَهُمْ لَايَشْعُرُوْ ن حال ہے لَتُنَبِّئَنَّهُمْ کی ضمیر غائب سے اور لَايَشْعُرُوْ ن خبر ہے هم مبتدا کی۔

معارف و حقائق

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ الآية کا مفہوم:- والد محترم سے اجازت مل جانے کے بعد برادران یوسف جب ان کو لے کر اپنے ساتھ چلے اور یہوذا کے کہنے پر ارادۂ قتل کو ترک کر کے گمنام کنوئیں میں ڈالنے پر متفق ہو گئے اور اس کا پختہ عزم وارادہ کر لیا، تو ہم نے یوسف کی تسلی کے واسطے ان کے پاس وحی بھیجی کہ بھائیوں کے اس کرتوت

سے گھبرانے اور کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کنویں میں صحیح سالم محفوظ رہیں گے، یہ آپ کے لئے ذلت وپستی نہیں بلکہ عظمت وسرفرازی کی پہلی منزل ہے، ایک زمانہ آئے گا کہ یہی بھائی آپ کے دست نگر اور محتاج ہوں گے، آپ کو ان پر بالا دستی حاصل ہوگی، آپ ان کو ان کے کرتوت ''هل علمتم مافعلتم بيوسف وأخيه إذ أنتم جاهلون '' کے الفاظ سے یاد دلائیں گے۔ ''تم کو پتہ بھی ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں پڑے ہوئے تھے'' اور وہ پورے واقعہ سے بے خبر ہوں گے یعنی بُعدِ زمانہ اور مقام ومرتبہ کی بلندی کی بنا پر آپ کو پہچان نہ سکیں گے، قاله ابن عباس اور مجاہد وقتادہ نے فرمایا کہ برادران یوسف اس بات سے بے خبر رہے کہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی پیش آنے والے واقعات سے باخبر کر دیا ہے۔

"إنه أوحى الىٰ يوسف فى ذالک حال الضيق تطييبا لقلبه و تثبيتا له، انک لا تحزن مما انت فيه، فان لک من ذالک فرجا و مخرجا حسنا، و سينصرک الله عليهم و يعليک و يرفع درجتک و ستخبرهم بما فعلوا معک من هذا الصنيع.....قال ابن عباس: ستنبئهم بصنيعهم هذا فى حقک: وهم لا يعرفونک ولا يشعرون بک، وقال مجاهد وقتاده: بايجاء الله اليه". (ابن کثیر ج۲ ص۲۸)

اور ایک قول یہ ہے کہ إليه میں ضمیر غائب ھا راجع ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی جانب، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی خبر کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یوسف علیہ السلام بھائیوں کو ان کا معاملہ یاد دلائیں گے، اور وہ

(بھائی) بے خبر ہوں گے۔

وقیل الهاء لیعقوب ، أوحی الله تعالیٰ إلیه ما فعلوه بیوسف وأنه سیعرفهم بأمره وهم لا یشعرون بما أوحی الله إلیه. (م قرطبی ج۲ص۴۲۵)

مگر قول اول ہی راجح ہے، اس لئے قول ثانی کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے اپنے بیٹوں پر عتاب کے کوئی معنی باقی نہیں رہ جاتے اور نہ حضرت یوسف علیہ السلام کی گمشدگی پر رنج وغم کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی، صاحب روح المعانی نے قول ثانی کو بے حقیقت بتایا ہے۔

وزعم بعضهم أن ضمیر (الیه) یعود علی یعقوب علیه السلام ولیس بشیئ کما لا یخفی. (روح ج۲ص۳۹۰)

واقعہ کی تفصیل:- اجازت مل جانے کے بعد برادرانِ یوسف علیہ السلام بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ یوسف علیہ السلام کو اپنے کندھوں پر بیٹھا کر لے چلے، حضرت یعقوب علیہ السلام بھی کچھ دور تک ساتھ گئے، مگر جب باپ کی نظروں سے اوجھل ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے کندھے پر تھے اس نے فوراً ان کو زمین پر پٹک دیا، یہ بچے تھے اس جنگلی راستہ پر کڑیل جوانوں کے ساتھ کہاں تک چل پاتے، بھائیوں سے منت وسماجت اور فریاد کرنا شروع کیا مگر ہر ایک کا جواب یہی تھا کہ ان گیارہ ستاروں کو مدد کے لئے پکارو، اخیر میں یہوذا سے منت وسماجت کی، اسے رحم آ گیا چنانچہ اسی کی تجویز سے دوسرے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے پر اتفاق کیا، اور قتل سے باز رہے، الحاصل پوری سفاکی اور بے رحمی کے ساتھ کپڑے وغیرہ اتار کر حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا، مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی کہ کنویں میں پتھر کی ایک چٹان ظاہر ہوگئی، حضرت یوسف

علیہ السلام اس پر بیٹھ گئے، اور بذریعہ وحی ان کی تسلی وتشفی فرمائی گئی، ایک قول تو یہ ہے کہ وحی خداوندی کنویں میں ڈالے جانے سے پہلے ہی آگئی تھی، اور آئندہ پیش آنے والے واقعات سے حضرت یوسف علیہ السلام کو باخبر کردیا گیا تھا، کہ آپ صحیح سالم زندہ موجود رہیں گے، آپ کو ان بھائیوں پر فضیلت وبرتری حاصل ہوگی، اور دوسرا قول یہ ہے کہ وحی الٰہی کنویں میں ڈالے جانے کے بعد آئی، اور پیش آنے والے حالات وواقعات سے مطلع فرمادیا گیا۔

فلما خرجوا به جعلوا يحملونه علىٰ رقابهم و يعقوب ينظر اليهم، فلما بعد واعنه و صارد به إلى الصحراء القو إلى الارض و اظهروا له ما فى انفسهم من العداوة و بسطوا له القول و جعلوا يضربونه فجعل كلما جاء الى واحد منهم واستغاث به ضربه..... (وقالوا كل واحد منهم) يا ابن راحيل انت صاحب الاحلام قل لرؤياك تخلصك من أيدينا ولوى عنقه فاستغاث بيهوذا..... فادركته رحمة الاخوة ورق له فقال: يا إخوتاه ما على هذا عاهد تمونى الا ادلكم علىٰ ما هو اهون لكم وارفق به؟ قالوا: وماهو؟ قال: تلقونه فى هذا الجب فاما ان يموت أو يلتقطه بعض السيارة الخ. (روح ج ۱۲ ص ۱۹۷، قرطبی ج ۵ ص ۴۲۵، مظہری ج ۵ ص ۱۴۶)

کیا یہ وحی، وحیِ رسالت ونبوت تھی؟:- صاحب مظہری کا خیال تو یہ ہے کہ یہ وحی (جو کنویں میں ڈالے جانے سے پہلے یا بعد میں آئی) وحی رسالت ونبوت نہ تھی، (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو ابھی نبوت نہیں عطا کی گئی تھی) بلکہ اس کی حیثیت ویسی تھی جیسی وحی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر "وأوحينا إلىٰ أم موسىٰ أن أرضعيه الآية" کے ذریعہ کی گئی تھی۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ وغیرہ نے مفسر قرآن حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ وحی، وحیِ رسالت ونبوت تھی جیسا کہ حضرت عیسیٰ ویحییٰ علیہما السلام پر بچپنے میں وحی نازل کی گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے:

"ان هذا الوحی لیس للاستنباء والارسال و التبلیغ بل هو کما اوحی الیٰ ام موسی ان ارضعیه الایة وما هو للتبلیغ فهو بعد ذالک حیث قال الله تعالیٰ ولما بلغ اشُدَّهٗ اتیناهُ حُکما و عِلْما، واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابوالشیخ عن مجاهد فی قوله تعالیٰ و اوحینا الیه قال اُوْحِیَ الیٰ یوسف یعنی وحی الاستنباء وهو فی الجب". (مظہری ج۵ص۱۴۷، م قرطبی ج۵ص۲۲۵)

کنویں میں رہنے کی مدت:- حضرت یوسف علیہ السلام تین دن تک اسی کنویں میں رہے، اس زمانہ میں بڑا بھائی یہوذا کھانا اور پانی پہونچا دیا کرتا تھا۔

قال الکواشی "لبث فی البئر ثلاثة أیام" (روح البیان ص۲۲۴) "وکان یهوذا یاتیه بالطعام". (کبیر ج۱۸ص۸۰، مدارک ج۲ص۲۱۴)

بعض روایات میں منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پردادا، مجدد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نارِ نمرود میں ڈالے گئے تو ان کے جسم سے کپڑے اتار لئے گئے تھے، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جنت سے ایک ریشمی کرتا لیکر آئے اور ان کو پہنا دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ کرتا اپنے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو دیدیا تھا، اور پھر وہ وراثۃً حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے ایک تلکی میں رکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کی گردن میں ڈال دیا تھا، بطور دلیل باپ کے سامنے

پیش کرنے کیلئے کنویں میں ڈالتے وقت بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا اتار لیا تھا، چنانچہ تسلی کے واسطے حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تو کرتا نلکی سے نکال کر حضرت یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا۔

"وفی القصص ان ابراهیم حین القی فی النار جرد عن ثیابه، فاتاه جبرئیل بقمیص من حریر الجنة فالبسه ایاه، فدفعه ابراهیم الیٰ اسحاق و اسحاق الی یعقوب فجعله فی ثمیمة علقها بیوسف فاخرجه جبرئیل والبسه ایاهُ". (مظہری ج۵ص۱۴۸، مدارک ج۲ص۲۱۴)

فائدہ:- سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا جنت سے ریشمی کرتا لانے کا واقعہ اگر درست ہے تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ ان کی شریعت میں ریشمی کپڑے کا استعمال مردوں کے لئے بھی جائز تھا، مگر شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مردوں کے لئے ریشمی کپڑے کا استعمال درست نہیں ہے۔

وَجَاءُوْ اَبَاهُمْ عِشَاءً يَّبْكُوْنَ

اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے۔

معارف وحقائق

"یبکون" حال ہے جاء وا کے فاعل سے۔

"عشاءً" لفظ عشاء غروب آفتاب سے لے کر نصف لیل تک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ روزانہ جنگل سے شام کے وقت گھر آنے کا معمول رہا ہو، اور آج زیادہ تاخیر سے آئے ہوں تا کہ رات کی تاریکی میں ان کے کالے کرتوت کا سیاپا کچھ تو چھپ جائے، اور سہولت وآسانی کے ساتھ بہانہ بازی کرسکیں، بعض روایات میں ہے کہ وہ بتکلف روتے پیٹتے گھر کے قریب پہونچے، آہ وبکا کی آواز سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام باہر آئے اور پوچھا کہ بیٹو! کیا ہوا؟ کیا تمہاری بکریوں کو کوئی نقصان پہونچ گیا اور یوسف علیہ السلام کہاں ہے؟ اس پر انھوں نے بہانہ بازی شروع کی جس کا تذکرہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔

وانما جاء واعشاء – إما لانهم لم يصلو من مكانهم الا فى ذالك الوقت، وإما ليكونوا أقدر على الاعتذار لمكان الظلمة التى يرتفع فيها الحياء، ....."يبكون" اى متباكين مظهرين البكاء بتكلف لانه لم يكن عن حزن لكنه يشبهه. (روح ج۱۲ص۲۹۱)

کیا ہر آنسو حقیقت ہوتا ہے؟:- امام اعمش فرماتے ہیں: کہ ہم برادران

یوسف کی آہ و بکا اور ان کے جھوٹے آنسوؤں کے بعد کسی کو اس کی چشم اشکبار سے سچا قرار نہیں دے سکتے، ''لا یصدق باکٍ بعد إخوة یوسف'' برادران یوسف کے جھوٹے آنسوؤں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر رونے والا حق پر نہیں ہوتا (مدارک ج ۲ ص ۲۱۴، روح ج ۶ ص ۲۹۱) اور ہر آنسو حقیقت نہیں ہوتا بلکہ بہت سی آنکھیں اس لئے اشکبار ہوتی ہیں کہ ان کا مکر و فریب چھپا رہے، مگر جھوٹی گریہ وزاری اور مصنوعی آنسو بہر حال حقیقت نہیں بن سکتے، حقیقت ایک دن واضح ہو کر سامنے آ ہی جاتی ہے، جیسا کہ برادران یوسف علیہ السلام کے آنسوؤں کی حقیقت ایک دن کھل کر سامنے آ گئی۔

قَالُوْا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ.

کہنے لگے اے باپ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا یوسف کو اپنے اسباب کے پاس پھر اس کو کھا گیا بھیڑیا، اور تو باور نہ کرے گا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم سچے ہوں۔

ترکیب ولغات:- ''قالوا'' جملہ مستانفہ، یا أبانا..... جملہ معترضہ، إنا ذهبنا مقولہ ہے اور یا أبانا ندا کا جواب بھی ہوسکتا ہے، نستبق ..... ذهبنا کے فاعل سے حال ہے أی ذهبنا متسابقین، ترکنا معطوف ہے ذهبنا پر اور أکله الذئب کا عطف جملہ إنا ذهبنا پر ہے، وما أنت بمؤمن لنا مستانفہ ہے، کنا صادقین جملہ معترضہ یا حالیہ ہے اور جواب لو محذوف ہے، تقدیر عبارت ''فما أنت بمؤمن لما لإنک محب لیوسف'' ہے، إنا ذهبنا نستبق استباق کے معنیٰ میں ہے، دوڑنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا، یعنی ہم دوڑنے میں اور تیر چلانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کررہے تھے، ''أی متسابقین فی العدو علی الأقدام'' (علیٰ ماروی عن السدی) ''أو فی الرمی بالسهام'' کماقال الزجاج. (روح ج۶ ص۲۹۱)

معارف و حقائق

دوڑ میں مقابلہ کرنا بہترین خصلت ہے:- ابن عربی کہتے ہیں کہ دوڑ میں مقابلہ کرنا بہترین خصلت ہے اور دشمنوں سے مقابلہ میں مددگار ہے، رسول اللہ ﷺ سے بنفس نفیس پاؤں اور گھوڑوں کے ذریعہ دوڑ کا مقابلہ کرنا ثابت ہے، چنانچہ

آپ ﷺ نے اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ میں مقابلہ کیا تو پہلی مرتبہ آپ آگے بڑھ گئے، اور جب آپ ﷺ کی عمر مبارک زیادہ ہوگئی تو دوبارہ مقابلہ میں حضرت عائشہ آگے نکل گئیں، صحابہ میں حضرت سلمہ بن اکوع ؓ نے ایک شخص سے دوڑ میں مقابلہ کیا اور آگے نکل گئے۔

قال ابن العربی : المسابقة شرعة فی الشریعة ، وخصلة بدیعة وعون علی الحرب وقد فعلها ﷺ بنفسه وبخیله ، وسابق عائشة رضی الله عنها علیٰ قدمیه فسبقها ، فلما کبر رسول الله ﷺ سابقها فسبقته ، فقال لها هذه بتلک ، قال القرطبی : وسابق سلمة بن الاکوع رجلاً لما رجعوا من ذی قرد الی المدینة فسبقه سلمة. (أخرجہ مسلم ۱۸۰۷)

اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے مذکور ہے، وہ بیان فرماتی ہیں کہ میں ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھی، تو پیدل دوڑ میں ہمارا مقابلہ ہوا تو میں جیت گئی، اس کے بعد جب میرا جسم بھاری ہوگیا، پھر ہمارا دوڑ میں مقابلہ ہوا تو آپ ﷺ جیت گئے، اور آگے نکل گئے، اس وقت آپ نے فرمایا: ''یہ تمہاری اس جیت کا جواب ہوگیا''۔

عن عائشة أنها کانت مع رسول الله ﷺ فی سفر قالت فسابقته فسبقته علیٰ رجلیّ فلما حملت اللحم ، سابقته فسبقنی ، قال هذه بتلک السبقة. (ابوداؤد ۲۵۷۸)

اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے گھوڑ دوڑ میں مقابلہ کیا تو آپ ﷺ آگے بڑھ گئے، حضرت ابوبکر ؓ کے گھوڑے کا سر آپ ﷺ کے گھوڑے کی سرین تک پہونچ سکا، اور حضرت عمر ؓ حضرت ابوبکر ؓ سے پیچھے رہ گئے۔

روی عن النبی ﷺ أنه سابق أبابکر وعمر رضی الله عنهما فسبق رسول الله ﷺ وصلیٰ ابوبکر وثلّث عمر ومعنی صلی ابوبکر یعنی أن رأس فرسه کان صلاة فرس رسول الله ﷺ والصّلوان موضع العجز. (مسند احمد ۸۹۵/۱۱۰۶/۱۲۵۴)

قالوا یا ابانا الآیة کا مفہوم:- آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی آہ وبکا کو سن کر باہر نکلے، پوچھا کیا بات ہے، تمہاری بکریوں پر کسی نے حملہ کر دیا ہے، اور یوسف کہاں ہے؟ بیٹے کہنے لگے ابا جان! معاملہ بڑا سنگین ہے، ہوا یہ کہ ہم نے ایک محفوظ جگہ پر کپڑوں وغیرہ کی نگرانی کے لئے یوسف علیہ السلام کو بیٹھا دیا، اور ہم دوڑ کے مقابلے میں ذرا آگے نکل گئے، ہمارے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اتنی ذرا سی دیر میں بھیڑیا یوسف کو پھاڑ ڈالے گا، مگر واقعہ یہی ہے کہ ہم ذرا دور نکل گئے اور جب واپس آئے تو بھیڑیا ان کو کھا چکا تھا، اور آپ کو چونکہ یوسف کے معاملہ میں ہم سے پہلے ہی سے بدگمانی ہے، اور پھر آپ یوسف کی محبت میں کچھ اس طرح مبتلا ہیں کہ چاہے ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں آپ بہرحال ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے، اور اس لئے بھی آپ ہماری بات کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی واضح دلیل نہیں ہے، جو ہماری صداقت پر دلالت کرتی ہو، (تفسیر کبیر ج ۱۸ ص ۸۱) مگر حقیقت اور واقعہ وہی ہے جو ہم نے آپ سے بیان کیا۔

وَجَاءُوْا عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ

اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ، بولا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔

ترکیب ولغات:- ''جاء وا.....'' پورا جملہ معطوف ہے، ما أنت بمؤمن پر، قال مستانفہ برائے بیان، سولت لکم أنفسکم علت ہے کلام مقدر کی جو مقولہ ہے قول کا، تقدیر عبارت ''لم صدقوا فی کلامکم بل سولت لکم أنفسکم أمراً '' ہے، صبرٌ جمیل معطوف ہے، سولت لکم أنفسکم پر، صبرٌ جمیل مبتداء بھی ہوسکتا ہے اور خبر بھی، تقدیر عبارت فأمری صبرٌ جمیل ''صبرٌ جمیل إختارہ'' ''فصبری صبرٌ جمیل '' ہوگی، تصفون صلہ ہے اسم موصول ما کا اور عائد محذوف ہے، أی تصفونہ، علیٰ ماتصفون جار مجرور متعلق ہے مستعان کے۔

قمیص بروزن فعیل اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو جسم پر پہنا جائے، اس کا استعمال مذکر و مؤنث دونوں کے لئے یکساں ہوتا ہے، جمع أقمِصَةٌ اور قُمُصٌ آتی ہے، المستعان مفعول ہے إستعان سے۔

معارف وحقائق

مجاہد اور سدی وغیرہ سے منقول ہے کہ برادران یوسف نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا اور یوسف کی قمیص کو اس کے خون سے رنگ دیا۔

"أنهم عمدوا إلىٰ سخلةٍ فيما ذكره مجاهد والسدى وغير واحدٍ، فذبحوها ولطخوا ثوب يوسف بدمها". (ابن کثیر ج۲ ص۴۸۵)

بدمٍ كذبٍ "أى مكذوب فيه" یعنی بکری کے خون کو یوسف کا خون قرار دیا۔

"بل سولت لكم"، "تسويل" اپنی جانب سے کسی بات کو گڑھ لینا جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

صبر جمیل کی تعریف:- فصبرٌ جميل" صبر جمیل ہی بہتر ہے، میں اسی کو اختیار کرتا ہوں، رسول اللہ ﷺ سے صبر جمیل کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ صبر جمیل وہ صبر ہے جس میں کوئی شکوہ شکایت نہ ہو، "هو الذى لاشكوىٰ معه". (م قرطبی ج۲ ص۴۲۷)

"علىٰ ماتصفون" یعنی تم جو یہ بیان کر رہے ہو کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا اور وہ ہلاک ہو گئے، تو میں بجائے اس کے کہ اس پر واویلا مچاؤں اور جزع فزع کروں، اور تم پر طنز و تعریض کروں، صبر جمیل کو اختیار کرتا ہوں، اسی کی اللہ سے توفیق مانگتا ہوں اور وہی میرے لئے بہتر ہے۔

بیٹوں کی صداقت کا امتحان:- برادرانِ یوسف نے باپ کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا، اور بطور دلیل حضرت یوسف علیہ السلام کا خون آلود کرتا پیش کیا، تو کرتا خون سے رنگین ضرور تھا، مگر صحیح سالم تھا، کہیں

سے پھٹا نہ تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب کرتے کو صحیح سالم دیکھا تو فرمایا کہ اے بیٹو! یوسف کو پھاڑنے والا بھیڑیا تو انتہائی حلیم و بردبار معلوم ہوتا ہے، کہ خون آلود کرتے کو بڑی احتیاط سے اتار کر رکھ گیا۔

''قال تالله ما رأيت كاليوم ذئباً أحلم من هذا أكل إبني ولم يمزق عليه قميصه. (مدارک ج۲ص۲۱۵، روح المعانی ج۶ص۳۹۲)

گویا برادارنِ یوسف نے جس چیز کو اپنی تصدیق و براءت کے لئے پیش کیا تھا اسی نے ان کے کذب کو ظاہر کر دیا، انھوں نے اپنی صداقت کے لئے کرتے کو بکری کے خون سے رنگین ضرور کیا، مگر انھیں یہ ہوش نہ آیا کہ اس کو جگہ جگہ سے پھاڑ بھی دیں، بہر حال دلیل سے ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو چکا تھا، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے قول کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً ط فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ عَلىٰ مَاتَصِفُوْنَ۔

عجوبۂ روزگار پیراہن:- ماوردیؒ کہتے ہیں کہ پیراہن یوسف بھی عجائبِ روزگار میں سے ہے، اس کے ساتھ تین عجیب و غریب واقعے متعلق ہیں، پہلا واقعہ یہ ہے کہ بیٹوں نے اُسے خون آلود کر کے باپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، مگر کرتے کی شہادت سے ہی ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا، دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دامن فریب میں پھنسانا چاہا، مگر معاملہ جب شوہر کے سامنے آ گیا تو اُلٹے حضرت یوسف علیہ السلام ہی پر الزام لگانے لگی، اس وقت بھی بطور شہادت حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا ہی پیش ہوا اور ان کی برأت ظاہر ہوئی، تیسرا واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کے واپس آنے کا، کہ پیراہن یوسف جب ان کے چہرے پر ڈالا گیا تو ان کی بینائی واپس آ گئی۔

وقیل کان فی قمیص یوسف ثلاث آیاتٍ ، کان دلیلاً لیعقوب علیٰ کذبھم ، وألقاہ علیٰ وجھہٖ فارتدبصیراً ، ودلیلاً علیٰ براءۃ یوسف حین قد من دبرہ . (مدارک ج۲ص۲۱۵،روح المعانی ج۶ص۳۹۲)

فائدہ:- سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے سے جو عجائبات ظاہر ہوئے وہ غالباً ان کے جسم کی خصوصیت کی بنا پر پیدا ہوئے تھے، جس کی دلیل یہ ہے کہ تینوں مواقع پر الگ الگ کرتوں سے عجائبات کا ظہور ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

اپنی رائے پر اصرار درست نہیں:- "قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً ط فَصَبْرٌ جَمِيلٌ" یہ جملہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس وقت فرمایا جب کہ برادران یوسف علیہ السلام نے واقعۃً اپنی طرف سے گھڑ کر یہ بات کہی تھی کہ " إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ" اور اس وقت بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہی جملہ استعمال فرمایا جبکہ بیٹوں نے مصر سے واپس آکر اطلاع دی کہ "إن ابنک سرق وما شھدنا إلا بما علمنا وما کنا للغیب حافظین" حالانکہ یہ بات بیٹوں نے گھڑ کر نہیں کہی تھی، بلکہ بظاہر واقعہ یہی تھا، پہلی صورت میں تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی رائے درست نکلی، اور دوسری صورت میں درست نہیں نکلی، اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے بھی ہوسکتی ہے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی ذاتی رائے بھی ابتداءً غلط ہوسکتی ہے، البتہ انبیاء علیہم السلام اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ان کی غلطیوں پر باقی نہیں رکھا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو مطلع کردیا جاتا ہے، اس لئے ان کی غلطی باقی نہیں رہتی، اس کے برخلاف دوسرے لوگ بھی اپنی غلطی پر مطلع ہو ہی جائیں یہ کوئی ضروری نہیں ہے، لہٰذا کسی کیلئے اپنی رائے پر اس طرح اصرار کرنا درست نہیں ہے کہ وہ

دوسروں کی بات سننے کیلئے تیار ہی نہ ہو۔ (م قرطبی ج ۲ ص ۴۲۷)

حضرت یوسف علیہ السلام کو تلاش نہ کرنے کی وجہ:- حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ شدت محبت و تعلق، ذاتی وجاہت کی وجہ سے تلاش پر قدرت، اور بیٹوں کا کذب ظاہر ہوجانے کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس وقت تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، جبکہ ان کو اس کا یقین تھا کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں، آخر کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بذریعہ وحی حضرت یعقوب علیہ السلام کو مطلع کردیا گیا تھا کہ جس امتحان میں ابتلاء کئے گئے ہیں، وہ پورا ہوکر رہے گا، اور ایک مدت معین کے بعد ہی اس سے نجات ملے گی، فی الحال ڈھونڈھنے یا انتقامی تدابیر اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، یوسف ابھی ملیں گے نہیں، ہاں دوسرے بیٹے ساری دنیا میں رُسوا ہوجائیں گے، اور ممکن ہے کہ طیش میں آکر یعقوب علیہ السلام کو ایذاء پہونچانے کی کوشش کریں۔ (فوائد عثمانی ص ۳۱۴ بحوالہ تفسیر کبیر ج ۱۸ ص)

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى دَلْوَهُ قَالَ يَابُشْرٰى هٰذَا غُلَامٌ وَأَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۔

اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا، اس نے لٹکایا اپنا ڈول، کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا اور چھپالیا اس کو تجارت کا مال سمجھ کر اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

ترکیب ولغات:- ''جاءت سیارة..... ''جملہ مستانفہ، أرسلوا معطوف ہے جاءت سیارة پر، أدلیٰ معطوف ہے جملہ أرسلوا پر، قال مستانفہ برائے بیان، بہ ضمن واقعہ متعلق ہے کلام مقدر کے ساتھ ''أی فتعلق یوسف بالدلو فأخرجه الوارد فلما راٰه قال یا بشریٰ'' اور یابشریٰ جملہ معترضہ برائے تعجب، هٰذا غلام محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، وأسروہ مستانفہ، واللہ علیم مستانفہ یعملون پورا جملہ صلہ ہے ما موصول کا اور عائد محذوف ہے أی یعملونه .

السیارة مسافروں کا قافلہ '' رفقة من الناس '' .

وارد اسم فاعل ہے ورد کا قافلہ والوں کے لئے پانی لانے والا، ''الوارد من یتقدم القوم فیسقی لهم'' .

أدلیٰ کی اصل أدلَیَ ہے بروزن أفعل یا متحرک ماقبل مفتوح اسے الف سے بدل دیا أدلیٰ ہوگیا، إدلاءٌ کے معنیٰ ہیں کنویں میں ڈول ڈالنا، دلوٌ اسم جامد عموماً مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس کی جمع دِلاءٌ آتی ہے

بمعنیٰ ڈول۔

"بضاعة" وہ چیز جس کے ذریعہ تجارت کی جائے، اس کی جمع بضائع، فعائل کے وزن پر آتی ہے اور بضاعة، فعالة کے وزن پر ہے، بشریٰ، فعلیٰ کے وزن پر ہے۔

معارف وحقائق

"وجاءت سيارة" حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ مدین (۱) سے ایک قافلہ بغرض تجارت مصر جارہا تھا، راستہ بھول کر بھٹکتا ہوا اس کنویں کے قریب پہونچ گیا جس میں برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈال دیا تھا، یہ کنواں آبادی سے دور ہونے کی بنا پر تقریباً غیر آباد تھا۔

قال ابن عباس : جاءت سيارة أي قوم يسيرون من مدين إلىٰ مصر فأخطأوا الطريق فانطلقوا يهيمون علىٰ غير طريقٍ فهبطوا علىٰ أرض فيها جُبُّ يوسف وكان الجب في قفرةٍ بعيدةٍ عن العمران. (کبیر ج۱۸ ص۸۵)

صاحب روح المعانی نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے جس کنویں میں ڈالا تھا وہ ان کی معتاد اور معروف راہ پر واقع تھا "والظاهر أن الجب كان في طريق سيرهم المعتاد". (روح المعانی ج۱۲ ص۲۰۳)

---

(۱) جدید نسلی جغرافیائی تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جس مقام کو تورات میں مدین یا مدیان کہا گیا ہے، اس سے مراد وہ علاقہ ہے جو ساعیر (سراۃ) سے بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے، اس کو حضرت موسیٰ ں کے زمانے سے بنی اسرائیل مدین اور اسماعیلی شروع سے حجاز کہتے تھے، اس لئے ایک مقام کے یہ دو نام ہیں۔ (تاریخ ارض القرآن ج۲ ص۴۷، ۴۹)

بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کنویں کا پانی کھاری تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کی برکت سے شیریں ہوگیا۔

قیل و کان ماؤہ مالحاً فعذب حین ألقی فیه یوسف.

(تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۴۹)

فائدہ:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر سرفراز کئے جانے والے بندوں سے اس قسم کے عجائبات کا ظاہر ہونا کہ ان کی برکت سے کھاری پانی شیریں ہو جائے بالکل قرین قیاس اور عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے، اس لئے اس کا انکار ہرگز نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے صادر ہونے والے عجائبات معجزات ہوتے ہیں، اور اولیاء اللہ سے صادر ہونے والے عجائبات کرامات کہے جاتے ہیں اور معجزات و کرامات کا انکار گمراہی ہے، ان کا منکر عموماً راہ راست سے دور ہو جاتا ہے۔

"فأرسلوا واردهم" قافلہ جب کنویں کے پاس اترا تو اپنے قافلے میں سے ایک شخص جس کا نام مالک بن وعر الخزاعی بتایا جاتا ہے اس کو پانی لینے کے لئے کنویں پر بھیجا" **یقال له مالک بن وعر** "(مظہری) روح المعانی میں واو کے بجائے ذال مذکور ہے۔ (روح المعانی ج ۱۲ ص ۲۰۳)

"**فأدلیٰ دلوه**" مالک بن وعر نے ڈول کنویں میں ڈالا، حضرت یوسف علیہ السلام نے سمجھا کہ بھائیوں کو رحم آگیا ہے اور مجھ کو نکالنے کے لئے انھوں نے یہ ڈول ڈالا ہے، چنانچہ انھوں نے ڈول کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا، مالک نے جب اسے باہر نکالا تو ایک انتہائی حسین و خوبصورت لڑکا نظر آیا تو وہ فرطِ مسرت سے چلا اُٹھا ارے یہ تو بڑا خوبصورت لڑکا نکل آیا۔

"**قال یا بشریٰ هذا غلام**" حضرت یوسف علیہ السلام انتہائی حسین اور

صاحب جمال تھے، حدیث معراج میں مذکور ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پوری دنیا کا آدھا حسن عطا کیا گیا تھا۔

قال ﷺ فی حدیث الإسراء من صحیح مسلم " فإذا أنا بیوسف قد أعطی شطر الحسن " . (صحیح مسلم ۱۶۲)

غلام کی تنوین اگر تفخیم کے لئے مان لی جائے تو اس سے بھی حسین وخوبصورت ہونے کے معنیٰ مستفاد ہوتے ہیں۔

"وأسروہ بضاعة" یعنی وارد اور اس کے رفقاء نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہترین مال تجارت سمجھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے پوشیدہ رکھا تاکہ وہ بھی حصہ داری کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔

أی اخفاہ الوارد وأصحابه من سائر الرفقة مخافة أن یطلبوا منهم فیه المشارکة. (مظہری ج۵ص۱۴۹)

" بضاعة" حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے أی أخفوه حال کونه متاعاً للتجارة. (روح، ج۶ص۳۹۵)

"واللہ علیم بما یعملون" اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ مخلوق کی نظروں سے چھپانے میں خواہ وہ کامیاب ہی کیوں نہ ہوجائیں، مگر خدائے علیم وخبیر سے کب تک چھپاسکتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے أسروہ میں ضمیر کا مرجع حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو بتایا ہے، یعنی برادران یوسف نے ان کے معاملہ کو قافلہ والوں سے چھپایا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب برادرانِ یوسف کو معلوم ہوا کہ مدیانی قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر اپنا مال تجارت بنالیا ہے، تو وہ ان کے پاس پہونچے اور کہا کہ یہ ہمارا بھاگا

ہوا غلام ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان سے واپس لے لیا، اور پھر انھیں کے ہاتھوں فروخت کر دیا، خوف کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ان سے حقیقت واقعہ کا اظہار نہیں کیا، اس لئے کہ اظہارِ واقعہ کی صورت میں بھائیوں کی طرف سے بزبان عبرانی قتل کی دھمکی مل چکی تھی۔

عن ابن عباسٍ أنه قال : وأسروه يعني "إخوة يوسف أسروا شانه" والمعنى أنهم أخفوا كونه أخاً لهم بل قالوا إنه عبدٌ لنا آبق وتابعهم يوسفُ لأنهم توعدوه بالقتل بلسان العبرانية. (کبیر ج۱۸ ص۸۵/۸۶)

جمہور مفسرین نے پہلے قول کو راجح قرار دیا ہے یعنی أسروه میں ضمیر راجع ہے قافلہ والوں کی طرف نہ کہ برادران یوسف کی جانب۔

وجاء سيارة الآية کا حاصل:- آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام تین دن تک کنویں میں رہے، ان ایام میں یہوذا جو ابتداء ہی سے یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں نرم تھا، کھانا اور پانی پہونچاتا رہا، اتفاقاً مدیانی حجازی اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جو بغرضِ تجارت مدین سے مصر جارہا تھا، اس کنویں کے قریب سے گزرا، تو جو لوگ پانی وغیرہ کے انتظام پر متعین تھے، وہ پانی لینے کے لئے کنویں پر پہونچے، مالک بن وعریا دعبر نامی شخص نے ڈول اندر ڈالا، حضرت یوسف علیہ السلام نے سمجھا کہ بھائیوں نے مجھے نکالنے کے لئے ڈول ڈالا ہے، چنانچہ وہ ڈول میں بیٹھ گئے، اور اس رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لیا، مالک نے ڈول جب باہر نکالا تو پانی کے بجائے ایک انتہائی حسین وجمیل لڑکا نظر آیا، اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر مالک بے ساختہ پکار اٹھا کہ یہ تو بڑا قیمتی لڑکا نکل آیا، اور پھر مالک اور اس کے ساتھیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دوسرے رفقاء سے چھپانا چاہا تاکہ وہ بھی حصہ دار نہ بن جائیں، اور

بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یوسف کے معاملہ کو قافلہ والوں سے چھپایا اور ان کو اپنا بھاگا ہوا غلام بتا کر قافلہ والوں سے واپس لے کر مال تجارت بنالیا، بعدۂ اسی قافلہ والوں کے ہاتھوں انھیں فروخت کر دیا۔

"واللہ علیم بما یعملون" کی تفسیر میں علامہ عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بھائی بے وطن کرنا چاہتے تھے، قافلہ والے بیچ کر دام وصول کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، اور خدائے تعالیٰ خزائن مصر کا مالک بنانا چاہتا تھا، وہ اگر چاہتا تو ان کارروائیوں کو ایک سکنڈ میں روک دیتا، لیکن اس کی مصلحت تاخیر میں تھی، اس لئے سب چیزوں کو جانتے اور دیکھتے ہوئے انھیں ڈھیل دی گئی۔ (فوائد عثمانی ص ۳۱۵)

"واللہ علیم بما یعملون" کی تفسیر میں ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:

"اس میں رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بتانی مقصود ہے کہ آپ کی قوم جو کچھ آپ ﷺ کے ساتھ کر رہی ہے یا آئندہ کرے گی وہ سب ہمارے علم وقدرت میں ہے، اگر ہم چاہیں تو آنِ واحد میں پورے معاملے کو زیروزبر کر دیں، لیکن حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں تھوڑی ڈھیل اور قوت آزمائی کی مہلت دی جائے، اور انجام کار آپ ﷺ کو ان پر غلبہ عطا کر کے حق کا بول بالا کر دیا جائے، جیسا کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام کے مقابلہ میں یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔

وفی هذا تعریض لرسوله ﷺ وإعلام له بأنی عالم بأذی قومک لک، وأنا قادر علی الانکار علیهم ولکنی ساملی لهم ثم أجعل لک العاقبة والحکم علیهم، کما جعلت لیوسف الحکم والعاقبة علیٰ إخوته. (ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۰)

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ۔

اور بیچ آئے اس کو بھائی ناقص قیمت کو، گنتی کی چونیاں اور ہو رہے تھے اس سے بیزار۔

ترکیب ولغات:- "شروہ" جملہ معطوف ہے جملہ أسروہ پر، اور کانوا فیہ من الزاھدین معطوف ہے جملہ شروہ پر، وشروہ، لفظ شراء خرید وفروخت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں کا احتمال موجود ہے، ضمیر مرفوع اگر بھائیوں کی طرف راجع ہو تو فروخت کرنے کے معنیٰ ہوں گے، اور اگر قافلہ والوں کی طرف راجع ہو تو خریدنے کے معنیٰ ہوں گے۔

بثمنٍ بخسٍ ثمن بمعنیٰ قیمت جمع أثمان، بخس گھٹا دینا، مصدر ہے، بمعنیٰ اسم مفعول، اور امام راغب نے باخس بمعنیٰ ناقص کو بھی درست قرار دیا ہے، وجوز الراغب أن یکون بمعنی باخس أی ناقص عن القیمة نقصاناً ظاهراً. (روح المعانی ج۶ ص۳۹۵)

مقاتل نے بخس کا ترجمہ کھوٹا اور قتادہ نے ظلم کیا ہے، یعنی انھوں نے یوسف کو فروخت کر کے ظلم کیا، "لأنهم ظلموه فی بیعه" حضرت عبداللہ بن عباس اور ضحاک بخس کا معنیٰ حرام بتاتے ہیں، اور بخس کو حرام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حرام مال برکت کو گھٹا دیتا ہے۔ (روح المعانی ج۶ ص۳۹۶)

دراھم، درھم کی جمع ہے، چاندی کے سکہ کو درہم کہا جاتا ہے، دراھم ثمن سے بدل ہے۔

معارف و حقائق

"معدودة" اسم مفعول بمعنیٰ قلیل، تھوڑا، گنتی کے چند، بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کل ۲۲ رو رہم میں فروخت کر دیا، بعض روایات میں بیس، بعض میں اٹھارہ، اور بعض میں چالیس کا بھی تذکرہ ہے، لفظ معدودۃ لا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ دراہم کی تعداد چالیس سے زیادہ نہیں تھی، کیونکہ اہل عرب تھوڑی رقم کا معاملہ گنتی سے اور زیادہ کا معاملہ وزن سے کرنے کے عادی تھے، اور زیادہ کی تعیین وہ ایک اُوقیہ یعنی چالیس درہم سے کرتے تھے۔

أنهم كانوا لايزنون إلا ما بلغ الأوقية وهي الأربعون ويعدون مادونها. (کشاف ج ۲ ص ۲۴۷)

"وكانوا فيه من الزاهدين" اور وہ ان سے بیزار تھے، یعنی تجارت ان کا مقصد نہیں تھا، بلکہ باپ کی نظروں سے دور کرنا تھا، زاھدین، زاھد اسم فاعل کی جمع ہے جو مشتق ہے زھد سے بمعنی بے رغبتی، بے توجہی، دنیوی مال ومتاع سے بے رغبتی کو اصطلاح میں زھد کہا جاتا ہے۔

وشروہ بثمن بخس کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا بھگوڑا غلام بتا کر گنتی کے چند درہموں کے عوض فروخت کر ڈالا، اس لئے کہ وہ یوسف علیہ السلام سے بیزار ہو رہے تھے، یعنی ان کا مقصد فروخت کر کے مال حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ یوسف علیہ السلام کو باپ کی نظروں سے دور کرنا تھا، تاکہ وہ باپ کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر سکیں اور منظورِ نظر بن جائیں، یہاں گنجائش اگرچہ اس بات کی بھی ہے کہ کانوا کی ضمیر کو قافلہ والوں کی طرف راجع کر کے یہ کہا جائے کہ قافلہ والے حضرت یوسف علیہ السلام سے بیزار تھے، کیونکہ ان کو بتایا

گیا تھا کہ یہ بھگوڑا غلام ہے اور اس بات کا بھی خوف تھا کہ کہیں کوئی ان پر ایسا دعویٰ نہ پیش کردے کہ معاملہ کوئی خطرناک صورت اختیار کر لے، اور کچھ ملنے کے بجائے اصل سرمایہ بھی ہاتھ سے نکل جائے، اس لئے انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تھوڑے داموں میں فروخت کردیا، مگر اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قافلہ والے تو ان کو پاکر انتہائی مسرور ہوئے تھے اور بہترین مال تجارت قرار دے کر انھیں چھپالیا تھا اور اب تو وہ باقاعدہ ان کے مالکوں سے خرید بھی چکے تھے اس لئے ان کا بے رغبت ہونا اور تھوڑی سی پونجی میں فروخت کردینا خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بڑی خطیر رقم میں فروخت کیا تھا، لہٰذا راجح یہی ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام، یوسف کے مقام و مرتبہ سے ناواقف اور ان سے بیزار تھے، اور باپ کی نظروں سے انھیں دور کرنا چاہتے تھے اس لئے تھوڑی سی پونجی کے عوض ان کو فروخت کر ڈالا۔

(دوسرے رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

✿✿✿✿✿✿✿

وَقَالَ الَّذِیْ اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهٖ أَكْرِمِیْ مَثْوَاهُ عَسٰی أَنْ یَّنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَداً وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی أَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ۔

اور کہا جس شخص نے خرید لیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو، آبرو سے رکھ اس کو شاید ہمارے کام آئے، یا ہم کر لیں اس کو بیٹا اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو اس ملک میں اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں کچھ ٹھکانے پر بٹھانا باتوں کا اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ترکیب:- ''وقال الذی اشتراہ'' جملہ مستانفہ، جملہ اشتراہ صلہ ہے الذی اسم موصول کا، اور جملہ أکرمی مثواہ محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، عسیٰ أن ینفعنا جملہ تعلیلیہ ہے اور جملہ ینفعنا صلہ ہے اسم موصول حرفی أن کا، نتخذہ پورا جملہ معطوف ہے ینفعنا پر۔ وکذلک مکنا جملہ مستانفہ اور جملہ نعلمہ صلہ ہے اسم موصول حرفی أن مقدرہ کا، واللہ غالب علیٰ أمرہ جملہ مستانفہ اور ولکن أکثر الناس معطوف ہے واللہ غالب علیٰ أمرہ پر، جملہ لایعلمون محلاً مرفوع خبر ہے لکنّ کی۔

معارف و حقائق

وَقَالَ الَّذِیْ اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ: یہ شراء اس شراء سابق کے علاوہ ہے جو گنتی کے چند درہموں پر واقع ہوا تھا، بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بازارِ

مصر میں جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا، اس کا نام "قِطْفِیْر" تھا، اور محمد بن اسحاق نے اِطْفِیْر بتایا ہے، یہ مصر کا وزیر خزانہ تھا، قرآن کریم میں اسے عزیز مصر کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، ملک مصر پر اس وقت ریان بن ولید کی حکومت تھی جو قوم عمالقہ سے تھا۔

عن ابن عباس: وكان إسمه قِطْفِيْر، وقال محمدبن إسحاق: إسمه اِطْفِيْر بن روحيب وهو العزيز وكان علىٰ خزائن مصر، وكان الملك يومئذٍ الريّان بن وليد، رجل من العماليق. (ابن کثیر ج۲ ص۴۳۱)

"لأمرته" مجاہد نے عزیز کی بیوی کا نام راعیل بنت رعا ئیل بتایا ہے، اور سدی نے زلیخا بنت تلمیخا، اور ایک قول یہ ہے کہ نام تو راعیل ہے اور زلیخا لقب ہے، یا اس کے برعکس۔ من مصر جار مجرور متعلق ہے اشتراہ کے، اور لإمرته میں جار مجرور متعلق ہے قال کے، اور أكرمي مثواه مقولہ ہے قول کا، أي إجعلي محل ثوائه وإقامته كريماً أي حسناً مرضيّاً. (روح المعانی ج۶ ص۳۹۸)

"عسىٰ أن ينفعنا" ہوسکتا ہے کہ بلوغت کے بعد ہمارے اہم کاموں میں مددگار ثابت ہو۔

"أو نتخذه ولداً" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عزیز مصر حصور تھا، اس کے یہاں بچہ پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

أي يكفينا بعض المهمات إذا بلغ قال ابن عباس كان حصوراً لايولد له. (م قرطبی ج۲ ص۴۲۹)

تین اعلیٰ درجہ کے قیافہ شناس:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ تین آدمی اعلیٰ درجہ کے قیافہ شناس اور ذہین وفطین ثابت ہوئے، ایک

عزیز مصر جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت وشرافت کو محسوس کر کے بیوی کو حوالے کرتے وقت "اکرمی مثواہ" کی ہدایت فرمائی، دوسرے حضرت شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ "یاأبت استاجرہ" اور تیسرے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنھوں نے اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد فرمایا۔

عن عبد الله بن مسعود أنه قال: أفرس الناس ثلثة : عزيز مصر حين قال لإمرته (أكرمي مثواه) والمرأة التي قالت لأبيها (ياأبت استاجره) وابوبكر الصديق حين أستخلف عمر بن الخطاب رضي الله عنه۔

(ابن کثیر ج۲ ص۴۳۲، تفسیر کبیر ج۱۸ ص۸۸)

تمکین فی الارض کا مفہوم:- وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ مَكَّنَّا ہم نے جمادیا، طاقت وقوت عطا فرمادیا، اور تمکین فی الارض کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کی سلطنت وحکومت سے سرفراز فرمایا، یعنی جس طرح بھائیوں کے شر سے حفاظت فرمائی، اندھے کنویں سے نکالا، عزیز مصر تک پہونچایا، اور اس کے دل میں آپ کی عظمت، محبت اور شفقت ڈالی، اسی طرح ہم نے آپ کو ملک مصر کا والی وحاکم بنادیا۔

أى كما أنجيناه وعطفناه عليه العزيز كذلك مكنا له (فى الارض) أى أرض مصر وجعلناه ملكاً يتصرف فيها بأمره ونهيه .

(مدارک ج۲ ص۲۱۶، م قرطبی ج۲ ص۴۲۹)

تاویل احادیث کے علم سے کیا مراد ہے؟:- وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ معطوف ہے فعل محذوف پر، تقدیر عبارت "ليحكم بالعدل ولنعلمه "

ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو نجات دینے اور ملک مصر کی سلطنت وحکومت عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ عدل وانصاف کو قائم کریں اور لوگوں کے معاملات کی تدبیر کریں۔

"أی کان القصد من إنجائه وتمکینه إلیٰ أن یقیم العدل ویدبر أمور الناس". (تفسیر مظہری ج۵ص۱۵۱)

اور اس لئے تا کہ ہم ان کو وحی الٰہی، اس کے احکام، اور انبیاء علیہم السلام کے طریقوں کی سمجھ عطا کریں، تا کہ وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔

"أی ولنعلمه معانی کتب الله تعالیٰ وأحکامها ودقائق سنن الأنبیاء علیهم السلام فیقضی بها بین أهلها". (روح المعانی ج۶ص۳۹۹)

یا مطلب یہ ہے کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصائب وآلام سے نجات دی تا کہ ان کو خوابوں کی صحیح تعبیر کا علم عطا کریں، جس کے ذریعہ وہ ان واقعات وحوادث کی صحیح تعبیر بتا سکیں، جو آئندہ پیش آنے والے تھے، اور ان کے پیش آنے سے پہلے اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر اور حل تلاش کر لیں۔

اوتعبیر المنامات المنبهة عن الحوادث الکائنة لیستعدلها، و یشتغل بتدبیرها قبل ان یحل. (مظہری ج۵ص۱۵۱)

سب کچھ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے:- وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلیٰ أَمْرِهٖ میں ھا ضمیر راجع ہے اللہ تعالیٰ کی جانب یعنی اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، جیسے چاہتا ہے کرتا ہے اس کی قدرت ومشیت میں کوئی چیز حائل اور مانع نہیں بن سکتی، اور ایک قول یہ ہے کہ ضمیر "ھا" راجع ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب، اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ برادرانِ یوسف نے ایک کام کا قصد وارادہ کیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کا

ارادہ فرمایا، تو ہوا وہی جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا۔

الضمير راجع إلى الله تعالىٰ أى يفعل مايشاء ولا يرد أمره شئٌ ولا ينازعه فيما يشاء أحد ، وقيل الضمير راجع إلى يوسف أى أراد به إخوة يوسف شيئاً ، وأراد الله غيرهٗ ، فلم يكن إلا ماأراد الله.

(تفسیر مظہری ج۵ص۱۵۱، تفسیر کبیر ج۱۸ص۸۸)

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْن: یعنی اللہ تعالیٰ کی حکمت کی باریکیوں اور اس کی مخفی مہربانیوں سے اکثر لوگ ناواقف ہیں، یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا اور کرتا ہے، اس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں، ''**أى لطائف صُنعه وخفايا لطفه ، أو لايطلعون ماالله يريد ويصنع**''. (تفسیر مظہری ج۵ص۱۵۱)

یا مطلب یہ ہے کہ لوگ اللہ کے غیب کی باتوں پر مطلع نہیں ہیں، ''**أى لايعلمون علىٰ غيبه**'' (م قرطبی ج۲ص۴۲۹) اس صورت میں اکثر کل کے معنیٰ میں ہوگا، کیونکہ غیب کی باتوں پر کسی کو بھی اطلاع حاصل نہیں ہے۔

کنعان کے کنویں سے مصر کے بازار میں:- یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ واقعات کے صرف اسی حصہ کو بیان کرتا ہے جس کا بیان کرنا ضروری ہو، اور وہ حصہ جو سیاق وسباق سے خود بخود معلوم ہو جائے اور کسی خاص عبرت ونصیحت پر مشتمل نہ ہو اسے ترک کر دیتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے، واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں کے ہاتھ کوڑی کے مول فروخت کر دیا، بعدۂ قافلہ والے ان کو لے کر ملک مصر کے بازار میں پہونچے اور نیلامی پر چڑھایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام عزیزِ مصر کے محل میں:- اتفاقاً مصر کے وزیر خزانہ کا ادھر سے گزر ہوا، تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قیمت (جو بقول صاحب

تفسیر مظہری، یوسفؑ کے وزن کے برابر سونا، اتنا ہی مشک اور اسی وزن کے برابر ریشمی کپڑے متعین ہوئی تھی) ادا کر کے خرید لیا۔ (مظہری ج ۵ ص ۱۵۱)

حسن ظاہری کے ساتھ باطنی حسن و جمال اور فضل و کمال بھی بالکل عیاں اور روشن تھا، جس کی وجہ سے عزیز کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت و عظمت پیدا ہوگئی، اسی بنا پر بیوی کے حوالہ کرتے ہوئے اس نے یہ ہدایت کی کہ دیکھو ان کے ساتھ غلاموں جیسا معاملہ اور سلوک نہ کرنا بلکہ خوب اچھی طرح نگہداشت اور دیکھ بھال کرنا، عجب نہیں کہ اس سے ہم کو فائدہ پہونچے اور ہم لاولد تو ہیں ہی، اسے اپنا بیٹا بنالیں گے۔

اور جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کی ایذاء رسانی اور کنویں کی مصیبت سے نجات دے کر عزیز مصر کے گھر پہونچا دیا، اور اس کے دل میں ان کی عظمت و محبت پیدا کر دی، اسی طرح ہم نے اس کو ملک مصر کا والی و حاکم بنا دیا، اور مذکورہ تمام کارروائیاں اس لئے وجود میں لائی گئیں تا کہ وہ عدل و انصاف کو قائم کریں، اور تا کہ ہم ان کو وحی الٰہی، اس کے احکام اور انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقوں کی سمجھ اور خوابوں کی صحیح تعبیر کا علم عطا کریں جس کے ذریعہ وہ آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کی صحیح تدبیر اور ان کا صحیح حل تلاش کر کے دین حق کی سرفرازی اور لوگوں کی راحت و آرام کا ذریعہ بنیں۔

ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہے:- اور تمام تر طاقت قوت کا مالک صرف اللہ ہی ہے، چنانچہ ہوتا وہی ہے جو وہ چاہے، اس کی مرضی کے خلاف ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مذکورہ واقعہ سے بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے کہ بھائیوں نے ان کو ذلیل و رسوا کرنا اور غلام بنانا چاہا، مگر خدا نے ان کو آسمانِ عظمت و رفعت پر پہونچا دیا، مگر اکثر لوگ پھر بھی خدا کی طاقت

وقدرت سے غافل ہیں اور اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ نہیں دیکھتے کہ انسانی تدبیروں کے مقابلہ میں کس طرح خدا کا بندوبست غالب آتا ہے۔

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی أَمْرِہٖ کی ایک جھلک:- حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بے پناہ محبت تھی، اور یہی محبت بھائیوں کے بغض وحسد کا سبب بنی تھی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان بھائیوں کے کید ومکر سے بچانے کی پوری تدبیر فرمائی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

(۱) چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند وسورج ان کو سجدہ کررہے ہیں، تو حضرت یعقوب علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کیا، انھوں نے یہ نصیحت فرمائی کہ بیٹے! اپنا یہ خواب بھائیوں کو نہ بتانا، کہیں وہ تمہارے خلاف کید ومکر نہ کرنے لگیں، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ تدبیر کامیاب نہ ہوسکی، برادرانِ یوسف ایک روایت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام سے ہی خواب سن کر اس پر مطلع ہوگئے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو جس کید ومکر کا خطرہ تھا وہ پیش آکر رہا۔

(۲) بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنا چاہا، اور عملی طور پر غلامی کا طوق ان کے گلے میں ڈال دیا، مگر اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ حضرت یوسف علیہ السلام ملک مصر جیسے عظیم اور متمدن ملک کے حکمراں بنے، اور بھائیوں کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونا پڑا۔

(۳) برادران یوسف نے باپ کی توجہ کو اپنے لئے خالص کرنا چاہا، مگر حکم خداوندی غالب آیا کہ توجہ کے بجائے حضرت یعقوب علیہ السلام کا دل برادران یوسف سے اور زیادہ تنگ ہوگیا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں اور زیادتی پیدا ہوگئی، چنانچہ وہ فراق یوسف علیہ السلام پر روتے رہے، اور کہتے رہے (یاأسفا علیٰ یوسف) ہائے

افسوس یوسف پر تا آنکہ اسی میں ان کی بینائی بھی جاتی رہی۔

(۴) بھائیوں نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ یوسفؑ کو باپ کی نظروں سے ہٹانے اور ایک بے گناہ کو ظلم وزیادتی کا شکار بنانے کے بعد توبہ کر کے نیک وصالح بن جائیں گے، چنانچہ انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا (**وتکونوا من بعدہ قوماً صالحین**) مگر اللہ کا امر غالب آیا کہ بجائے توبہ واستغفار کرنے کے اس پر اصرار کر بیٹھے، پھر مدتِ دراز کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اپنی خطا کا اقرار کر کے سچی توبہ کی، اور (**إنا کنا خاطئین**) کہہ کر والد محترم کے سامنے بھی اپنی غلطی کا اقرار کیا اور ان سے دعاء مغفرت کی درخواست کی۔

(۵) حضرت یوسف علیہ السلام کو تو کنویں میں ڈال دیا، اور بکری کا ایک بچہ ذبح کر کے ان کی قمیص کو اس کے خون میں رنگا، اور پھر شام کے وقت روتے پیٹتے گھر پہونچے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے خون آلود کرتے کو پیش کر کے حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ دھوکہ دینا چاہا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا، مگر اس میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے، اور والد محترم نے "**بل سولت لکم أنفسکم أمراً**" کے جملہ سے ان کی تکذیب کر دی۔

(۶) **إمرأة عزیز** نے پہلے تو حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانا چاہا، مگر جب کامیاب نہ ہو سکی، اور شوہر کے سامنے پردہ فاش ہو گیا تو بات میں پہل کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو ملزم قرار دینے کی کوشش کی، مگر حکم خداوندی غالب آیا، عزیز نے اس کی بات کے ماننے سے انکار کرتے ہوئے اسے ہی ملزم قرار دیا، اور کہا (**واستغفری لذنبک إنّکِ کنتِ من الخاطئین**)۔

(۷) تعبیر خواب کے بعد جب دونوں قیدی جیل خانہ سے نکالے گئے تو ساقی جس کے بارے میں حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین تھا کہ یہ الزام سے بری قرار دیا

جائے گا، اور حسب سابق ساقی گری کی خدمت پر مامور کیا جائے گا، اس سے کہا کہ بادشاہ کے پاس میرا تذکرہ کر دینا، کہ ایک بے گناہ قید خانہ میں پڑا ہوا ہے، مگر امر خداوندی غالب آیا اور ساقی بادشاہ کے سامنے تذکرہ کرنا بھول گیا، جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں چند سال اور رہنا پڑا۔ (م قرطبی ج ۲ ص ۴۲۹)

✿✿✿✿✿✿✿

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ اٰتَيْنَاهُ حُكْماً وَّعِلْماً وَّكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ.

اور جب پہونچ گیا اپنی قوت کو، دیا ہم نے اس کو حکم اور علم، اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی کرنے والوں کو۔

ترکیب ولغات:- ''لمّا'' ظرف ہے بمعنیٰ حین متضمن ہے شرط کے معنیٰ کو، محلاً منصوب اور اتیناہ کے متعلق ہے، أشدہٗ، بلغ کا مفعول بہ ہے، اور اتیناہ جواب شرط ہے، و کذٰلک الخ جملہ مستانفہ ہے۔

بقول سیبویہ أشد، شدة کی جمع ہے، مانند أنعم اور نعمة کے، کسائی کہتے ہیں کہ اس کا واحد شدّ ہے، بقول ابوعبیدہ وہ ایسی جمع ہے جس کا کوئی واحد نہیں ہے، یا مفرد بروزن جمع ہے أفعل بفتح الہمزۃ وضم العین کے وزن پر۔

ولما بلغ أشده یعنی جب حضرت یوسف علیہ السلام کی عقل اور جسمانی نشوونما مکمل ہوچکی أی إستكمل عقله وتم خلقه. (ابن کثیر ج۲ ص۳۲۷)

معارف و حقائق

عقل اور جسمانی نشوونما کی تکمیل کس عمر میں ہوئی:- حضرت یوسف علیہ السلام کی عقل اور جسمانی نشوونما کی تکمیل کس عمر میں ہوئی، اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ سے ۳۳ رسال منقول ہے، ضحاک سے بیس سال اور حضرت حسن بصریؒ سے چالیس سال منقول ہے، عکرمہ پچیس اور سُدّی تیس سال بتاتے ہیں، جبکہ سعید بن جبیر نے عمر أشد اسّی سال قرار دیا

ہے، امام مالکؒ، ربیعہ بن زید اور امام شعبی کہتے ہیں کہ اشد سے مراد حلم یعنی بلوغت کی عمر ہے۔

اتیناہ حکماً وعلماً، حکماً سے مراد نبوت، اور بقول بعض بات کہ تہہ تک پہونچ جانا مراد ہے، اور علماً سے مراد دین کی سمجھ یا خواب کی تعبیر کا علم ہے، حکماً أی نبوةً وقیل اصابة القول وعلماً أی فقهاً فی الدین أو علماً بتاویل الرؤیا. (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۵۱)

عالم اور حکیم کے درمیان فرق:- بقول بعض، اشیاء کے جاننے والے کو عالم اور جو علم کے مقتضیٰ پر عمل پیرا ہوا سے حکیم کہا جاتا ہے۔

"قیل الفرق بین الحکیم والعالم أن العالم هو الذی یعلم الأشیاء والحکیم هو الذی یعمل بما یوجب العلم". (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۵۱)

علماً سے اگر تعبیر خواب کا علم مراد لیا جائے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ فن تعبیر خواب ایک منفرد علم کی حیثیت رکھتا ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اس فن کے ساتھ خصوصیت تامہ حاصل تھی۔

"وأفرد بالذکر لانه مماله شان ولیوسف به إختصاص تام".

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حکماً وعلماً کی تنوین تفخیم کے لئے ہے، اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوجائیں گے کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسی حکمت اور علم عطا کیا جس کی حقیقت وماہیت تک رسائی حاصل نہ کی جاسکے، اور جس کی مقدار کا اندازہ نہ کیا جاسکے۔

"أی حکماً وعلماً لا یکتنه کنههما ولا یقادر قدرهما".

(روح المعانی ج۶ ص۴۰۰)

وکذلک نجزی المحسنین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے **المحسنین** کا ترجمہ مومنین اور مہتدین سے کیا ہے، ضحاک نے مصائب پر صبر کرنیوالے کو محسن قرار دیا ہے، بیضاوی لکھتے ہیں کہ آیت کریمہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ عنفوان شباب میں اتقاء و پرہیز گاری اور حسن عمل کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ جزا عطا فرمائی۔

قال ابن عباس : أی المومنین وعنه ایضاً المهتدین ، وقال ضحاک : الصابرین علی النوائب ، قال البیضاوی: فیه تنبیهٌ علیٰ أنه تعالیٰ اتاه ذٰلک جزاءً علیٰ إحسانه فی عمله وإتقائه فی عنفوان أمره. (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۵۲)

قرآن کریم کا حکیمانہ اسلوب:- "**وکذٰلک نجزی المحسنین**" قرآن کریم کا یہ حکیمانہ اُسلوب ہے کہ جب وہ کسی جزئی واقعہ کو بیان کرکے اس پر بہترین اجر مرتب ہونے کا تذکرہ کرتا ہے، تو ساتھ ہی عام ضابطہ بھی بیان کردیتا ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اتقاء و پرہیز گاری اور مصائب پر صبر کی جزاء اور ان پر علم وحکمت کی نوازش کو بیان کرنے کے بعد "**وکذٰلک نجزی المحسنین**" کا عام ضابطہ ذکر فرما کر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ جو تقویٰ اور حسن عمل کو اختیار کرے گا، وہ انعام واکرام سے نوازا جائیگا، البتہ نبوت ورسالت اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کا تعلق کسب وعمل سے نہیں بلکہ تمامتر عطیہ خداوندی ہے، ارشادِ خداوندی ہے: **اللہ أعلم حیث یجعل رسالته**" (انعام:۱۲۵) اللہ خوب جانتا ہے کہ منصب نبوت ورسالت کا اہل کون ہے؟

ولما بلغ اشده الآیة کا مفہوم:- "**ولمابلغ أشده الآیة**" آیت

کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب بھرپور جوانی اور عقل وخرد کی تکمیل کی عمر کو پہونچ گئے، اور ان کا جسمانی نشوونما، نیز عقل وخرد کی تکمیل ہوچکی، تو ہم نے ان کو نبوت اور باتوں کی تہہ تک پہونچ کر اس کے صحیح علم، اور منشأ خداوندی کے مطابق معنی ومفہوم کے سمجھنے، دین متین کی سمجھ، اور تعبیر رؤیا کا عظیم الشان علم عطا فرمایا اور ہمارا یہ عطیہ حضرت یوسفؑ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ضابطہ یہ ہے کہ جو تقویٰ وطہارت، عدل وانصاف، عفت وپاکدامنی اور مصائب پر صبر ورضا کو عنفوان شباب سے ہی اپنا وطیرہ اور مقصد زندگی بنالیتا ہے تو ہم اسے اپنی لازوال نعمتوں سے ضرور بالضرور نوازتے ہیں۔

امام طبری کی رائے:- "وکذلک نجزی المحسنین" کی تفسیر میں امام طبری تحریر فرماتے ہیں کہ آیت کا ظاہر اگرچہ عموم کے معنی پر دلالت کررہا ہے، مگر مراد حضرت محمد ﷺ ہیں، کہ ابتلاء وآزمائش میں ثابت قدم رہنے پر جس طرح ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ہر قسم کے مصائب سے نجات عطا فرمائی اور انعامات واکرام اور تمکین فی الارض کی دولت سے نوازا، اسی طرح ہم آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی قوم مشرکین سے جو آپ ﷺ کی عداوت ودشمنی اور ایذادہی پر کمربستہ ہیں، آزادی عطا کرکے تمکین فی الارض کی دولت سے مالا مال کردیں گے۔

وقال الطبری: هٰذا وإن كان مخرجه ظاهراً علىٰ كل محسن فالمراد به محمد ﷺ، يقول الله تعالىٰ: كما فعلت هٰذا بيوسف بعد أن قاسىٰ ماقاسىٰ، ثم أعطيته، كذٰلك أنجيك من مشركي قومك يقصدونك بالعداوة وأمكن في الأرض. (م قرطبی ج۲ص۴۳۰)

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَکَ قَالَ مَعَاذَاللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَایُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ.

اور پھسلایا اس کو عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا جی تھا منے سے، اور بند کر دئے دروازے اور بولی شتابی کر، کہا خدا کی پناہ وہ (عزیز) مالک ہے میرا، اچھی طرح رکھا مجھ کو، بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ بے انصاف ہوں۔

ترکیب ولغات:- "وراودته التی" ضمیرھا مفعول بہ اور التی اسم موصول، هو فی بیتها پورا جملہ صلہ ہے اسم موصول التی کا، وغلقت الابواب، معطوف ہے وراودته الخ پر، الأبواب، مفعول بہ ہے غلقت کا، وقالت هیت لک کا عطف، وغلقت پر ہے، هیت، اسم فعل امر، معنیٰ میں أقبل یا أسرع کے ہے، اس کا فاعل ضمیر أنت ہے، قال معاذ الله جملہ مستانفہ برائے بیان، معاذ، مفعول مطلق ہے فعل محذوف أعوذ کا، معاذالله، مقولہ ہے قول کا، إنه ربی، جملہ تعلیلیہ "ها"، ضمیر إن کا اسم، اور ربی، اس کی خبر ہے، أحسن مثوای، محلاً مرفوع، خبر ثانی ہے إنّ کی، یا محلاً منصوب حال ہے لفظ رب سے، إنه لایفلح الظالمون، پورا جملہ تعلیلیہ، إنه ربی سے بدل ہے، إنه لایفلح الظالمون، ها ضمیر شان محلاً منصوب، إنّ کا اسم، اور لایفلح الظالمون، محلاً مرفوع اس کی خبر ہے۔

معارف و حقائق

"وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَفْسِهٖ" راود کا مصدر مراودۃ ہے، مجرد میں باب نصر سے اس کا ماضی راد، یرود آتا ہے، رودٌ کے معنی ہیں کسی چیز کی

طلب میں آنا جانا، آہستگی اور نرمی سے کسی چیز کو طلب کرنے کیلئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اور الرّیادۃ کے معنی طلب نکاح (یعنی وطی) کے بھی آتے ہیں۔

"اَلَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا" سے مراد عزیز مصر کی بیوی زُلیخا ہے، جس کے گھر میں حضرت علیہ السلام کی سکونت تھی، وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَاب میں غَلَّقَت کی تشدید دروازوں کی کثرت بیان کرنے کے لئے ہے، جبکہ دروازوں کی تعداد سات قرار دی جائے جیسا کہ بعض علماء سے منقول ہے، اور تشدید نفس فعل میں کثرت کو بتانے کے لئے بھی ہوسکتی ہے، یعنی انھیں بار بار بند کیا گیا۔

"و تشديد الفعل للتكثير في المفعول إن قلنا: ان الأبواب كانت سبعة كماقيل، فإن لم نقل به فهو لتكثير الفعل فكانه غلق مرة بعد مرةٍ"۔ (روح المعانی ج۶ ص۴۰۳)

و غلقت الابواب الآية کا مفہوم:- اَلْأَبْوَابُ بابٌ کی جمع ہے بمعنی دروازہ، آیت کریمہ کے اس جزو کا مفہوم یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی زلیخا جس کے مکان میں حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائش تھی، وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہوگئی، چنانچہ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے تدبیر و بہانہ، اور رفق و نرمی کے ساتھ ان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے، اور دل میں کوئی خوف اور دغدغہ باقی نہ رہ جائے اس کے لئے مکان کے تمام دروازوں کو خوب اچھی طرح بند کردیا، اور انسانی نظروں سے محفوظ رہنے کا مکمل انتظام کرلینے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو مخاطب کرکے کہا: هیت لک آجاؤ تم سے ہی کہہ رہی ہوں۔

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ هیت اسم فعل امر، این کی طرح مبنی بر فتحہ ہے، معنی ہیں، "جلدی کر" کسائی اور فراء نے اس کا ترجمہ "آ" کیا ہے، ان دونوں کا خیال ہے

کہ یہ حورانی کلمہ ہے، اور اہل حجاز کے یہاں بھی وہ مستعمل تھا، ابوزید اسے عبرانی اور ابن عباسؓ و حسن نے سریانی قرار دیا ہے، اور سدی کہتے ہیں کہ یہ قبطی لفظ ہے، مگر مجاہد وغیرہ نے اسے عربی قرار دیا ہے، بمعنی ابھارنا اور متوجہ کرنا۔

أی أسرع فهی إسم فعل امر مبنی علی الفتح کأین، وفسرها الکسائی والفرّاء بتعال، وزعما أنها کلمة حورانية وقعت إلی الحجاز فتکلموا بها وقال ابوزید: هی عبرانية، وعن ابن عباس والحسن هی سُریانية، وقال السدی: هی قبطية، وقال مجاهد وغیره: هی عربية وهی کلمة حث وإقبال. (روح المعانی ج۶ ص۲۰۶)

لفظِ هیت کی قرأت کئی طرح سے کی گئی ہے، مثلاً اس کی ایک قرأت بفتح الهاء وضم التاء، ایک بکسر الهاء وضم التاء اور ایک بفتح الهاء وفتح التاء ہے، مگر حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو هَيْتَ لَكَ بفتح الهاء والتاء پڑھایا ہے۔

قال ابن مسعودؓ أقرأنی النبی ﷺ هَيْتَ لَكَ بفتح الهاء والتاء. (تفسیر مظہری ج۵ ص۱۵۲)

لک میں لام بیان اور وضاحت کے لئے ہے جیسا کہ سقیاً لک میں، اور وہ متعلق ہے فعل محذوف کے، تقدیر عبارت کائنةً لک یا أقول لک ہوگی، یعنی میری مراد تم ہی ہو، یا میں تم سے ہی کہہ رہی ہوں۔ (روح المعانی ج۶ ص۲۰۴)

"قَالَ مَعَاذَاللهِ" معاذ مصدر میمی ہے، یہ ان مصادر میں سے ہے جنھیں اہل عرب فعل مضمر کی بنا پر نصب دیتے ہیں، جیسا کہ سبحان اللہ وغیرہ (روح البیان ج۴ ص۲۳۶) تقدیر عبارت أعوذ باللہ معاذاً ہوگی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کے قول هیت لک کے جواب میں فرمایا:

معاذ اللہ! یعنی تم جس غلط اور برے فعل کی مجھ کو دعوت دے رہی ہو، میں اس سے اللہ کی پناہ اور مدد چاہتا ہوں کہ اس فعل خبیث میں ہرگز میں تمہاری ہمنوائی نہیں کرسکتا، خداوند قدوس ہمیشہ کے لئے مجھے اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے۔

''إِنَّهُ رَبِّيْ أَحْسَنَ مَثْوَايَ'' ربی ، إنّ کی خبر اول اور مثوای خبر ثانی ہے، یا مثوای خبر اور ربی بدل ہے ضمیر ھا سے، اور ھا ضمیر راجع ہے اللہ تعالیٰ کی جانب، یعنی اللہ میرا خالق ہے، اس نے تیرے شوہر کے دل میں شفقت ومہربانی پیدا کر کے مجھے بہترین ٹھکانا عطا فرمایا، تو پھر میں اس گناہِ کبیرہ کا اِرتکاب کر کے اس کی نافرمانی کروں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس جواب کے ذریعہ زلیخا کو عذابِ خداوندی سے ڈرانا ہے کہ خدا کی نافرمانی اس کے عذاب کو لازم کردینے والی ہے۔

أی أنه تعالیٰ خالقي أحسن مثوای بعطف قلب من أمرک بإکرامی علیّ فکیف أعصیه بإرتکاب تلک الفاحشة الکبیرة وفیه تحذیرٌ لها عن عقاب الله تعالیٰ . (روح المعانی ج۶ ص۴۰۴)

مجاہد، ابن اسحاق اور سدّی نے ھا ضمیر کا مرجع عزیز مصر قطفیر کو قرار دیا ہے، مترجم علیہ الرحمہ نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوجائیں گے، کہ تمہارا شوہر عزیز مصر میرا آقا ہے، اس نے مجھے بہترین ٹھکانہ دیا ہے، اور میرا اعزاز واکرام کیا ہے، لہٰذا میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کرسکتا۔

إنه ربی یعنی زوجها ''أی هو سیدی أکرمنی فلا أخونه'' (م قرطبی ج۲ ص۴۳۰) اور انه میں ضمیر کو ضمیر شان بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی شان یہ ہے کہ اللہ میرا خالق ہے، اس نے مجھے بہترین ٹھکانا عطا فرمایا ہے، لہٰذا میں اس کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔ یا شان یہ ہے کہ تمہارا شوہر عزیز مصر میرا آقا ہے اس نے میرے ساتھ اعزاز

واکرام کا معاملہ کیا ہے، لہٰذا میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کرسکتا۔

کیا اللہ کے علاوہ کسی اور کو رب کہنا جائز ہے؟:- إنہ ربی میں ھا ضمیر کا مرجع اگر عزیز مصر کو قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے لئے لفظ رب استعمال فرمایا جو اپنے لغوی معنی (مالک، پرورش کرنے والا) کے اعتبار سے اگرچہ درست ہے، مگر شائبۂ شرک سے بہرحال خالی نہیں، تو سوال پیدا ہوا کہ آخر ایک نبی نے ایسا لفظ کیوں استعمال کیا جو موہم شرک ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ موہم شرک الفاظ کو استعمال کرنے کی ممانعت تو تمام انبیاء کی شریعتوں میں سختی کے ساتھ کی گئی ہے، مگر ان کے اسباب وذرائع پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی، چنانچہ پچھلی شریعتوں میں تصویروں کا بنانا ممنوع نہیں تھا، البتہ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ السلام چونکہ رہتی دنیا تک کے لئے ہے اس لئے اس میں نفس شرک پر پابندی کے ساتھ اس کے اسباب وذرائع پر بھی پابندی عائد کردی گئی ہے تاکہ وہ شرک سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے۔ چنانچہ اب کسی کے لئے اپنے آقا کو رب کہنے کی گنجائش نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث میں صراحۃً اپنے آقا کو رب کی ممانعت منقول ہے۔

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال : لایقولن أحدکم عبدی وأمتی ، ولا یقولن المملوک ربی وربتی ، ولیقل المالک فتای وفتاتی ، ولیقل المملوک سیّدی وسیدتی ، فإنکم المملوکون والرب اللہ تعالیٰ. (ابوداؤد ص ۶۸۰)

ظالم کو کبھی کامیابی نہیں ملتی:- إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی جو لوگ بھلائی کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں یا زنا کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں

ہوتے نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

اصطلاح شرع میں ہر فاسق و بدکار کو ظالم کہا جاتا ہے، اور ضابطہ خداوندی یہ ہے کہ ظالم کو کامیابی نہیں ملا کرتی، ظلم خواہ کسی قسم کا ہو، لہٰذا آیت کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ "گناہوں کا ارتکاب کرنے والا دنیا میں خائب و خاسر اور نامراد ہوگا اور آخرت میں بھی اسے فلاح و کامیابی حاصل نہ ہوگی۔

زنا کی حرمت عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے:- "قَالَ مَعَاذَاللّٰهِ" الآیۃ عزیز مصر کی بیوی نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دام فریب میں لینے کی کوشش کی تو "مَعَاذَاللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّيْ أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَايُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ" کے جملہ سے جواب دے کر انھوں نے اس بات کو واضح کر دیا کہ اللہ کے حقوق اس کی اجازت نہیں دیتے، اور مخلوق کے حق کی رعایت بھی واجب ہے، لہٰذا عزیز مصر کے احسان کا بدلہ میں برائی سے دوں، یہ عقلاً بھی قبیح ہے، پھر نقصان دہ چیزوں سے اپنے نفس کی حفاظت بھی ضروری ہے اور جس لذت نفس کی تم دعوت دے رہی ہو وہ انتہائی قلیل ہے، اور اس کے بدلہ میں دنیا کی بھی رُسوائی ہے، اور آخرت کا عذاب شدید بھی، اور تھوڑی سی لذت نفس کے واسطے ضررِ عظیم کو اختیار کر لینا تقاضائے عقل کے بھی خلاف ہے، لہٰذا میں تمہاری دعوتِ طرب و نشاط کو قبول کر لوں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر کبیر ج ۱۸ ص ۹۲)

ورادته التی الآیة کا حاصل:- "وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ" الآیۃ پوری آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک طرف الطاف غیبیہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عجیب و غریب طریقہ سے تربیت فرما رہے تھے، دوسری طرف عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) نے ان کے سامنے ایک نہایت ہی مزلة الاقدام موقع امتحان کا کھڑا کر دیا، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال پر زلیخا مفتون ہو گئی، اور دلکشی

اور ہوش ربائی کے سارے سامان جمع کر کے چاہا کہ یوسف علیہ السلام کے دل کو ان کے قابو سے باہر کر دے، ایک طرف عیش ونشاط کے سامان، نفسانی جذبات پورے کرنے کے لئے ہر قسم کی سہولتیں، یوسف علیہ السلام کا ہر وقت زلیخا کے گھر میں موجود رہنا، اس کا نہایت محبت اور پیار سے رکھنا، تنہائی کے وقت خود عورت کی طرف سے ایک خواہش کا بے تابانہ اظہار، کسی غیر کے آنے جانے کے سب دروازے بند، دوسری طرف جوانی کی عمر، قوت کا زمانہ، مزاج کا اعتدال، تجرد کی زندگی، یہ سب دواعی واسباب ایسے تھے جن سے ٹکرا کر بڑے سے بڑے زاہد کا تقویٰ بھی پاش پاش ہو جاتا، مگر خدا نے جس کو محسن قرار دے کر علم وحکمت کے رنگ میں رنگین کیا اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پر پہونچایا، اس پر کیا مجال تھی کہ شیطان کا قابو چل جاتا، اس نے ایک لفظ کہا معاذ اللہ (خدا کی پناہ) اور شیطانی جال کے سارے حلقے توڑ ڈالے، کیونکہ جس نے خدا کی پناہ لی، اس پر کس کا وار چل سکتا ہے؟

احسان فراموش کبھی کامیاب نہیں ہوتے:- "قَالَ مَعَاذَاللّٰهِ" الآیۃ یعنی خدا کی پناہ میں ایسی قبیح حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟ علاوہ بریں "عزیز" میرا مربی ہے، جس نے مجھے ایسی عزت وراحت سے رکھا، کیا میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کروں؟ ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنے والے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے، نیز جب ظاہری مربی کا ہم کو اس قدر پاس ہے تو سمجھ لو کہ اس پروردگار حقیقی سے ہمیں کس قدر شرمانا اور حیا کرنا چاہئے، جس نے محض اپنے فضل سے ہماری تربیت فرمائی اور اپنے بندوں کو ہماری خدمت اور راحت رسانی کے لئے کھڑا کر دیا۔ (فوائد عثمانی ص ۳۱۶)

تنبیہ إنه ربی کی یہ تفسیر ضمیر ھا کے عزیز کی طرف راجع ہونے کی بنیاد پر ہے اور پہلی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کو مرجع قرار دے کر مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِيْنَ.

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا، اور اس نے فکر کیا عورت کا، اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی، یونہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی، البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں۔

ترکیب ولغات:- جملہ ''ھمت به'' جواب ہے قسم مقدر کا اور وھم بھا معطوف ہے جواب قسم پر، اور اگر ھمت به پر وقف کیا جائے تو وھم بھا کو جملہ مستانفہ قرار دینا بھی درست ہوگا، لولا حرف شرط، اور جواب شرط یہاں محذوف ہے جس پر وھم بھا دلالت کر رہا ہے، تقدیر عبارت یہ ہے، ''لولا رؤیته برھان ربه لھم بھا لکنه امتنع ھمّه بھا لوجود رؤیة برھان ربه''۔

کذلک کاف محلاً منصوب ہے، زمخشری نے تقدیر عبارت ''مثل ذٰلک التثبیت ثبتناه'' حوفی نے ''اریناه البراھین بذٰلک'' ابن عطیہ نے ''جرت أفعالنا وأقدارنا کذٰلک ولنصرف'' اور ابوالبقاء نے ''نراعیه کذٰلک'' ذکر کی ہے۔

لنصرف متعلق ہے اس فعل کے جو کاف کو نصب دے رہا ہے، السوء مفعول بہ ہے لنصرف کا، اور الفحشاء معطوف ہے السوء پر إنه میں ھا ضمیر إنّ کا اسم اور من عبادنا فعل محذوف کے متعلق ہو کر خبر ہے إنّ کی، المخلصین

صفت ہے عبادنا کی۔

معارف و حقائق

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ، ھم کے معنی قصد وارادہ اور فکر کرنے کے آتے ہیں، یہاں مراد یہ ہے کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فعل زنا میں مبتلا کرنے کا پختہ عزم وارادہ کرلیا۔

وَهَمَّ بِهَا اور بتقاضائے بشریت حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں غیر اختیاری طور پر زلیخا کی طرف میلان پیدا ہونے لگا تھا، جیسا کہ گرمی کے رمضان میں بے اختیار ٹھنڈے پانی کی طرف طبیعت کا میلان ہوجاتا ہے اور روزہ کے باوجود اس کو پینے کا جی چاہنے لگتا ہے، حالانکہ اس کو پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اور اس قسم کا میلان شرعاً مذموم نہیں ہے، لہٰذا اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

"أی مال الیٰ مخالطتها بمقتضی الطبعیة البشریة کمیل الصائم فی الیوم الحار إلی الماء البارد ، ومثل ذٰلک لا یکاد یدخل تحت التکلیف". (روح المعانی ج۶ ص:۴۰۴)

حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے هَمّ یعنی قصد وارادہ میں فرق:-

لفظِ ھم بمعنی قصد وخیال اگرچہ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے، مگر دونوں کے ھم یعنی قصد وخیال میں بڑا فرق ہے، زلیخا کا ھم گناہ کبیرہ میں داخل ہے جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ھم محض غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو سرے سے گناہ ہے ہی نہیں، قرآن کریم کے طرزِ اُسلوب سے بھی دونوں کے ھم (قصد وخیال) کا مختلف ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ قرآن کریم نے ولقد

ھمّا تثنیہ کا مختصر صیغہ استعمال کرنے کے بجائے زلیخا کے ھم کو ولقد ھمت بہ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ھم کو ھم بھا سے بیان فرمایا، نیز زلیخا کے قصد وخیال کے ساتھ تاکید کے الفاظ لقد کا اضافہ فرمایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ھم کے ساتھ لام اور قد کی تاکید ذکر نہیں کی، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کا ھم وخیال جدا جدا تھا، یعنی زلیخا نے فعل بد کا عزم مصمم کرلیا تھا، اور اس کے سارے ذرائع بھی مہیا کرلئے تھے، جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ھم محض غیر اختیاری وسوسہ کی حد تک تھا، جو نہ عصمت کے منافی ہے اور نہ قابل مواخذہ، بلکہ اس غیر اختیاری وسوسہ کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے عنداللہ ان کا مقام ومرتبہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

''لَوْلَا أَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ، لولا، لو'' حرف شرط اور لا نافیہ سے مرکب ہے، برھان بمعنی دلیل وحجت، جمع براھین، برھان اس دلیل کو کہتے ہیں جو تمام دلائل میں زوردار ہو اور ہمیشہ اور ہر حال میں صدق کی مقتضی ہو۔

لَوْلَا أَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ لولا کا جواب محذوف ہے، ''أی لولا حفظ الله ورعايته ليوسف ، وعصمته له لخالطها وأمضى ماحدثته نفسه به ، ولكن الله عصمه بالحفظ والتائيد فلم يحصل منه شئ البتة. (صفوۃ ج۲ ص۴۲)

یعنی اگر اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کی حفاظت نہ کرتا اور ان کو محفوظ ومصئون نہ فرماتا تو بتقاضائے بشریت یہ بات بہت قریب تھی کہ وسوسۂ قلب عمل کی حد تک پہونچ جاتا، لیکن خداوند قدوس نے ان کو اپنی امداد واعانت اور تائید سے اس طرح محفوظ رکھا کہ زنا کا ارتکاب تو دور کی بات ہے وسوسہ قلب بھی مکمل طور پر ختم ہوگیا۔

برہان رب کی تحقیق:- ''برہان رب'' جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام مامون ومحفوظ رہے، اس کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال کتب تفاسیر

میں مذکور ہیں۔

(۱) حضرت جعفر صادقؒ کا قول یہ ہے کہ ''برھان رب'' وہ نبوت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قلب میں ودیعت کر دیا تھا، یہی نور نبوت عمل بد کے ارتکاب سے مانع بن گیا، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اسی قول کو اصح قرار دیا ہے۔

(۲) حضرت قتادہؒ اور اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کو انھوں نے دیکھا کہ وہ تنبیہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یوسف! تمہارا نام تو زمرۂ انبیاء (علیہم السلام) میں لکھا ہوا ہے، اس بیوقوفی کے عمل کا صدور تم سے ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، سعید، مجاہد، سعید بن جبیر، محمد بن سیرین، حسن، قتادہ، ابوصالح، ضحاک، محمد بن اسحاق وغیرھم سے منقول ہے کہ اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کو دیکھا کہ وہ اپنی انگلی منہ میں دبائے ہوئے ہیں۔

(۴) سعید بن جبیر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مجسم ہو کر سامنے آ گئے اور اپنا ہاتھ یوسف علیہ السلام کے سینہ پر مارا جس سے ان کے اندر سکون کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

(۵) محمد بن کعب قرظی سے منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سر اُٹھایا تو دیوار پر آیت کریمہ ''لاتقربوا الزنا إنه كان فاحشةً وساء سبيلاً'' کو لکھا ہوا دیکھا۔

(۶) حضرت علی (زین العابدین) سے منقول ہے کہ گھر کے اندر ایک بُت تھا، زلیخا نے اس پر، پردہ ڈال دیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

اس نے جواب دیا کہ بت مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھے اس سے مجھ کو شرم آتی ہے، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم کو اس بت سے شرم آتی ہے جو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے، تو مجھ کو اپنے رب سے بدرجۂ اولیٰ شرمانا چاہئے جو دانا و بینا اور شنوا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ منہ میں انگلی دبائے ہوئے ان کو متنبہ کر رہے ہیں۔

فقال محمد بن جعفر الصادق رحمه الله: البرهام النبوة التى اودع الله فى صدره حالت بينه و بين ما يسخط الله عزوجل، وهذا اصوب الاقوال عندى، وقال قتادة واكثر المفسرين انه راى صورة يعقوب و هو يقول له يا يوسف تعمل عمل السفهاء وانت فى الانبياء الخ . (مظہری ج ۵ ص ۱۵۴، ابن کثیر ج ۲ ص ۳۴۷)

صاحب قصص القرآن نے ایمان باللہ کا حقیقی تصور مربی مجازی کے احسان کی احسان شناسی اور وصف امانت کو "برھان رب" قرار دیا ہے۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۲۹۳)

"برہان رب" کے بارے میں تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد "ابن جریر" فرماتے ہیں کہ انسب اور اصح یہ ہے کہ کسی چیز کی تعیین کئے بغیر یہ کہا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے کوئی ایسی نشانی دیکھی جس نے ان کے غیر ارادی ھم اور وسوسہ کو ختم کر دیا، کیونکہ قرآن کریم کے اطلاق کی تعیین نہ کرنا ہی اصوب ہے۔

قال ابن جرير والصواب أن يقال أنه رأى آية من آيات الله تزجره عما كان هم به. (ابن کثیر ج ۲ ص ۳۴۷)

السوء اور الفحشاء کے معنیٰ:- كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ، لنصرف میں لام بیان علت کے واسطے ہے۔ السوء بمعنی برائی، مراد

گناہ صغیرہ ہے۔ الفحشاء زنا بے حیائی کا کام، وہ قول وعمل جس کی بے حیائی بالکل واضح ہو، اس سے مراد گناہ کبیرہ ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ سوء مقدمات معصیت میں سے ہے اور فحشاء نفس معصیت ہے۔ (روح المعانی ج ۶ ص ۴۰۸)

مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو برھان دکھانا اور ثابت قدم رکھنا اس لئے ہوا تا کہ وہ ہر قسم کے صغیرہ وکبیرہ گناہ اور ارادۂ گناہ سے مامون ومحفوظ رہیں، اور گناہ کا وسوسہ بھی ان کے قلب اطہر میں باقی نہ رہ جائے، اور ان کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اس لئے کیا گیا کہ وہ ہمارے منتخب اور چنیدہ بندوں میں سے ہیں، اور ہم نے ان کو پہلے ہی سے نبوت ورسالت کیلئے منتخب کر رکھا ہے، تو ان پر شیطان کا داؤ چل جائے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

مُخلَصُ اور مُخلِصُ کے درمیان فرق کی وضاحت:- إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِيْنَ، مخلصین بفتح اللام، مُخْلَصٌ کی جمع ہے، جن کو اللہ نے اپنی اطاعت وفرمانبرداری اور رسالت ونبوت کیلئے منتخب اور خاص کرلیا ہو ان کو مخلص کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو شیطان کی دسترس اور قابو سے محفوظ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ لوگ ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک وصاف رہتے ہیں، اور بعض قرأتوں میں مخلصین بکسر اللام بھی آیا ہے، پورے خشوع وخضوع اور اخلاص سے اللہ کی عبادت وبندگی کرنے والا مخلص کہلاتا ہے، جس کی عبادت ہر قسم کی دنیاوی لالچ وطمع سے خالی ہو، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ ہماری عبادت وبندگی کرتے ہیں، تو گناہوں سے بچے رہنے میں ہم ان کی امداد واعانت فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر:- اور زلیخا نے حضرت یوسف

علیہ السلام سے مخالطت یعنی زنا کا پختہ عزم وارادہ کرلیا، اور اس کے واسطے تمام وسائل وذرائع بھی مہیا کرلئے، اور اپنی طاقت وقوت اور حاکمیت کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تمنا وخواہش کو پورا کردیں، اور بتقاضائے بشریت حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی بغیر قصد وارادہ غیر اختیاری طور پر زلیخا کی طرف میلان ہونے لگا، (جیسا کہ گرمی کے رمضان میں بغیر قصد وارادہ غیر اختیاری طور پر ٹھنڈے پانی کی طرف روزہ دار کا میلان ہوجاتا ہے) اگر وہ ''برہان رب'' کو نہ دیکھ لیتے، مگر ''برہان رب'' کو دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر اختیاری وسوسہ وخیال بھی جاتا رہا، اور خداوند قدوس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مکمل طور پر مامون ومحفوظ رکھا، اور یہ حفاظت اس لئے فرمائی گئی تاکہ وہ ہر قسم کے صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے منزہ اور پاک رہیں، کیونکہ وہ ہمارے اُخص الخواص برگزیدہ بندوں میں سے تھے، جن کو ہم اپنی نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا کرتے ہیں، جس کے لئے ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے عصمت لازم ہے تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ان کے دامن عفت وعصمت پر کسی گناہ کا دھبہ لگ جائے، لولا کے جواب کو مقدر مان کر آیت کریمہ کی یہی تفسیر جمہور مفسرین سے منقول ہے، اور یہی آیت کے مذکورہ ترجمہ کے مناسب بھی ہے،

صاحب قصص القرآن کی تحقیق: مگر صاحب قصص القرآن نے ''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ'' کا ترجمہ ''اور البتہ اس عورت نے یوسف علیہ السلام سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ بد کرتے اگر اپنے پروردگار کے برھان کو نہ دیکھ لیتے'' کیا ہے، اور آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن عزیز نے اوّل سے آخر تک اس واقعہ میں عزیز مصر کی بیوی کی شناعت کا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت وجلالت قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، اس لئے یوسف علیہ السلام کے ''

مَعَاذَاللهِ إِنَّهُ رَبِّیْ أَحْسَنَ مَثْوَایَ إِنَّهُ لَایُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ ''فرمانے کے بعد یہی معنی برمحل ہوسکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی زبان سے برہان رب کو سن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مصر رہی تو یوسف علیہ السلام نے اس کے ارادہ کو قطعاً رد کر دیا اور ''برھان رب'' کے سامنے اس کے ''ھم'' کی مطلق پرواہ نہ کی، اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف علیہ السلام اس سے بچنے کے لئے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیز مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا۔

مگر صاحب قصص القرآن کی اس تفسیر کی بنا پر لَولا درمیان کلام میں آجاتا ہے جو نحوی قاعدے کے خلاف ہے، نحوی قاعدے کے مطابق لَولا کو شروع کلام میں آنا چاہئے، اس کا جواب دیتے ہوئے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ لَولا کا استعمال ہماری مذکورہ تفسیر کے مطابق بھی شروع کلام میں ہی ہوا ہے اور نحوی قاعدہ کے مطابق دال علی الجواب مقدم ہے، اور لَولا کا جواب جو بعد میں مذکور ہوتا ہے اس دال علی الجواب کی وجہ سے مقدر و محذوف ہے، اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ فصاحت و بلاغت کا تقاضہ ہے کہ ایک جانب مناسبت کلام کو قائم رکھا جائے یعنی دونوں کے ارادہ و عدم ارادہ کا ایک ہی جگہ ذکر ہو اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیش نظر لَولا کا جواب اس کے بعد میں آئے اور یہ دونوں باتیں جبھی ہوسکتی ہیں کہ ''ھمّ بھا'' کو دال علی الجواب بنا کر ''ھمت بہ'' کے ساتھ ذکر کیا جائے اور لَولا کا جواب ''لھمّ بھا'' مقدر تسلیم کیا جائے، کلام مجید میں اس کی نظیر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے، ''إن کادت لتبدی بہ لولا أن ربطنا علیٰ قلبھا'' اور قریب تھا کہ وہ (والدہ موسیٰ) اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے'' یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے

راز کو ظاہر نہ کرسکیں، اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کردیتیں، دیکھئے یہاں بھی لَولا سے پہلے دال علی الجواب مقدم ہے اور لَولا کا جواب "لتبدی به" مقدر ومحذوف ہے، اسی طرح اس مقام پر بھی معنی یہ ہیں کہ اگر یوسف علیہ السلام کو "برھان رب" حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کر لیتے، لیکن انھوں نے ارادۂ بد نہیں کیا کیونکہ وہ "برھان رب" دیکھ چکے تھے۔ (قصص القرآن ج۱ص۲۹۱/۲۹۲)

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْءً إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ .

اور دونوں دوڑے دروازہ کو، اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتا پیچھے سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازہ کے پاس، بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی مگر یہی کہ قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک۔

ترکیب ولغات:- جملہ ''استبقا.....'' معطوف ہے جواب قسم مقدر پر اور الباب حرف جر کے محذوف ہونے کی بنا پر منصوب ہے کیونکہ استبق متعدی بالی ہوتا ہے، یا بمعنی ابتدرا ہے اور مفعول بہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور جملہ قدت..... معطوف ہے جملہ استبقا الباب پر ''أی استبقا وقدت'' یا یہ کہ حال کی جگہ میں ہو ''أی وقد قدت'' اور جملہ ألفیا..... بھی جملہ استبقا الباب پر معطوف ہے اور جملہ قالت مستانفہ برائے بیان ہے، جملہ ماجزاء محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ أراد صلہ ہے من اسم موصول کا، اور جملہ یُسجن صلہ ہے موصول حرفی أن کا، أن یسجن مصدر مؤول اور أو عذاب ألیم اسی پر معطوف ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے استباق میں فرق:- استبقا الباب استباق بمعنی آگے بڑھنا، دوڑنا، ایک دوسرے پر سبقت لے جانا، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا دونوں دروازے کی جانب دوڑے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی، حضرت یوسف علیہ السلام تو اس لئے دوڑے تاکہ باہر نکل جائیں

(اور زلیخا کے دامِ فریب سے محفوظ ہو جائیں) اور زلیخا اس لئے دوڑی تا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو باہر نکلنے سے روک سکے، (اور اپنا مقصد حاصل کر سکے) استبقا أی تسابقا إلی الباب علیٰ معنی قصد کل من یوسف وإمرأة العزیز سبق الآخر إلیه فهو لیخرج وهی لتمنع من الخروج. (روح المعانی ج۶ ص۴۰۸)

معارف و حقائق

و غلقت الابواب میں صیغۂ جمع اور **استبقا الباب** میں صیغۂ واحد لانے کی وجہ:- وغلّقت الأبواب میں جمع کا صیغہ ذکر فرمایا اور "استبقا الباب" میں واحد کا صیغہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مراد باہر نکلنے کا آخری دروازہ ہے۔

"ووحد الباب وإن کان جمعه فی قوله وغلقت الأبواب لأنه أراد الباب الذی هو المخرج من الدار. (مظہری ج۵ ص۱۵۵، مدارک ج۲ ص۲۱۷)

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب باہر نکلنے کی کوشش کی تو دروازوں کے تالے خود بخود ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

ولما هرب یوسف جعل فراش القفل تتناثر وتسقط (مظہری ج۵ ص۱۵۵، مدارک ج۲ ص۲۱۷) اور یہاں جمع استعمال نہ کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے مکان کے دروازے یکے بعد دیگرے ایک سمت میں نہ رہے ہوں، بلکہ مختلف جہات میں واقع ہوں، چنانچہ دونوں اس دروازہ کی طرف دوڑے جس سے حضرت یوسف علیہ السلام نکلنا چاہتے تھے، یعنی باہر نکلنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام جس دروازہ کی طرف دوڑے اسی کی طرف زلیخا بھی ان کو روکنے کے لئے دوڑی۔

ویحتمل أنه لم تکن تلک الأبواب المغلقة علی الترتیب باباً

فباباً بل كانت هي في جهاتٍ مختلفة فاستبقا إلىٰ باب يخرج منه.

(روح المعانی ج۶ ص۴۰۹)

وقدّت قميصه من دبرٍ اوراس عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتا، القدّ کے معنی مطلقاً چیرنے اور پھاڑنے کے ہیں، اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ لمبائی میں پھاڑنے کو القدّ اور چوڑائی میں پھاڑنے القطّ کو کہا جاتا ہے، (الدر المصون ج۶ ص۴۷۱) قمیص بمعنی کرتا اس کی جمع أقمصة ، قمص اور قمصان آتی ہے، دُبُر پشت، پیٹھ، پیچھا، جمع أدبار یعنی حضرت یوسف علیہ السلام جب باہر نکلنے کے لئے بھاگے تو زلیخا ان کو روکنے کے لئے دوڑی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام اپنے عزم پر قائم رہے تو اس نے ان کا کرتا پیچھے سے پکڑ کر کھینچا جس کی وجہ سے وہ پھٹ گیا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

وألفيا سيدها لد الباب اور دونوں نے پالیا عورت کے خاوند کو دروازہ پر

ألفيا ، وجدا کے معنی میں ہے، سیّد بمعنی شوہر مشتق ہے ساد ، يسود سے اور على الاطلاق مالک، رئیس اور سردار کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، عزیز مصر زلیخا کا شوہر ضرور تھا، مگر حقیقتاً بوجہ آزاد ہونے کے حضرت یوسف علیہ السلام کا آقا اور مالک نہیں تھا، اس لئے بجائے سیّدھما کے سیّدھا ذکر کیا۔

"أي وجدا زوجها وهو فعيل من ساد يسود وشاع اطلاقه على المالک وعلى الرئيس وفي البحر إنما لم يضف إليهما لأنه لم يكن مالكاً ليوسفؑ حقيقةً لحريته". (روح المعانی ج۶ ص۴۰۹)

لدا بمعنی عند ہے، یعنی اچانک محل کے دروازہ پر دونوں کی ملاقات عزیز سے ہو گئی جو آج خلاف معمول بے وقت آ گیا تھا۔

"أی وجدا العزیز عند باب القصر فجأة وقد حضر فی غیر أوان حضوره". (صفوۃ ج۲ص۴۳)

قَالَتْ مَاجَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِکَ سُوْءً إِلَّا أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْم ما، نافیہ، جزاءُ مبتداء، من، موصولہ یا موصوفہ مضاف الیہ ہے، اور أن يسجن، مصدر مؤول خبر ہے مبتداء کی، أو، برائے تنویع اور عذاب أليم معطوف ہے مصدر مؤول أن يسجن پر، تقدیر عبارت ليس جزاءهُ إلا السجن أو العذاب الأليم ہوگی یعنی یوسف کی سزا نہیں ہے مگر قید خانہ یا سخت قسم کی سزا، بعض نے عذاب أليم سے کوڑوں سے مارنے کی سزا مراد لیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پیروں میں بیڑی ڈالنا مراد لیا ہے، اور اگر ما کو استفہامیہ قرار دیا جائے تو جزاء مبتداء بھی ہوسکتا ہے اور خبر بھی، اس صورت میں تقدیر عبارت "أیُّ شیءٍ جزاء ه غير ذلک أو ذلک" ہوگی۔ (روح المعانی ج۶ص۴۰۹)

أهل کے معنی کنبہ، بیوی اور رشتہ دار کے آتے ہیں یہاں مراد خود زلیخا کی ذات ہے، جو عزیز مصر کی بیوی تھی، السجن، قید خانہ، جمع سجون۔

واستبقاالباب الآية کا حاصل:- آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ اس عورت کے دام تزویر سے بچنے کی تمام کوششیں ناکام ہورہی ہیں، تو اپنی حفاظت کے واسطے وہ دروازہ کی طرف بھاگے، انھوں نے جب بچنے کے لئے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے نکلنے کی راہ کو اس طرح آسان کردیا کہ مقفل دروازوں کے تالے خود بخود کھل کر گرنے لگے، یا جس دروازہ سے وہ باہر نکلنا چاہتے تھے اس کا تالا کھل گیا، ادھر زلیخا کی کوشش یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام باہر نہ نکلنے پائیں، چنانچہ ان کو روکنے کے لئے اس نے پیچھا کیا اتفاق سے حضرت

یوسف علیہ السلام کا پچھلا دامن اس کے ہاتھ میں آ گیا اور کھینچا تانی میں وہ پھٹ گیا مگر حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے، زلیخا بھی ساتھ تھی، جب دونوں باہر نکلے تو خلاف معمول دروازہ پر عزیز مصر موجود تھا، معاملہ انتہائی نازک تھا، حالات اگرچہ زلیخا کی غلطی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کے غماز تھے، مگر پھر بھی کوئی واضح دلیل موجود نہ تھی، اور معاملہ تحقیق طلب تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کو پھانسنے کی کوشش اگرچہ خود زلیخا نے کی تھی، اور وہی ان پر فریفتہ بھی تھی، فعل بد کے سارے راستے بھی خود اسی نے ہموار کیے تھے، مگر ابھی اس کا عشق خام تھا، اس لئے وہ صحیح حال کہنے پر قادر نہ ہوئی، اور اصل حقیقت کو چھپانے کے لئے غیظ وغضب میں آ کر کہنے لگی کہ ایسے شخص کی سزا قید خانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو۔

فائدہ:- مکان کے تمام دروازوں کو مقفل کر دینے کے بعد زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فعل بد کی دعوت دی اور اس پر آمادہ کرنے کی پوری امکانی کوشش کی، اور حضرت یوسف علیہ السلام اس سے پوری طرح آگاہ تھے کہ باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے باہر نکل جانے کی عملی کوشش کی تو خداوند قدوس نے اس کی راہ پیدا فرما دی کہ دروازوں کے تالے از خود کھل گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے، اس سے معلوم ہوا کہ جب آدمی کی حفاظت اور بچاؤ کے تمام راستے مسدود ہو جائیں اور بظاہر اپنے بچاؤ کی کوئی سبیل باقی نہ رہ جائے تو بھی اپنی کوشش کو جاری رکھنا چاہئے، مایوسی کا شکار ہرگز نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بڑی عظیم ہے وہ سعی وکوشش کرنے والوں کے لئے راہ کی تمام دشواریوں کو ختم کر دینے پر ہمہ وقت قادر ہے اور نجات کی راہ کو آسان کر دینے والا ہے۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ .وَإِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ . فَلَمَّا رَأىٰ قَمِيْصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ . يُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِيْنَ ۔

یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو، اور گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے اگر ہے کرتا اس کا پھٹا ہوا آگے سے تو عورت سچی ہے اور وہ ہے جھوٹا، اور اگر ہے اس کا کرتا پھٹا ہوا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے، پھر جب دیکھا عزیز نے کرتا اس کا پھٹا ہوا پیچھے سے، کہا بے شک یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا، البتہ تمہارا فریب بڑا ہے، یوسف جانے دے اس ذکر کو اور عورت تو بخشوا اپنا گناہ، بے شک تو ہی گنہگار تھی۔

ترکیب ولغات:- جملہ ''قال'' مستانفہ برائے بیان، جملہ هی راودتنی محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ راودتنی محلاً مرفوع خبر ہے هی مبتداء کی، جملہ شهد شاهد معطوف ہے جملہ قال پر، جملہ إن كان قميصه قد.....شہادت کی تفسیر ہے، اور جملہ قد من قبل محلا منصوب خبر ہے کان کی، اور فصدقت شرط کا جواب ہے قد کی تقدیر کے ساتھ، أی فصدقت ، وهو من الكاذبين محلا مجزوم معطوف ہے جواب شرط پر اور جملہ رأى قميصه.....محلا مجرور مضاف الیہ،

جملہ قد من دبرٍ.....محلاً منصوب حال ہے قد کی تقدیر کے ساتھ، جملہ قال..... جواب شرط، اور إنه من كيدكن مقولہ ہے قول کا، اور جملہ إن كيدكن عظيم، جملہ تعلیلیہ کے حکم میں ہے، جملہ ندا، يوسف .....مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ أعرض ..... جواب ہے ندا کا، جملہ واستغفری معطوف ہے جواب ندا أعرض عن هٰذا پر، جملہ إنک کنت.....بیان علت کے واسطے ہے اور جملہ کنت من الخاطئين محلاً مرفوع خبر ہے إنّ کی۔

معارف وحقائق

قَالَ هِيَ رَاوَدْتُنِيْ عَنْ نَفْسِيْ، راودت، مشتق ہے مراودة سے بمعنی پھسلانا، خواہش کرنا، پیغمبرانہ شرافت کی بنا پر بہت ممکن تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام زلیخا کا راز فاش نہ کرتے مگر اس کے مکر وفریب کی وجہ سے حقیقت حال کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوئے اور فرمایا: یہ اس کا بہتان ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ ارادۂ بد کیا تھا مگر میں کسی طرح راضی نہ ہوا اور اپنی حفاظت کے واسطے بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتا تھا، کہ اس نے میرا پیچھا کیا اور سامنے آپ نظر آ گئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا۔

فائدہ:- جہاں حقیقت حال کو چھپانے میں ضرر کا اندیشہ ہو وہاں اسے ظاہر کر دینا نہایت ضروری امر ہے، اور ایسا کرنا ہرگز مکارم اخلاق کے منافی نہیں ہے۔

حقیقت حال سے پردہ اٹھانے کی وجہ اور غیب سے صحیح فیصلہ کا انتظام:-

"وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا" شاہد بمعنی گواہ، حاضر ہو کر بتانے والا، زلیخا نے جب دیکھا کہ راز فاش ہوا چاہتا ہے، تو اس نے بات بناتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام عائد کر دیا جس کی وجہ سے مجبوراً حضرت یوسف علیہ السلام کو حقیقت حال

سے پردہ اُٹھانا پڑا، چنانچہ انھوں نے ''هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي'' کے جملہ سے اپنی برأت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ زلیخا جو کچھ کہہ رہی ہے یہ اس کا بہتان ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ اسی نے میرے ساتھ ارادۂ بد کیا تھا، مگر بفضل خداوندی میں نے اس کی چال کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

معاملہ نے بڑی نازک صورت اختیار کرلی تھی اور عزیز مصر کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا تھا کہ ان میں سے کسے سچا قرار دے اور کسے جھوٹا، وہ ابھی اسی شش وپنج میں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے صحیح فیصلہ کا ایک آسان راستہ پیدا کردیا، جس کی تفصیل بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یہ ہے کہ زلیخا کا ماموں زاد بھائی جو ابھی شیر خوار بچہ تھا، اللہ نے اپنے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کے لئے اسے گویائی عطا فرمائی، اس نے گویا ہوکر یہ حکیمانہ بات کہی کہ یوسفؑ کے کُرتے کو دیکھ لیا جائے کہ وہ آگے سے پھٹا ہے یا پیچھے سے، اگر آگے سے پھٹا ہے تو زلیخا سچی ہے اور یوسف جھوٹے ہیں، اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو یوسفؑ سچے اور زلیخا جھوٹی ہے، کیونکہ پیچھے سے پھٹے ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ یوسفؑ بھاگنا چاہتے ہیں اور زلیخا روکنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے، بہرحال شیر خوار بچے کی بتائی ہوئی علامت کے مطابق جب کرتے کو دیکھا گیا تو وہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا، جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت مکمل ثبوت کے ساتھ ظاہر اور واضح ہوگئی، شاھد کی مذکورہ تفسیر کہ وہ ایک شیر خوار بچہ تھا، رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے ثابت ہے، جو مسند احمد، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان میں موجود ہے، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے، اور پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے، اور امام بخاریؒ و مسلمؒ کی شرط کے مطابق قرار دیا ہے۔ (تفسیر کبیر ج۹ ص۹۸، تفسیر مظہری ج۵ ص۱۵۶)

شاھد کی دوسری تفسیر:- حضرت حسن، عکرمہ، قتادہ اور مجاہد وغیرہ سے منقول ہے کہ شاہدِ یوسف علیہ السلام شیر خوار بچہ نہیں بلکہ ایک عقلمند، ذہین وفطین آدمی تھا جو رشتہ میں زلیخا کا چچیرا بھائی تھا، اسے دربارِ شاہی میں تقرب اور بڑا وقار حاصل تھا، چنانچہ وہ درباری مشوروں میں بھی شریک رہا کرتا تھا، اور عزیز مصر کا بھی مشیر کار تھا۔

(روح، کبیر وغیرہ)

زلیخا کے رشتہ دار کو شاہد بنانے کی حکمت:- شاہد یوسف علیہ السلام خواہ شیر خوار بچہ رہا ہو یا جوان آدمی، اس بات پر مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ زلیخا کا رشتہ دار تھا، اس کو شاہد بنانے میں حکمت یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نزاہت و پاکدامنی خوب اچھی طرح ثابت ہو جائے، اور تہمت کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے، اور زلیخا کا مجرم ہونا بالکل واضح ہو جائے۔

"وجعل الله تعالىٰ الشاهد من أهلها قيل: ليكون أدل علىٰ نزاهته عليه السلام وأنفى للتهمة، والزم لها. (روح المعانی ج۶ ص۴۱۲)

شیر خوارگی کے زمانہ میں کلام کرنے والے بچوں کی تعداد:-

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چار لڑکوں نے بچپنے کی حالت میں کلام کیا ہے۔

(۱) بنت فرعون کے بال بنانے اور سنوارنے والی خادمہ کا بچہ۔

(۲) شاہد یوسفؑ۔

(۳) وہ بچہ جس نے جریج کی برأت کی گواہی دی۔

(۴) حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام)۔

امام حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ (المستدرک ج۲ ص۴۹۷)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم کی روایت میں منقول ہے کہ شیر خوارگی کی حالت میں صرف تین بچوں نے کلام کیا۔ (۱) حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) (۲) جریج والا بچہ، (۳) اور ایک بچہ جس کو اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی کہ ایک خوبصورت سوار ادھر سے گزرا تو بچے کی ماں نے کہا کہ اے اللہ میرے بیٹے کو ایسا ہی بنانا، بچے نے کہا: باری تعالیٰ مجھے ایسا نہ بنانا، اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ اصحابِ اخدود کے واقعہ میں ایک بچے نے کلام کیا (جس کا واقعہ یہ ہے کہ ذونواس نامی یمن کے ایک بادشاہ نے ایک بہت بڑی خندق کھدوائی اور اس میں آگ جلا کر اہل ایمان کو اس میں ڈالنا شروع کیا، اسی ضمن میں ایک شیر خوار بچہ کو اس کی مومنہ ماں سے چھین کر جب اس نے آگ میں ڈالا تو ماں بیتاب ہوگئی، قریب تھا کہ وہ اس کی منشاء کے مطابق کلمہ کفر زبان سے کہہ دیتی کہ بچے نے آگ کے اندر سے آواز دے کر کہا کہ ماں! یہ کانٹوں کا تاج نہیں بلکہ پھولوں کی سیج ہے تو بھی جلدی سے چلی آ، اصل میں اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو مومنین کے لئے گل وگلزار بنا دیا تھا۔)

"عن ابی هريرة رضی الله عنه انه قال: لم يتكلم فی المهد الا ثلثة، عيسىٰ بن مريم، وصاحب جريج، وصبی كان ترضعه امه فمر راكب حسن الهيئة فقالت امه اللهم اجعل ابنی مثل فلان، فقال الصبی: اللهم لا تجعلنی مثله، .....وفی صحيح مسلم تكلم الطفل فی قصة اصحاب الاخدود". (مظہری ج۵ ص۱۵۶)

وَإِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ إلىٰ..... إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ، إن كان جملہ شرطیہ یا تو معمول ہے قول مضمر فقال کا، چنانچہ تقدیر عبارت فقال: إن كان ہوگی، یا معمول ہے شهد کا کیونکہ کوفیین کے نزدیک وہ قول کے معنی میں ہے۔

"من قبل" "من دبر" فا اور عین کے ضمہ اور لام کے جر اور تنوین کے ساتھ بمعنی من قبل القمیص و من خلف القمیص، قبل کی جمع اقبال اور دبر کی جمع ادبار آتی ہے، فصدقت، فکذبت، قد کی تقدیر کے ساتھ اصل عبارت فقد صدقت اور فقد کذبت ہوگی، کیونکہ قد ماضی کو حال سے قریب کر دینے کے لئے ہوتا ہے۔ (الدر المصون ج ۶ ص ۴۷۲)

کیدکن: کید بمعنی داؤ، تدبیر، مکر و فریب، یہ لفظ اچھی اور بری ہر طرح کی تدبیر کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں اس کا استعمال دونوں معنوں میں ہوا ہے، چنانچہ اکید کیداً (سورہ طارق ۱۶) میں اللہ تعالیٰ نے کید کی نسبت اپنی ذات کی طرف کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر بری نہیں ہو سکتی۔ البتہ اکثر مواقع پر یہ لفظ بری تدبیر کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے، یہاں بھی بری تدبیر اور مکر و فریب کے معنی ہی مراد ہیں، کید کی جمع اکیاد آتی ہے۔

زلیخا کی چال بازی پر تنبیہ:- قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ شاہد یوسف علیہ السلام کی بتائی ہوئی علامت کے مطابق جب حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کا معائنہ کیا گیا تو زلیخا جھوٹی اور وہ سچے ثابت ہوئے، چنانچہ ضروری ہوا کہ زلیخا کی چال بازی پر اسے تنبیہ کی جائے، قول باری تعالیٰ "قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ" میں اسی تنبیہ کا بیان ہے، اور لطیف پیرایہ میں عزیز مصر کی طرف سے اس بات کی تصریح ہے کہ زلیخا تم جھوٹی ہو اور یوسف سچا ہے، گویا عزیز مصر اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم نے ہی یوسف کو فعل بد میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ ارادۂ بد کیا تھا، مگر جب وہ اپنی حفاظت کی غرض سے بھاگے تو تم نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ کر کھینچا جس سے کرتا پیچھے سے پھٹ گیا۔

"ای نشیء من احتیا لکن ایتها النساء ومکر کن و مسبب عنه، وهذا تکذیب لها و تصدیق له علیه السلام علیٰ ألطف وجه کانه قیل: انت التی راودتیه فلم یفعل و فرّ فاجتذبتیه فشققت قمیصه فهو الصادق فی اسناد المراودة الیک، وانت الکاذبة فی نسبة السواء الیه". (روح المعانی ج۶ ص۴۱۴)

عورتوں کا مکر نہایت خطرناک ہوتا ہے:- إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ، خدا بچائے کہ تمہارا مکر وفریب تو بڑا ہی خطرناک اور زبردست ہوتا ہے، بظاہر تو تم ضعیف اور کمزور نظر آتی ہو جس کی وجہ سے بہت جلد تمہاری صداقت کا یقین ہو جاتا ہے، لیکن عموماً تمہارا باطن بڑا خبیث ہوتا ہے کہ اگر حزم واحتیاط سے کام نہ لیا جائے تو نہ جانے کیسے کیسے فتنے پیدا ہوں اور آدمی قعر مذلت میں جا گرے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:- قرآن کریم نے عورتوں کے مکر وفریب کو عظیم قرار دیا ہے، اور شیطان کے مکر وفریب کو ضعیف کہا ہے، ارشاد ہے: "إن کید الشیطان کان ضعیفاً" تو کیا عورتوں کا مکر شیطان سے بھی بڑھا ہوا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ عورتوں کا مکر عظیم ہے مردوں کے مقابلہ میں، اور شیطان کے مکر کا ضعیف ہونا اللہ کی تدبیر کے مقابلہ میں ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں قرآن کریم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے بلکہ ایک مصری کافر کا قول نقل کر دیا ہے جس سے کسی بات پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ بات محل نظر ہے کیونکہ قرآن کریم جب کوئی بات بغیر نکیر کے بیان کرے تو اس سے استدلال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (روح ج۶ ص۴۱۵)

نیز شیطان کے مکر کا ضعیف ہونا بایں معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہر انسان اسے اپنا دشمن سمجھتا اور جانتا ہے، چنانچہ اس کے مکر وفریب سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرتا

ہے، جس کی بنا پر عموماً اس کے داؤ سے محفوظ رہتا ہے، اس کے برخلاف عورتوں کی طرف مردوں کا طبعی میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، ان کی اُلفت ومحبت مردوں کے دلوں پر مستولی ہوتی ہے جس کی بنا پر مرد عموماً ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں، اس لئے ان کے مکر کو عظیم قرار دیا گیا ہے۔

الحاصل! عورتوں کے معاملے میں بہت زیادہ بیدار مغزی سے کام لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کا مکر وفریب کچھ اس انداز کا ہوتا ہے کہ اس سے بچ جانا عموماً ممکن نہیں ہوا کرتا۔

عزیز مصر کے مشتعل نہ ہونے کی وجہ:- یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ کے اس قدر جذباتی ہونے کے باوجود آخر عزیز مصر کے اندر کوئی اشتعال کیوں پیدا نہیں ہوا، اور وہ سکون واطمینان سے کیسے باتیں کرتا رہا؟ امام قرطبی نے اس کا ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی تھا، اس لئے خاموش رہا۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت اس کی غیرت کو سلب کرلیا تھا (تاکہ اشتعال میں آئے بغیر صحیح ڈھنگ سے وہ پورے معاملہ کی تفتیش کرسکے۔ (م قرطبی ج۲ص۴۳۲)

اور مشتعل نہ ہونے کی یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ قرائن وشواہد سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت اسے معلوم ہوچکی تھی اور اشتعال میں آنے سے مزید ذلت ورُسوائی کے سوا اور کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا، اس لئے عافیت اسی میں تھی کہ خاموش رہا جائے۔

فائدہ:- وشهد شاهد الایۃ میں شاہد اور شہادت کے اصطلاحی اور فقہی معنی مراد نہیں ہیں، کیونکہ یہ اصطلاحات تو بہت بعد کی ہیں، یہاں قرآن کریم نے زلیخا کے رشتہ دار شخص یا شیر خوار بچے کو شاہد اس معنی کے اعتبار سے کہا ہے کہ جس طرح شاہد

(گواہ) کے بیان سے معاملہ کا حل اور تصفیہ آسان ہوجاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی اس بچہ یا آدمی کے بیان سے یہی فائدہ حاصل ہوگیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے معاملہ کا فیصلہ آسان ہوگیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے عزیز مصر کی معذرت:- یُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْبِکَ إِنَّکِ کُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِیْنَ حقیقت واضح ہوکر عزیز مصر کے سامنے آچکی ہے، لہٰذا مزید رسوائی سے بچنے کے لئے بطور معذرت وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے استدعا کرتا ہے کہ یوسف! تم معاملہ کو یہیں ختم کردو، اس کا کسی اور سے تذکرہ نہ کرو اور پھر زلیخا سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تمہارا جرم ثابت ہوچکا ہے، لہٰذا تم اپنے جرم سے استغفار کرو اور معافی مانگو۔

یُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یوسف منادیٰ ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے قریب ہونے اور ان کے کمال تقطنِ کلام کی بنا پر حرف ندا کو حذف کردیا گیا ہے، جمہور کے نزدیک یوسف مضموم الفاء ہے، اس کے مفرد معرفہ ہونے کی بنا پر، مطلب یہ ہے کہ یوسف تمہاری طہارت ونزاہت اور پاکدامنی ثابت ہوچکی ہے، اب تم سے یہ درخواست ہے کہ اس معاملہ کو پردۂ راز میں ہی رکھو اور کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرو تاکہ میری مزید رُسوائی نہ ہو۔ (روح ج۶ ص۴۱۵، الدر المصون ج۶ ص۴۷۳)

زلیخا سے طلب معافی کا مطالبہ:- وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْبِکِ حضرت یوسف علیہ السلام سے عذر ومعذرت کے بعد عزیز زلیخا کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ تمہارا جرم دلائل سے ثابت ہوچکا ہے، لہٰذا تم معافی مانگو، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس سے معافی مانگے؟ اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ، اپنے شوہر سے، کیونکہ تم نے اس کے حق میں خیانت کی کوشش کی ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام سے، اس لئے کہ ان پر غلط

الزام لگا کر تم نے اُسے رُسوا اور ذلیل کرنا چاہا تھا، تیسرا جواب یہ ہے کہ خدا سے کیونکہ فعل گناہ کا ارتکاب کر کے تم نے خدا تعالیٰ کا جرم کیا ہے، واضح رہے کہ کفر کے باوجود مصریوں میں خدا کے وجود اور اس کی جزاء وسزا کا عقیدہ موجود تھا۔ (روح ج۶ ص۴۱۵)

إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِيْن، الْخَاطِئِيْن ،خطا کا اسم فاعل، صیغہ جمع مذکر، بلاشبہ تو خطا کاروں میں سے ہے، یہاں خطا قصداً گناہ کرنے کے معنی میں ہے، بظاہر مقام اس کا تھا کہ "من الخاطئات" مؤنث کا صیغہ استعمال کیا جاتا، مگر چونکہ مذکر اور مؤنث دونوں قسم کے خطا دار مراد ہیں، اس لئے مذکر کو مؤنث پر غلبہ دیتے ہوئے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا، جیسا کہ "و کانت من القانتین" (سورہ تحریم۱۲) اور "إنها كانت من قومٍ كافرين" (سورہ نمل۴۳) میں مذکر کو مؤنث پر غلبہ دے کر صیغہ مذکر استعمال کیا گیا ہے۔

ای من القوم المذنبين، من خَطِئَ اذا اذنب متعمدا، لم يقل من الخاطئات لانه لم يقصد به الخبر عن النساء، بل قصد الخبر عمن فعل ذالک رجلا كان او امرأة، فذكر بصيغة المذكرين تغليبا و نظيره قوله تعالىٰ "و كانت من القانتين" "وانها كانت من قوم كافرين". (مظہری ج۵ ص۱۵۷)

کوشش کے باوجود معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا:- حضرت یوسف علیہ السلام کی طہارت ونزاہت اور زلیخا کی غلطی کے واضح ہوجانے کے بعد عزیز مصر نے یہ چاہا کہ یہ معاملہ یہیں سے ختم ہوجائے تاکہ مزید ذلت ورسوائی نہ ہو، مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی بلکہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی۔ آگے اسی کا بیان ہے۔

(تیسرے رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَأَةُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُبِيْنٍ ۔

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں، عزیز کی عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے، اس کے جی کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اسکی محبت میں، ہم تو دیکھتے ہیں اسکو صریح خطا پر۔

معارف وحقائق

''نسوۃ'' بقول ابوحیان، صبیۃ اور غلمۃ کی طرح جمع تکسیر قلت ہے بمعنی گنی چنی چند عورتیں، باعتبار لفظ اس کا کوئی واحد نہیں ہے، البتہ باعتبار معنی لفظ امرأۃ اس کا واحد ہے، اور بقول ابن السراج ''نسوۃ'' اسم جمع ہے اور چونکہ مؤنث غیر حقیقی ہے اس لئے فعل مؤنث نہیں لایا گیا، ''نسوۃ'' کے نون میں مشہور قرأت تو کسرہ کی ہے، مگر بعضوں نے بضم النون بھی پڑھا ہے، اس دوسری قرأت کے اعتبار سے بغیر کسی اختلاف کے وہ اسم جمع ہوگا۔

''ذهب ابوحيان إلىٰ أنه جمع تكسير للقلة كصبيةٍ، وغلمة وليس له واحد من لفظه بل من معناه وهو إمرأة، وزعم ابن السراج أنه اسم جمع، وعلىٰ كل فتانيثه غير حقيقي ... ولذا لم يؤنث فعله .....وفي نونه لغتان الكسر وهي المشهورة والضم .....وهو إذ ذاك اسم جمع بلا خلاف''. (روح ج۶ ص۴۱۶، الدر المصون ج۶ ص۴۷۴)

فِي الْمَدِيْنَةِ، المدینۃ سے مراد بالاتفاق شہر مصر ہے، جار مجرور محذوف کے متعلق ہو کر صفت ہے نسوۃ کی، اور بعض علماء نے قال کے متعلق قرار دیا ہے مگر یہ

غیر ظاہر ہے۔

"یجوز تعلقه بمحذوف صفة لنسوة وهو الظاهر و ب"قال" ولیس بظاهرٍ". (الدر المصون ج۶ ص۴۷۴)

زلیخا پر انگشت نمائی کرنے والی عورتیں:- بقول مقاتل یہ کل پانچ عورتیں تھیں: (۱) دربان کی بیوی، (۲) ساقی (۳) خباز (۴)(۵) جیلر اور گھوڑوں کے نگراں کی بیویاں۔ (مظہری ج۵ ص۱۵۷)

امرأة العزیز، العزیز لقب ہے مصر کے وزیر خزانہ کا، جس کا نام قطفیر بتایا جاتا ہے۔

"لقب للوزیر الذی کان علیٰ خزائن مصر وإسمه (قطفیر) کما جاء فی التفاسیر". (اعراب القرآن ج۶ ص۴۱۷)

تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ، تراود خبر ہے، امرأة العزیز کی، بمعنی خواہش کرنا، پھسلانا، صیغہ ماضی راودت کے بجائے تراود مضارع کا صیغہ استعمال کرنا اس بات پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ پھسلانا اور اپنی طرف مائل کرنا امرأۃ عزیز کی عادت بن چکی تھی۔

"خبر امرأة العزیز و جیء بالمضارع تنبیهاً علیٰ أن المراودة سارت سجیة لها ودَیْدَنا، دون الماضی فلم یقلن راودت". (الدر المصون ج۶ ص۴۷۵)

فتی کی جمع فتیة اور تثنیہ فتیان ہے، اصل میں فتیٌ تھا، یا متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی بنا پر یا کو الف سے بدل دیا، تو فتی ہو گیا بمعنی نوجوان۔

لفظ الشغاف کی تحقیق:- "قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا" اس جملہ کو "إمرأة العزیز" کی خبر ثانی بنانا بھی درست ہے اور مستانفہ قرار دینا بھی، اور تراود کے فاعل یا اس کے

مفعول سے حال بھی قرار دیا جاسکتا ہے، حبّاً تمیز ہے شغفها کی، شغف ماخوذ ہے الشَّغاف سے، ''الشغاف'' دل کے اس پردے کو کہا جاتا ہے جو باریک جھلی کی شکل میں ہوتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ سویداء قلب کو کہا جاتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک مرض ہے جو بر بنائے محبت دل تک پہونچ جاتا ہے، اور بقول بعض وہ ایک باریک جھلی ہے جسے لسان قلب کہا جاتا ہے، معنی یہ ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت نے زلیخا کے حجاب قلب کو پھاڑ دیا ہے، اور اس میں داخل ہوگئی ہے۔

(الدر المصون ج۶ ص۴۷۵)

یعنی یوسف علیہ السلام کی محبت اس کے دل میں رچ بس گئی ہے۔

ضلال مبین کے معنی:- ''إِنَّا لَنَرَاهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'' لنراها میں رؤیت بمعنی علم ہے، ''فی ضلال مبین'' میں ضلال بمعنی گمراہی، رشد وہدایت اور طریق صحیح سے انحراف کا نام ضلال ہے، مبین بمعنی واضح، یعنی ایسی گمراہی جو کسی پر مخفی نہ ہو، فی ضلال مبین میں تنوین تفخیم کے واسطے ہے، معنی یہ ہیں کہ زلیخا انتہائی خطرناک اور زبردست گمراہی میں جا پڑی ہے کہ فریفتہ بھی ہوئی تو اپنے کنعانی غلام پر کہ جو نہ اس کے ملک کا اور نہ حسب ونسب کا بلکہ ایک پردیسی غلام۔

وقال نسوہ الخ کا حاصل:- آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ عزیز مصر نے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام سے ''أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا'' اور زلیخا سے ''وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ'' کہہ کر معاملہ ختم کردیا، تاکہ مزید ذلت ورُسوائی نہ ہو مگر معاملہ مخفی اور پوشیدہ نہ رہ سکا بلکہ شدہ شدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں اس کا چرچا شروع ہوگیا، اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی بیوی اپنے کنعانی غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے، اور اس کی محبت اس کے سویداء قلب میں داخل ہوگئی ہے، چاہتی ہے کہ اس

کو فعل بد میں مبتلا کر کے اپنا مقصد حاصل کرے، حالانکہ ایسے معزز اور اعلیٰ درجہ کے عہدہ دار کی بیوی کے لئے یہ انتہائی شرمناک بات ہے کہ اپنے غلام سے مقصد برآری کرنا چاہے، ہمارے نزدیک یہ اس کی زبردست اور صریح غلطی ہے۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيناً وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَراً إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۔

پھر جب سنا اس نے ان کا فریب بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی ان کے واسطے ایک مجلس اور دی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری اور بولی یوسف نکل آ ان کے سامنے پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں، اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں حاشا للہ نہیں یہ شخص آدمی، یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ۔

معارف وحقائق

''فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ'' مکر بروزن فعل بفتح الفاء وسکون العین مکر یمکر باب نصر کا مصدر سماعی ہے، (اعراب القرآن ج۶ ص۴۱۸) مکر بمعنی لعن، طعن، طنز وتعریض، پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنا، قرآن کریم نے زلیخا پر طنز وتعریض کرنے والی عورتوں کے طنز وتعریض کو لفظ مکر سے تعبیر فرمایا حالانکہ وہ تو بیان واقعہ تھا، مفسرین نے اس کی متعدد وجہیں ذکر کی ہیں۔

عورتوں کی گفتگو کو مکر کہنے کی وجہ:۔

''عورتوں کی گفتگو کو مکر (فریب) اس لئے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر باتیں کرتی تھیں، اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا، حالانکہ یوسف علیہ السلام کے بے مثال حسن وجمال کا شہرہ جس

عورت کے کان میں پڑتا تھا ان کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا، کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینی کرنے والیوں کے دلوں میں یہی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی ایسی حرکت پر آمادہ کر دیں جو یوسفؑ کے دیدار کا سبب بن جائے، یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بیٹھا کر اپنی جانب مائل کرنے کا موقع نکالیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملے میں اپنا رازدار بنایا ہو اس نے رازداری کی جگہ پردہ دری اور خوردہ گیری شروع کر دی ہو، بہرحال ان کی گفتگو کو لفظ مکر سے ادا کرنے میں سب احتمالات ہیں۔ (فوائد عثمانی ص ۳۱۶)

طنز و تعریض کرنے والی عورتوں کو دعوت دینے کی وجہ:- أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ جواب ہے شرط کا اور مفعول محذوف ہے، "ای أرسلت رسولاً" یعنی زلیخا کو جب امراء مصر کی عورتوں کے طنز و تعریض کا علم ہوا تو ان کو نیچا دکھانے اور اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایک مجلس دعوت کو آراستہ کر کے ان کو اپنے یہاں بلایا، بقول "وہب" زلیخا نے کل چالیس عورتوں کو دعوت دی جن میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جنھوں نے اس کو غلام سے محبت کرنے پر عار دلائی اور گمراہ قرار دیا تھا۔

"قال وهب: اتخذت مأدبة ودعتْ اربعين امرأة منهن هؤلاء اللاتي عيرنها". (مظہری ج ۵ ص ۱۵۸)

مگر ظاہر یہ ہے کہ إليهن میں ضمیر انھیں عورتوں کی طرف راجع ہے جو طنز و تعریض میں شریک تھیں۔ (روح ج ۶ ص ۴۱۸)

لفظ مُتَّكَا کی تحقیق:- "وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً" اور ان کے لئے گاؤ تکیے وغیرہ لگا دیئے، متکا بضم المیم وتشدید التاء وفتح الکاف والہمزۃ، مفعول بہ ہے أعتدت

کا یعنی فرش وفروش بچھایا اور اس پر گاؤ تکیہ وغیرہ لگا کر مجلس کو آراستہ کیا اور کھانے پینے کی چیزیں حاضر کیں، گاؤ تکیہ اور مسند وغیرہ جس پر ٹیک لگایا جائے اسے ''متّکا'' کہا جاتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ ٹیک لگانے کی جگہ ''متّکا'' کہلاتی ہے، اور بقول مجاہد جو کھانا چھری وغیرہ سے کاٹ کر کھایا جائے وہ ''متّکا'' ہے، القتیبی کہتے ہیں ''اتّکأنا عند فلان'' کا جملہ أکلنا کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، اور بقول زمخشری ''اتّکأنا عند فلان'' طعمنا کے معنی میں بطور کنایہ مستعمل ہے، کیونکہ جسے دعوت دی جاتی ہے تو اس کے لئے گاؤ تکیہ وغیرہ بھی لگائے جاتے ہیں۔

''متّکا'' العامة علیٰ ضم المیم وتشدید التاء وفتح الکاف والهمزة وهو مفعول به بأعتدت ، أی هیّأت واحضرت. والمتکأ الشی الذی یتکأ علیه من وسادة ونحوها ، وقیل : المتکأ: مکان الاتکاء ، وقیل: طعام یحزّ حزّا وهو قول المجاهد ، قال القتیبی '' یقال اتّکأنا عند فلان أی أکلنا ، قال الزمخشری من قولک اتّکأنا عند فلان طعمنا علی سبیل الکنایة لأنه من '' دعوته لیطعم عندک '' إتخذت له تکأة یتکیٔ علیها، قال جمیل :

فظلِلنا بنعمة واتکأنا..... وشربنا الحلال من قلله.

(الدر المصون ج ۶ ص ۴۷۷)

حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عبداللہ بن عمر اور مجاہد وقتادہ وغیرہ نے ''متکأ'' کو بضم المیم وسکون التاء وبتنوین الکاف پڑھا ہے بمعنی ''ترنج''۔ (بحوالہ سابق)

اور بقول بعض کاٹ کر کھائے جانے والے پھل کو مُتک کہا جاتا ہے، شاعر کہتا ہے ؎

لنشرب الاثم بالصّواع جهارا وتری المتک بیننا مستعارا

امام رازیؒ نے ہر کاٹ کر کھائی جانے والی چیز کو مُتکـا قرار دیا ہے۔
(تفسیر کبیر ج۹ ص۱۰۲)

"وَ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا" سکیناً اسم جامد ہے، کاٹنے کا آلہ، بروزن فِعِّیل فا کے کسرہ اور عین کی تنوین کے ساتھ۔ (اعراب القرآن ج۶ ص۴۱۸)

بقول کسائی وفرّاء یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے، مگر اصمعی نے اس کی تانیث کا انکار کیا ہے۔ (الدر المصون ج۶ ص۴۷۹)

فلما سمعت بمكرهن الآية کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ بطور میزبانی کھانے پینے کے لئے جو چیزیں پیش کی گئی تھیں وہ چونکہ کل یا بعض کاٹ کر کھانے کی تھیں، اس لئے ہر ایک کے واسطے چھری کا بھی انتظام کیا گیا، مگر امام نسفی کی بات زیادہ واضح اور دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اہل مصر اس زمانہ میں عجمیوں کی طرح چھری کانٹے سے کھانا کھانے کے عادی ہو چکے تھے۔

"وكانوا لا ياكلون فى ذلك الزمان إلا بالسكاكين". (مدارک ج۲ ص۲۱۹)

یعنی کھانے کو چھری کانٹے کے ذریعہ کاٹ کر کھانا اہل مصر کی تہذیب کا جز بن چکا تھا، لہٰذا اس تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کی چھریاں اس لئے پیش کی گئی تھیں کہ میزبانی کے طور پر پیش کی جانے والی چیزیں یا ان میں سے بعض کاٹ کر کھائے جانے کے قبیل سے تھیں۔

"قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ" یعنی خاندان شاہی اور عمائدین شہر کی عورتیں جب دسترخوان پر بیٹھ کر شغل خورد ونوش میں مشغول ہو گئیں تو زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جو وہیں کسی دوسرے کمرے میں موجود تھے آواز دی کہ ذرا یہاں آنا، مالکہ

کے حکم پر نگاہ نیچی کئے ہوئے وہ باہر تشریف لائے تو تمام عورتیں جمال یوسف کو دیکھ کر ششدر و حیران ہوگئیں اور رُخِ انور کی تجلی و تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کے بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لئے، اور بے ساختہ کہنے لگیں: کون کہتا ہے کہ یہ انسان ہے، بخدا یہ تو نور کا پتلا اور بزرگ فرشتہ ہے۔ (قصص القرآن ج۱ص۲۹۵)

حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال:-

"فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ"

رأينه معطوف ہے فعل مقدر فخرج عليهن پر تقدیر عبارت فخرج عليهن فرأينه ہے، أكبرنه میں ضمیر راجع ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اور أكبرنه کے معنی "عظمنه ودهشن من حسنه" کے ہیں یعنی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مافوق البشر مخلوق قرار دیا اور ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئیں، اور کیوں نہ پڑتیں کہ ان کے حسن و جمال کو ہر حسین و جمیل پر وہی فضیلت حاصل تھی جو کہ چودھویں رات کے چاند کو عام ستاروں پر حاصل ہے۔

(روح المعانی ج۶ص۴۱۹، الدر المصون ج۶ص۴۷۹)

چنانچہ حدیث اسراء کی صحیح روایت میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے کہ حسن و جمال کا نصف حصہ اللہ تعالیٰ نے تنہا حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔

(ابن کثیر ج۲ص۳۷۷)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو شب معراج میں چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن و منور دیکھا۔

"عن أبي سعيد الخدري عن النبي ﷺ قال: رأيت يوسفَ ليلة المعراج كالقمر ليلة البدر".

لفظ اکبرن کے بارے میں حضرت عبداللہؓ کا قول:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اکبرن کے معنی حضن منقول ہیں، ایک شاعر کہتا ہے ؎

یاتی النساء علیٰ أطهارهن ولا یاتی النساء إذا أکبرن اکبارا

اور اکبرن کو جب حضن کے معنی میں قرار دیا جائے تو ضمیر ھا ضمیر مصدری ہوگی، "أی أکبرن اکبارا" یا باسقاط جار حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب راجع ہوگی، "أی حضن لأجله من شدة شبقهن" یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کی وجہ سے شدت شہوت کی بنا پر ان کو حیض آ گیا، مگر ابوعبید نے اکبرن بمعنی حضن کو غلط قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ لغت سے یہ معنی معلوم نہیں ہوتے، رہا شاعر کا قول تو اسے کسی نے گھڑ لیا ہے، اور جہاں تک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا تعلق ہے تو اس کے مستند ہونے کا بھی کوئی صحیح ثبوت موجود نہیں ہے۔

"وانکر ابو عبیده مجیء اکبرن بمعنی حضن، وقال: لا نعرف ذالک فی اللغة، والبیت مصنوع مختلق لا یعرفه العلماء بالشعر..... و روایة ذالک ابن عباس انما اخرجها ابن جریر، وابن المنذر، و ابن ابی حاتم من طریق الصمد، وهو—وان روی ذالک عن ابیه علی عن ابیه ابن عباس لا یعول علیه فقد قالوا: انه علیه الرحمة لیس من رواة العلم". (روح المعانی ج۶ ص۴۲۰)

قطع ید کی تحقیق:- وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ یعنی جمال جہاں آراء کو دیکھنے میں اس طرح محو ہوئیں کہ ہوش وحواس جاتے رہے، نظر جمال یوسفؑ پر اس طرح جم گئی کہ کسی چیز کا خیال ہی باقی نہ رہا، اور چھریاں بجائے پھلوں وغیرہ پر چلنے کے ہاتھوں پر چل گئیں، جس سے ان کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور ان کو تکلیف کا احساس بھی نہ ہوا۔

''أی جرحنها بما فی أیدیهن من السکاکین لفرط دهشتهن وخروج حرکات جوارحهن عن منهاج الاختیار حتیٰ لم یعلمن بما عملن ولم یشعرن بما لم ما نالهن''. (روح ج۶ ص۴۲۰)

قطع کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہاتھ کاٹ کر الگ کر لئے ہوں جیسا کہ قتادہ سے منقول ہے بلکہ محض زخم کے لگ جانے پر بھی قطع کا اطلاق درست ہے، چنانچہ مفسرین نے قطعن کی تفسیر جرھن سے کر کے اسی بات کی جانب اشارہ کیا ہے۔

وَقُلْنَ حَاشَ لله حضرت یوسف علیہ السلام کو خداوند قدوس نے جہاں ظاہری حسن و جمال کا پیکر بنایا تھا وہیں عفت و پاک دامنی اور تقویٰ وطہارت کی دولت سے بھی بہرہ ور فرمایا تھا، عمائدین مصر کی عورتیں اس قسم کے حسن ظاہری و کمال باطنی کا تصور کب کر سکتی تھیں، چنانچہ جہاں انھوں نے جمالِ جہاں آراء کی تاب نہ لا کر عملاً اپنے ہاتھ کاٹ لئے، وہیں جمال معنوی نے کلمۂ تنزیہیہ ''حاش لله'' کے کہنے پر بھی مجبور کر دیا چنانچہ بلا اختیار یہ کلمہ ان کی زبان پر جاری ہو گیا۔

حاشیٰ، معاذالله کی طرح اسم برائے تنزیہیہ ہے اور اسے استثناء کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، عموماً اس کا استعمال حرف جر کے طور پر ہوتا ہے اور استثناء کا فائدہ دیتا ہے، اور اس کے بعد والا اسم مجرور ہوتا ہے جیسے ''کلکم مخطئ حاشا زیدٍ'' اور بعض نحویوں نے اسے فعل جامد قرار دیا ہے، اس صورت میں بھی یہ استثناء کا فائدہ دیتا ہے، اور اس کا مابعد اسم، مفعول بہ منصوب ہوتا ہے، جیسے ''اللّٰھم اغفرلی ولمن یسمع حاشا الشیطانَ''۔ (الاعراب القرآن ج۶ ص۴۲)

''مَاهٰذَا بَشَراً'' بشراً خبر ہے ما کی، ما اور لیس دونوں حال کی نفی کے لئے آتے ہیں اس لئے کہ اہل حجاز کے نزدیک ما کی خبر بھی لیس کی خبر کی طرح

منصوب ہوتی ہے، اور بقول بغوی خبر مجرور تھی، اصل عبارت ماھٰذا ببشر تھی، حرف جر کو حذف کر دینے کی وجہ سے خبر منصوب ہوگئی۔ (مظہری ج ۵ ص ۱۵۸، تفسیر کبیر ج ۹ ص ۱۰۳)

إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ کہنے کی وجہ:- حضرت یوسف علیہ السلام کے جیسا حسن و جمال اور ان کے جیسی عفت و عصمت کا ان عورتوں کے دل میں تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، اور چونکہ جمال ظاہری اور حسن معنوی ملائکہ کے خواص میں سے ہے اس لئے عمائدین مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے بشریت کی نفی کر کے ان کو ایک معزز فرشتہ قرار دے دیا۔

" لان هذا الجمال لم يعهد فى البشر وليس فوق البشر الا الملك، اولان الجمع بين الجمال الرائق و الكمال الفائق و العصمة البالغة من خواص الملائكة". (مظہری ج ۵ ص ۱۵۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر مصری عورتوں کی جو حالت ہوئی اسے دیکھ کر عزیز مصر کی بیوی بہت ہی محظوظ ہوئی اور اپنی کامیابی اور ان کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی، یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارے میں تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنائے ہوئے ہو، اب اس کو دیکھ کر تمہارا کیا حال ہے؟ بتاؤ میرا یہ عشق بجا ہے یا بے جا؟ اور تمہاری ملامت بے محل ہے یا برمحل؟

(قصص القرآن ج ۱ ص ۲۹۵)

قَالَتْ فَذَالِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَا آمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَلَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ۔

بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے مجھ کو اس کے واسطے اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی پھر اس نے تھام رکھا اور بیشک اگر نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑے گا اور ہوگا بے عزت۔

ترکیب ولغات:- قالت فذالکن الذی لمتننی فیه الآیۃ جملہ قالت .....مستانفہ جملہ ذالکن الذی محلاً مجزوم جواب ہے شرط مقدر کا، تقدیر عبارت ''ان کنتن قد لمتننی فذالک الذی لمتننی فیه'' ہے اور جملہ شرط و جواب شرط محلا منصوب، مقولہ ہے قول کا، جملہ لمتننی صلہ ہے الذی اسم موصول کا، جملہ روادتہ قسم مقدر کا جواب ہے، جملہ استعصم معطوف ہے جواب قسم پر اور جملہ ان لم یفعل .....مستانفہ ہے، جملہ آمرہ صلہ ہے ما اسم موصول کا اور عائد محذوف ہے، جملہ لیسجنن قسم کا جواب ہے، اور جواب شرط محذوف ہے، جس پر جواب قسم دلالت کر رہا ہے۔ اور جملہ یکونا من الصاغرین معطوف ہے جواب قسم ہے۔

''قالت فذالکن الذی لمتننی فیه'' فذالکن مبتدا اور اسم موصول الذی اس کی خبر ہے۔ زلیخا نے اسم اشارہ ذالک استعمال کیا جو کہ بعید کے لئے وضع کیا گیا ہے حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں سامنے موجود تھے۔ ایسا اس نے ان کی عظمت و بلندی کو ظاہر کرنے کیلئے کیا تا کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہونے

کا عذر ظاہر کر سکے۔ اور ابن عطیہ نے ذالک کا مشار الیہ حب یوسف کو بنا کر فیہ کی ضمیر کو حب یوسف کی طرف راجع قرار دیا ہے۔

فذالکن ،مبتدا والموصول خبره، اشارت اليه اشارة البعيد وان كان حاضرا تعظيما له و رفعا منه لتظهر عذرها فی شغفها، وجوز ابن عطية انْ يكون ذالک اشارة الى حب يوسف والضمير فی فيه عائد على الحب. (الدرالمصون ج:۶ص:۴۹۰)

اور ابن الانباری کے بقول زلیخا نے فذالکن الذی الخ اس وقت کہا ہے کہ جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام مجلس سے جا چکے تھے۔ لہذا اسم اشارہ بعید کا استعمال اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

قال ابن الانبارى اشارت لصيغة ذالک بعد انصرافه من المجلس. (کبیر ج۹ص۱۰۴)

زلیخا کا کھل کر اپنے عشق کا اقرار کر لینے کی وجہ:- "لمتنني"، لمتن بر وزن قلتن جمع مونث حاضر بمعنی ملامت اور لعن طعن کرنا، یعنی زلیخا نے جب دیکھا کہ اس پر لعن طعن کرنیوالی عورتیں خود ہی جمال یوسف کو دیکھ کر ہوش وحواس کھو چکی ہیں تو اس نے کھل کر اپنے عشق کا اقرار کر لیا کہ یہ وہی کنعانی غلام ہے جس کے بارے میں تم نے مجھ پر طعنہ زنی کی تھی، اب بتاؤ کہ میرا یہ عشق بجا ہے یا بیجا؟ اور تمہاری ملامت بے محل ہے یا بر محل؟

معنی استعصام کی تحقیق:- **ولقد راودته عن نفسی فاستعصم:** استعصام بمعنی تھام رکھنا، روک رکھنا، کمال پاکبازی کو اختیار کرنا۔ بقول ابن عطیہ: زلیخا یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے دام تزویر میں پھنسانا چاہا مگر اس

نے اپنے رب سے عصمت وحفاظت کی درخواست کی اور اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہا، اور میرے دام فریب میں نہ آیا۔

قال ابن عطیه ای طلب العصمة و تمسک بها و عصانی.

(البحر ج۵ ص۳۰۶)

اور صاحب کشاف اور ابوسعود وغیرہ نے استعصم کو مبالغہ کیلئے قرار دے کر یہ معنی بیان کئے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام عصمت وعفت کو طلب کرتے ہوئے فعل بد سے مکمل طور پر محفوظ رہے۔ یعنی وہ مامون ومحفوظ تو تھے ہی مزید برآں یہ کہ اپنی طرف سے کوشش میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیا۔

وفی الکشاف أن الاستعصام بناء أ میالغة بدل علی الامتناع البلیغ و التحفظ الشدید کأنه فی عصمة وهو مجتهد فی الاستزادة منها. (روح ج۶ ص۴۲۳/ ابوسعود ج۴ ص۲۷۳)

معارف وحقائق

زلیخا کا کھل کر دھمکی پر اتر آنے کی وجہ:- زلیخا نے جب دیکھا کہ اس کی ترکیب مکمل طور سے کامیاب ہوگئی ہے اور اس نے اعیان حکومت کی عورتوں کو اپنا ہمنوا پایا تو کھل کر دھمکی پر اتر آئی۔ اور کہنے لگی کہ یوسف نے اگر میری خواہش پوری نہ کی تو پھر اسے قید خانہ کی راہ دیکھنی پڑے گی۔ اور ذلت ورسوائی کا طوق اس کی گردن میں پڑے گا۔ چنانچہ قرآن کریم اس کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

ولئن لم یفعل ما آمره لیسجنن ولیکونا من الصاغرین :امر بمعنی کام، معاملہ، حالت، حکم۔ لفظ امر اقوال وافعال دونوں کیلئے بولا جاتا ہے۔

ما آمره :ایک قول یہ ہے کہ ما مصدریہ ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ موصولہ

ہے اور مفعول بہ ہے یفعل کا، اور ضمیر ھا ایک قول کے مطابق ما موصولہ کی جانب راجع ہے۔ جبکہ اسے الذی کے معنی میں قرار دیا جائے، اور قول ثانی یہ ہے کہ ھا ضمیر یوسف کی طرف راجع ہے۔ البتہ یوسف علیہ السلام کی طرف راجع قرار دینے کیلئے بقول زمخشری یہ ضروری ہے کہ ما کو مصدر یہ مانا جائے، بہر حال ھا ضمیر کا مرجع اگر اسم موصول کو مانا جائے تو ما آمرہ کے معنیٰ ما آمر بہ ہوں گے، اور یہ کہا جائے گا کہ امرتک الخیر کی طرح حرف جر کو حذف کر کے فعل کو ضمیر سے متصل کر دیا گیا ہے۔ اور اگر ما کو مصدر یہ قرار دیکر ھا ضمیر کا مرجع حضرت یوسف علیہ السلام کو بنایا جائے تو ما آمرہ، امری ایاہ کے معنی میں ہوگا، یعنی یوسف علیہ السلام نے اگر میرے امر کے موجب اور اس کے مقتضا پر عمل نہ کیا تو..... اور اس صورت میں مفعول اول محذوف ہوگا۔ تقدیر عبارت ما آمرہ بہ ہوگی۔ (الدر المصون ج ۶ ص ۴۹۱)

لیسجنن : سجن بمعنی قید خانہ جمع سجون، السجن اسم جامد ہے اور نام ہے اس مکان مخصوص کا جہاں آدمی کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے، لیسجنن نون ثقیلہ کے ساتھ، بجائے فعل معروف کے زلیخا نے شاہانہ طور وطریق کے مطابق فعل مجہول استعمال کیا ہے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ یوسف نے اگر میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو پھر قید خانہ میں داخل کئے جانے سے کوئی چیز مانع نہیں بن سکے گی، بلکہ کسی تاخیر کے بغیر ضرور بالضرور اس کا وقوع ہو کر رہے گا۔

بالنون المثقلة آثرت بناء الفعل للمفعول جريا على رسم الملوك، او ايها ما لسرعة ترتب ذلك على عدم امتثاله لامرها كانه لا يدخل بينهما فعل فاعل. (ابو سعود ج ۴ ص ۲۷۳)

ولیکونا : لیکونا اصل میں لیکونن نون خفیفہ کے ساتھ تھا، حالت وقف میں

نون کو تنوین سے مشابہت کی بنا پر الف کی شکل میں لکھ دیا گیا جیسا کہ " لنسفعا بالناصية " میں نون خفیفہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

من الصاغرين: باب سمع یسمع سے بمعنی ذلیل ورسوا۔ (مظہری ج۵ص۱۵۹)

لیسجنن میں نون ثقیلہ اور لیکونا میں نون خفیفہ لانے کی وجہ:-

"لیسجنن" میں نون ثقیلہ لانے اور "لیکونا من الصاغرین" میں نون خفیفہ لانے کی وجہ بقول بعض یہ ہے کہ قید خانہ میں ڈالا جانا متحقق اور یقینی تھا، اور کسی دوسری سزا کا دینا یقینی نہیں تھا جس سے ذلت کا ظہور ہوتا، اور بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ ذلت ورسوائی قید کے توابع میں سے ہے، اس لئے اسے نون خفیفہ کے ساتھ بیان کیا ہے، اور قید کے اصل ہونے کی بنا پر اسے نون ثقیلہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

واكدت السجن بالنون الثقيلة قيل : لتحققه وما بعده بالنون الخفيفة لانه غير متحقق و قيل : لان ذالک من توابع السجن ولوازمه فاكتفت في تاكيده بالنون الخفيفة بعد ان اكدت الاول بالثقيلة. (روح المعانی ج۶ص۴۲۴)

صاحب جاہ وثروت کا دستور:-

ولئن لم يفعل ما آمره: الخ، زلیخا کا یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈرانے اور دھمکانے کیلئے ہے، دنیا کا یہ دستور رہا ہے کہ غلط کار قسم کے لوگ جب کہ انہیں طاقت وقوت اور شوکت وحکومت بھی حاصل ہو تو پہلے وہ اپنا کام منت وسماجت سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بدنامی سے محفوظ رہیں، مگر جب اس طرح ان کا مقصد حاصل نہیں ہو پاتا تو پھر وہ طاقت وقوت اور ظلم وتعدی کی راہ اپناتے ہیں، یہاں زلیخا نے بھی ٹھیک اسی طرز عمل کو اختیار کیا ہے۔

قید خانے کی تاریخ:- قید خانے کی ابتدا کب ہوئی اور سب سے پہلے کس نے اسے بنایا اس کا پتہ لگانا تو دشوار ہے، البتہ اتنی بات محقق اور ثابت ہے کہ قید خانہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اور زمانۂ قدیم سے اس کا رواج رہا ہے۔ زلیخا کے قول لیسجنن اور بعد کے واقعات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ملک مصر میں باقاعدہ قید خانے وغیرہ موجود تھے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْ إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ ۔

یوسف بولا! اے رب مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف یہ بلاتی ہیں مجھ کو اور اگر تو نہ دفع کرے گا مجھ سے ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل۔

ترکیب ولغات:- جملہ "قال" مستانفہ اور جملہ نداء "رب" جملہ معترضہ دعائیہ ہے، جملہ "السجن احب" محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، اور جملہ "یدعوننی الیہ" صلہ ہے ما اسم موصول کا، "الا تصرف عنی" محلاً منصوب معطوف ہے قول کے مقولہ پر، اور "أصب الیھن" بغیر فاء شرط کا جواب ہے اور جملہ "اکن من الجاھلین" جواب ہے اور معطوف ہے جملہ أصب پر۔

رب السجن: جمہور کے نزدیک رب بکسر الباء ہے کیونکہ وہ مضاف ہے یائے متکلم کی جانب، اور السجن بکسر السین ورفع النون مبتدا ہے اور احب اس کی خبر ہے، السجن کے معنی دخول السجن کے ہیں، اور بعض قراء نے اسے رب السجن بضم الباء والنون پڑھا ہے۔ اس صورت میں رب مبتدا اور السجن اضافت کی بنا پر مجرور ہوگا، اور احب اس کی خبر ہوگی، اور معنیٰ یہ ہوں گے کہ صاحب سجن کی ملاقات اور اس کی سختیاں میرے نزدیک پسندیدہ ہیں، اور عثمان ان کے مولیٰ طارق، زید بن علی، زہری، ابن ابی اسحاق، ابن ہرمز، اور یعقوب نے بفتح السین، السجن مصدر پڑھا ہے،

یعنی قید ہو جانا میرے نزدیک پسندیدہ ہے، ہر صورت میں اِلَیَّ متعلق ہوگا احب کے اور یہاں تفضیل یعنی زیادتی کے معنی مراد نہیں ہیں، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک لمحہ کیلئے بھی زلیخا اور اعیان مصر کی عورتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی، اور نہ ان کی طرف ان کا میلان ہوا تھا بلکہ معاملہ یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے دو ایسی چیزیں پیش آئیں کہ ان میں سے ایک دنیا اور آخرت دونوں کیلئے مضر تھی، اور دوسری صرف دنیا کے اعتبار سے باعث مضرت تھی، تو انہوں نے دوسری کو پہلی کے مقابلہ میں ترجیح دیا، تا کہ آخرت مکمل طور پر محفوظ رہے، جو ابدی اور دائمی ہے۔

العامة على كسر الباء لانه مضاف لياء المتكلم والسجن بكسر السين و رفع النون على أنه مبتدا والخبر "أحب" والسجن الحبس و المعنىٰ : دخول السجن، و قرأ بعضهم رب بضم الباء و جر النون على ان "رب" مبتدأ والسجن خفض بالاضافة و "احب" خبره والمعنىٰ: ملاقاة صاحب السجن ومقاساته احب الى . وقرأ عثمان ومولاه طارق و زيد بن على والزهرى وابن اسحاق وابن هرمز و يعقوب بفتح السين "والسجن" مصدر اى الحبس احب الى و"الى" متعلق ب "أحب" و فى الحقيقة ليست هنا افعل على بابها من التفضيل لأنه لم يحب ما يدعو نه اليه قط وانما هذان شران فأثر احد الشرين على الآخر. (الدر المصون ج۶ ص۴۹۳)

معارف و حقائق

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا کا حاصل:- مما یدعوننی الیه: ابتداء میں معصیت کی دعوت دینے والی تنہا زلیخا تھی مگر بعد میں اعیان مصر کی عورتیں بھی اس

کی ہمنوا بن گئی تھیں، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے بصیغہ جمع یہ دعا فرمائی کہ باری تعالیٰ مجھے جیل کی سختیاں تو گوارا ہیں مگر میں ان عورتوں کے نفسانی مشورہ پر عمل کروں یہ گوارا نہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے قول کا حاصل یہ ہے کہ جیل خانہ اگرچہ ناگوار تر اور انتہائی سختی و مصیبت کی جگہ ہے مگر معصیت کا صدور اس سے کہیں زیادہ سخت ناگوار اور ناقابل برداشت شئی ہے، زلیخا نے تو جیل خانہ میں ڈالنے کی دھمکی یہ سمجھ کر دی تھی کہ یوسف جیل کی سختیوں کے تصور سے گھبرا کر اس کی ہمنوائی کیلئے تیار ہو جائیں گے مگر دنیا کی دلدادہ اور اس کی عیش و عشرت کو سب کچھ سمجھنے والی اس احمق ترین عورت کو کیا پتہ تھا کہ یوسف کے سامنے ایک اور دنیا اور اس کی غیر فانی لذات اور نعمتیں ہیں جن کے لئے اس دنیائے فانی کی تمام تر راحت و آسائش اور لذتوں کو قربان کیا جا سکتا ہے، چنانچہ زلیخا کی دھمکی سے ایک لمحہ کیلئے متاثر ہوئے بغیر حضرت یوسف علیہ السلام نے معصیت پر مصیبت کو ترجیح دیتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں یہ درخواست پیش کر دی کہ باری تعالیٰ تو ان عورتوں کے مکر و فریب سے میری حفاظت فرما خواہ اس کے لئے قید خانہ کی مصیبت ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔

والا تصرف عنی کیدھن "الا" مرکب ہے، ان شرطیہ اور لا نافیہ سے، نون کو لام میں مدغم کر دیا تو اِلّا ہو گیا۔ (روح ج ۶ ص ۴۲۶)

أصب الیھن: أصب بتخفیف الباء مشتق ہے صبا یصبو سے بمعنی مائل ہونا، خواہش کرنا، اہل عرب پُروا ہوا کو صبا اسی بنا پر کہتے ہیں کہ اس کے فرحت بخش اور سرور و کیف پیدا کرنے والی ہونے کی بنا پر دلوں میں اس کا شوق اور اس کی جانب میلان ہوتا ہے۔ (الدر المصون ج ۶ ص ۴۹۳)

اور ایک قرأت میں أصب باء کی تشدید کے ساتھ آیا ہے۔ اس صورت میں وہ

مشتق ہوگا صببت صبابة سے بمعنی شوق اور میلان کی زیادتی۔ (روح ج۶ ص۴۲۶)

واکن من الجاهلین : یعنی ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو اپنے علم کے مقتضا پر عمل نہیں کرتے۔ قرآن کریم کے اس جملہ سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ مومن اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے، **قال البغوی فیه دلیل علی ان المومن اذا ارتکب ذنبا یرتکب عن جهالة.** (مظہری ج۵ ص۱۶۰)

واکن من الجاهلین: کہہ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار نہ کرنا جاہلین کا طریقہ وشعار ہے۔

بعض عارفین کا قول ہے کہ مصیبت کو معصیت پر اختیار کرنا صدیقین کا شیوہ ہے، اور اپنے تقویٰ اور عمل پر بھروسہ نہ رکھنا بلکہ معصیت کے دواعی و اسباب سے بھاگتے رہنا سعادت مندوں کا شعار ہے۔ (ماجدی ج۲ ص۶۰۰)

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا عصمت کے منافی ہرگز نہیں:- حضرت یوسف علیہ السلام کی مذکورہ دعا عصمت کے منافی ہرگز نہیں کیونکہ یہ عصمت بھی تو حفاظت خداوندی ہی کی بدولت ہے، چونکہ انبیاء علیہم السلام کی نظر اصل مؤثر کی طرف ہوتی ہے، اس لئے ان کو اپنی عصمت پر اعتماد اور ناز نہیں ہوتا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قول **والا تصرف**، تو اس سے مقصود **اصرف عنی** ہے، (یعنی تو ان کے مکر کو مجھ سے دفع کر دے)۔ (بیان القرآن ج۵ ص۷۸)

مصیبت کو معصیت پر ترجیح دینا منتہائے کمال ہے:- حضرت یوسف علیہ السلام نے معصیت خداوندی کے مقابلہ میں قید و بند کی تکلیف کو اختیار فرمایا تو یہ درحقیقت یہ ان کے اتقا کا منتہائے کمال ہے، کہ جوان اور حسن و خوبصورتی کی پیکر امیر زادی

جسے مالکۂ مجازی ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے اور وہ خود دعوت طرب ونشاط دے رہی ہے، اور آپ بھی انتہائی حسین وخوبصورت جوان رعنا ہیں مگر خوف خداوندی کا غلبہ اور اس کے اجر وثواب کی امید پر تمام لذتوں کو چھوڑ کر قید خانہ کی مصیبت کو اختیار کر لیتے ہیں، اسے منتہائے کمال تقویٰ وعصمت وعفت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

واختار السجن علی ذالک وهذا فی غاية مقامات الكمال أنه مع شبابه و جماله و كماله و تدعوه سيدته وهي امرأة عزيز مصر وهي مع هذا في غاية الجمال والكمال والرياسة و يمتنع من ذالک و يختار السجن علی ذالک خوفا من الله و رجاء ثوابه. (ابن کثیر ج۲ ص۴۳۸)

تقویٰ اور پرہیز گاری پر ناز واعتماد نہیں کرنا چاہئے:- کمال تقویٰ وپرہیز گاری، اور عفت وعصمت کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک لمحہ کیلئے بھی اس پر ناز واعتماد نہیں کیا، بلکہ خواہشات نفسانی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے ہی حفاظت درخواست کی، جب نبی معصوم کا حال یہ ہے تو پھر کسی اور کیلئے یہ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے تقویٰ پر ناز اور اعتماد کرے۔

فائدہ:- یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے متقی اور پرہیز گار شخص نے جب بھی اپنے تقویٰ اور پرہیز گاری پر ناز کیا ہے تو اسے ذلت ورسوائی کا ہی سامنا کرنا پڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے سچے پیروکاروں نے ہمیشہ خداوند قدوس کے فضل وکرم کا ہی سہارا لیا ہے، کبھی کسی موقع پر ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے تقویٰ اور پرہیز گاری پر اعتماد نہیں کیا ہے، چنانچہ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ عورت بے طرح پیچھے پڑی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم واستقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ

احدیت میں درخواست کی کہ مجھے ان کے مکر وفریب سے بچایئے، اگر اس سلسلہ میں قید ہونا پڑے تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں، اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائیں گے تو ڈر ہے کہ بے عقل ہو کر ان کی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں، یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلا دیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے، اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ عصمت کا جو منشا ہے (یعنی حفاظت وصیانت الٰہی) اسی پر نظر رکھتے ہیں۔

رب السجن الخ قید کی طلب نہیں استقامت کا اعلان ہے:-

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جملہ "السجن احب الی مما یدعوننی الیہ" ان کی علوشان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضا وتسلیم کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔ غور کیجئے عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد وچاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف علیہ السلام کو رام کیا جا سکے۔ پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی۔ اور انہوں نے اپنے ممکن داؤں گھات یوسف پر استعمال کئے مگر پھر بھی ناکامی رہی۔ اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسف اس کو شادکام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائے گا ایسی حالت میں ایک باخدا صاحب عزیمت واستقامت ہستی اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیض وغضب پر غالب رکھنے والا انسان اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عمل بد کے مقابلہ میں زنداں کو ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے قید وبند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے۔، زنداں کے شوق کا اظہار ہے۔ بلاء ومصیبت کو دعوت ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلان حق اور خدا ترسی کا صحیح درجہ ہے۔ یوسف نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ عزیز

کی بیوی کو مخاطب کرے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں تخاطب کا موقع دے بلکہ اس نے اپنے خدا کو پکارا مگر ان گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکر وفریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہیں۔ اسی طرح ان کی دھمکی اور اس کا عذاب بھی میرے ارادۂ حق اور خداترسی کو باطل نہیں کر سکتا۔ یہ (زلیخا) کہتی ہے کہ یا یوسف مجھ کو شاد کام کرے ورنہ جیل جائے تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادۂ بد کے مقابلہ میں لاکھ بار ترجیح دوں گا۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۲۹۹)

عرش الٰہی کے سائے میں:- دنیا میں جن لوگوں نے جوانی کا زمانہ اللہ کے تقویٰ اور عفت و پاکدامنی کے ساتھ گذارا کل قیامت کے دن جبکہ سایہ عرش الٰہی کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اس دن وہ لوگ سایۂ الٰہی کی پُر بہار چھاؤں میں ہوں گے، چنانچہ صحیحین کی روایت ہے کہ سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے عرش کا سایہ عطا کریں گے، جس دن کہ سایۂ عرش خداوندی کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا: (۱) عادل بادشاہ کو (۲) اور اس نوجوان کو جس کی اٹھان اللہ تعالیٰ عبادت و بندگی میں ہوئی (۳) اس شخص کو جس کا دل مسجد سے نکلنے کے بعد مسجد ہی میں لگا رہتا ہے۔ تا آنکہ پھر اس میں لوٹ آئے، یعنی ایک نماز کی ادائیگی کے بعد اسے دوسری نماز کا انتظار رہتا ہے اور عبادت الٰہی سے کبھی اس کا دل غافل نہیں ہوتا، (۴) اور ان دو شخصوں کو جنہوں نے محض اللہ کی رضا کیواسطے آپس میں دوستی کی، اسی پر ان کا اجتماع ہوا اور اسی کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا بھی ہوئے۔ (۵) اس آدمی کو جس نے صدقہ وخیرات اس طرح چھپ چھپا کر کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ علم نہ ہو سکا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے (۶) اور اس شخص کو جسے کسی صاحب مرتبہ اور حسین وجمیل عورت نے عیش وطرب اور نشاط کی دعوت دی مگر اس نے صاف جواب دیدیا کہ

عذاب خداوندی اور خدا کا خوف میرے لئے مانع ہے، میں تھوڑی سی فانی لذت کے واسطے عذاب الٰہی کو دعوت دوں یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا، (۷) اور اس آدمی کو جو تنہائی میں اللہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتا ہے۔

و فی الصحیحین أن رسول اللہ ﷺ قال سبعة یظلهم الله فی ظله یوم لا ظل الا ظله : امام عادل، و شاب نشأ فی عبادة الله، و رجل قلبه معلق بالمسجد اذا خرج منه حتی یعود الیه ، ورجلان تحابا فی الله اجتمعا علیه و تفرقا علیه، و رجل تصدق بصدقة فأخفاها حتی لا تعلم شماله ما انفقت یمینه، و رجل دعته امرء ة ذات منصب و جمال فقال : انی اخاف الله، و رجل ذکر الله خالیا ففاضت عیناه.

(بخاری ۶۶۰/ مسلم ۱۰۳۱)

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ.

سو قبول کرلی اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب البتہ وہی ہے سننے والا خبردار پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کو ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت تک۔

ترکیب:- استجاب لہ ربہ: پورا جملہ معطوف ہے، جملہ قال پر اور صرف عنہ معطوف ہے جملہ استجاب پر اور انہ ھو السمیع العلیم جملہ تعلیلیہ ہے۔ جملہ بدالھم معطوف ہے جملہ صرف پر اور جملہ رأوا صلہ ہے اسم موصول حرفی ما کا اور جملہ لیسجننہ جواب ہے قسم مقدر کا اور جملہ قسم اور اس کا جواب محلاً منصوب معمول ہے قول مقدر کا جو لھم کی ضمیر غائب سے حال واقع ہو رہا ہے، تقدیر عبارت بدالھم ان یسجنوہ قائلین واللہ لیسجننہ حتیٰ حین ہوگی۔

معارف و حقائق

فاستجاب لہ ربہ فصرف عنہ کیدھن انہ ھو السمیع العلیم یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے والا تصرف عنی کیدھن کے ضمن میں ثبات قدمی اور عفت و عصمت کی جو دعاء کی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبولیت سے نوازا، اور ان کو عفاف و عصمت کے مقام بلند سے ذرا بھی ہٹنے نہ دیا، چنانچہ انھوں نے

قید خانہ کی مشقت کو برداشت کرنا منظور کرلیا مگر اس لذت کے اختیار کرنے پر ذرا بھی آمادہ نہ ہوئے جو متضمن بہ معصیت تھی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ دعاؤں کا بڑا سننے والا ہے، اور دلوں کے احوال وکوائف اور اسرار سے مکمل طور پر واقف ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتّٰى حِيْنٍ (۱) بدا کا فاعل وہ ضمیر ہے جو السجن بفتح السین کی جانب راجع ہے اس صورت میں ظهر لهم حبسه ہوں گے (۲) یا یہ کہ بدا کا فاعل اس مصدر کی ضمیر ہے جو فعل بدا سے مفہوم ہو رہا ہے تقدیر عبارت "بدا لهم بدء" ہوگی۔

كما في قول الشاعر: بدالک في تلک القلوص بداء

(۳) یا یہ کہ فاعل مضمر ہے جس پر سیاق کلام دلالت کر رہا ہے أی بدا لهم رای (۴) یا یہ کہ ليسجننه نفس جملہ، بدا کا فاعل ہے مگر یہ کوفیین کے اصول پر ہے، حتیٰ حین، حتیٰ اپنے ماقبل کی غایت کیلئے ہے اور جمہور کے نزدیک ليسجنن جواب ہے قسم محذوف کا، اور قسم اور جواب قسم دونوں قول مضمر کا معمول ہیں، اور وہ قول مضمر حال ہونے کی بناء پر محلاً منصوب ہے، تقدیر عبارت ظهر لهم كذا قائلين: والله ليسجننه حتیٰ حين ہوگی، اور حسن نے تائے خطاب کے ساتھ لتسجننه پڑھا ہے، اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ ان کے بعض نے بعض سے خطاب کرتے ہوئے کہا: تم اسے ایک مدت تک کیلئے قید خانہ میں ڈال دو، یا بطور تعظیم خطاب ہے عزیز مصر کو۔

الأول انه ضمير تعود على السجن بفتح السين اى ظهر لهم حبسه، والثانى ان الفاعل المصدر المفهوم من الفعل وهو بداء، اى بدى لهم بداء، قال الشاعر: بدالک فى تلک القلوص بداء " والثالث ان

الفاعل مضمر يدل عليه السياق، اى بدالهم راى، والرابع ان نفس الجملة من "ليسجننه" هى الفاعل و هذا من اصول الكوفيين . و حتى غاية لما قبله، و قوله ليسجننه على قول الجمهور جواب لقسم محذوف وذالک القسم و جوابه معمول بقول مضمر و ذالک القول المضمر فى محل نصب على الحال .اى ظهر لهم كذا قائلين : والله ليسجننه حتى حين ، و قرأ الحسن لتسجننه بتاء الخطاب و فيه تاويلان أحدهما خاطب بعضهم بعضاً بذالک ، والثانى ان يكون خوطب به العزيز تعظيما له. (الدرالمصون ج۶ ص۴۹۴، ابوسعود ج۴ ص۲۷۴)

فاستجاب له ربه الخ کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تقویٰ وطہارت، اور دلائل وشواہد سے اگر چہ ان کی عفت و پاکدامنی اور براءت ونزاہت ثابت ہو چکی تھی، مگر زلیخا پر عشق کا بھوت سوار تھا جو مسلسل عزیز مصر اور اس کے اعزہ واقارب کیلئے ذلت ورسوائی میں اضافہ کا سبب بنتا جا رہا تھا، اور بقول مظہری وابوسعود وغیرہما، عزیز مصر عورت کا بے دام غلام تھا، اور بقول قرطبی وکبیر وغیرہ کوئی غیرت مند آدمی بھی نہیں تھا لہذا زلیخا کو سزا دینے کے بجائے اس نے اور اس کے مشیروں نے یہی مناسب سمجھا کہ یوسف کو ایک زمانہ تک کے واسطے قید خانہ میں ڈال دیا جائے، تا کہ نظر سے دور ہو جانے کی وجہ سے زلیخا کے دل سے ان کا خیال محو ہو جائے، اور دوسرے لوگ بھی واقعہ کو بھول جائیں، اور یہ باور کرلیں کہ قصور یوسف علیہ السلام ہی کا تھا اور زلیخا کا مقصد یہ رہا ہوگا کہ قید وبند کی سختیاں اٹھا کر شاید یوسف علیہ السلام نرم پڑ جائیں اور پھر اس کا مطلب حاصل ہو جائے، بہر حال یوسف کو قید خانہ بھیج دیا گیا اور ایک بے خطا کو خطا کار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا تا کہ

عزیز کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔

قید خانہ میں رہنے کی مدت:- حضرت یوسف علیہ السلام کی مدت قید کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال تفسیر کی کتابوں میں منقول ہیں، مگر کسی بھی قول کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جا سکتا، البتہ زمانۂ قدیم میں دستور تھا کہ بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتا قید خانہ میں رکھتا اور جب چاہتا اسے آزاد کر دیتا، یہاں ''حتی حین'' کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اتنے زمانہ تک قید خانہ میں رکھنا مراد ہے کہ لوگوں کی چے میگوئیاں ختم ہو جائیں اور لوگ واقعہ کو بھول جائیں۔ (کبیر ج۹ ص۱۰۷)

فائدہ:- سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کتنے زمانہ تک قید و بند کی مصیبت میں مبتلا رہے اس کی کوئی قطعی اور یقینی مدت تو معلوم نہیں ہے، مگر واقعہ جس نوعیت کا تھا اور جس مقصد سے ان کو قید خانہ میں ڈالا گیا تھا اس کے لئے ایک طویل مدت درکار تھی، کیوں کہ غیر معمولی واقعات لوگوں کے ذہنوں سے بہت جلد محو نہیں ہوا کرتے، اور یہاں مقصد ہی یہی تھا کہ جو کچھ پیش آ چکا ہے وہ لوگوں کے ذہنوں سے فراموش ہو جائے، اور عزیز مصر کی بیوی پر بدنامی کا جو دھبہ لگ چکا ہے وہ دھل کر صاف ہو جائے۔

(چوتھے رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّيْ أَرَانِيْ أَعْصِرُ خَمْراً وَ قَالَ الْآخَرُ إِنِّيْ أَرَانِيْ أَحْمِلُ فَوْقَ رَاسِيْ خُبْزاً تَاكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبِّئْنَا بِتَاوِيْلِهٖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ .

اور داخل ہوئے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ نچوڑتا ہوں شراب اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اس میں سے بتلا ہم کو اس کی تعبیر ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا۔

ترکیب:- جملہ دخل ..... فتیان معطوف ہے جملہ مستانفہ محذوفہ پر تقدیر عبارت فسجن یوسف و معه دخل السجن فتیان" ہوگی، "قال احدهما" جملہ مستانفہ اور جملہ "إنی أرانی" محلا منصوب مقولہ ہے قول کا جملہ "أرانی أعصر" محلا مرفوع خبر ہے، ان کی "اعصر خمراً" محلا منصوب حال ہے اور بعضوں نے اسے "أرانی" کا مفعول ثانی بھی قرار دیا ہے، کیونکہ یہ رویت، رویت قلبیہ کی قسم سے ہے، جملہ "قال الآخر" معطوف ہے جملہ "قال احدهما" پر اور جملہ "ارانی" محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "أرانی أحمل" محلا مرفوع خبر ہے اِنَّ کی، اور جملہ "انی أرانی ..... خبزاً" محلا منصوب حال ہے یا مفعول بہ ثانی ہے "تاکل الطیر منه" محلا منصوب صفت ہے، "خبزاً" کی، جملہ "نبئنا بتاویله" مستانفہ قول کے قائم مقام ہے اور جملہ "نراک من المحسنین" محلا مرفوع خبر ہے اِنَّ کی "دخل معه السجن فتیان" فتیان تثنیہ ہے "فتیٰ" کا بمعنی جوان۔

معارف و حقائق

یعنی جس زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں داخل کئے گئے ٹھیک اسی وقت یا کچھ آگے پیچھے دو جوان اور بھی اسی قید خانہ میں لائے گئے۔ یہ دونوں ولید بن ریان بن شروان شاہ مصر کے غلام تھے، ان میں سے ایک شاہی باورچی خانہ کا نگراں اور دوسرا بادشاہ کا ساقی تھا، بقول بغوی ان دونوں پر الزام یہ تھا کہ اعیان مصر کی سازش سے ان دونوں نے رشوت لے کر بادشاہ کے کھانے میں زہر ملا کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، معاملہ چونکہ زیر تحقیق تھا اس لئے دونوں کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا تھا "قال احدهما" مراد بادشاہ کا ساقی ہے، "انی ارانی اعصر خمراً" أرانی معنی میں "رأیتنی فی المنام" کے ہے، یعنی دیکھا میں نے خواب میں، صورت ماضیہ کے استحضار کے واسطے فعل مضارع ارانی ذکر فرمایا، اعصر میں نچوڑتا ہوں، خمر، شراب انگوری، خمر اصل میں انگور کے کچے پانی کا نام جب کہ وہ نشہ آور ہو جائے، لیکن ہر نشیلی چیز کو خمر کہہ دیتے ہیں۔

واعلم ان كون الخمر اسماء للنئى من ماء العنب اذا صار مسكرا حقيقة بالاتفاق من ائمة اللغة حتى اشتهر استعماله فيه و غيره سمى باسامى مختلفة مجازاً. (لغات القرآن ج ۲ ص ۳۲۴ بحوالہ عقود الجواہر المنیفہ ج ۲ ص: ۱۰۸، طبع مصر)

خمر کی وجہ تسمیہ:- خمر یا تو اختمار سے ماخوذ ہے جس کے معنی خمیر اٹھنے کے ہیں چونکہ اس میں بھی خمیر اٹھ کر جوش پیدا ہوتا ہے اور جھاگ آنے لگتا ہے۔ اس لئے اس کا نام خمر ہوا، یا مخامرۃ سے مشتق ہے جس کے معنی چھپا لینے کے ہیں چونکہ یہ حواس کو گم کر دیتی ہے اور عقل و ہوش کو چھپا دیتی ہے، اسلئے خمر سے موسوم ہوئی۔

(لغات القرآن ج ۲ ص ۳۲۴)

خمراً بمعنیٰ عنباً ہے۔عنب (انگور) چونکہ مایؤول کے اعتبار سے خمر بن جاتا ہے،اس لئے بجائے عنباً کے بطور مجاز مرسل خمراً استعمال فرمایا۔ (روح ج۶ ص۴۲۹)

اور ایک قول یہ ہے کہ اہل غسان اور ازدعمان عنب کو خمر کہتے ہیں۔ معتمر کہتے ہیں کہ میری ایک دیہاتی سے ملاقات ہوئی جو ایک ٹوکرے میں انگور لئے جارہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ کیا لئے جارہے ہو تو اس نے جواب دیا کہ خمر۔

وقیل : بالخمر : العنب حقیقة فی لغة غسان وازدعمان و عن المعتمر لقیت اعرابیا حاملا عنبا فی وعاء فقلت: ما تحمل؟ فقال خمراً . (الدرالمصون ج۶ ص۴۹۶)

اور حضرت ابی بن کعب وعبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قرأت میں بجائے خمراً کے اعصر عنباً ہے۔مگر مناسب یہ ہے کہ عنباً کو خمراً کی تفسیر قرار دیا جائے۔کیونکہ عنباً والی قرأت مصحف کی کتابت کے خلاف ہے۔

وقرأ ابی و عبدالله اعصر عنباً و ینبغی ان یحمل ذلک علی التفسیر لمخالفة سواد المصحف. (البحر ج۵ ص۳۰۸)

وقال الآخر سے مراد خباز ہے جو شاہی باورچی خانہ کا نگراں تھا: **انی أرانی احمل فوق راسی خبزاً**،اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں خبزاً کے بجائے ثریداً ہے،مگر بقول ابن عطیہ جس طرح عنباً تفسیر ہے خمراً کی، ایسے ہی ثریداً بھی اصل قرأت نہیں بلکہ خبزاً کی تفسیر ہے (بحوالہ سابق) خبز کی جمع أخباز آتی ہے۔

تاکل الطیر منه: صفت ہے خبزاً کی اور فوق ،حمل کا ظرف بھی ہوسکتا ہے۔اور اسے خبزاً سے حال قرار دے کر محذوف کے متعلق بھی بنایا جاسکتا ہے۔

تاکل الطیر صفة لخبزاً و فوق یجوز ان یکون ظرفا للحمل وان یتعلق بمحذوف حال من "خبزاً". (الدرالمصون ج۶ص۴۹۶)

نبئنا بتاویله: یعنی ہم نے جو کچھ دیکھا ہے تو اس کی تفسیر ہم سے بیان کر، قائم مقام اسم اشارہ کے ہو کر ضمیر ھا راجع ہے دونوں خوابوں کی طرف، اور بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ہر ایک نے الگ الگ اپنے خواب کی تعبیر کا سوال کیا تھا، گویا ہر ایک نے یہ کہا" نبئنا بتاویل ما رأیت "اس لئے ضمیر ھا کو مفرد ذکر کیا گیا۔ (بحوالہ سابق) لفظ تاویل کی تشریح آیت ۶ کے بیان میں گذر چکی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو محسن کہنے کی وجہ:- انا نراک من المحسنین: ظاہری حسن وجمال کی طرح باطنی فضل وکمال بھی چھپنے اور پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام جس وقت قید خانہ میں داخل ہوئے ہیں، تو اس وقت وہاں قیدیوں میں سے کوئی ایک بھی موحد اور مسلمان نہیں تھا، مگر چند ہی دنوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل وکمال سے ہر ایک متاثر اور ان کا گرویدہ بن گیا جس کی وجہ سے قیدی اپنے راز کی باتیں حضرت یوسف علیہ السلام سے ذکر کیا کرتے تھے، چنانچہ وہ دونوں قیدی جو ان کے ساتھ ہی قید خانہ میں داخل ہوئے تھے، جب انہوں نے خواب دیکھا تو تعبیر کیلئے ان کے پاس آئے، اور انا نراک من المحسنین کہتے ہوئے اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کی، ان کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آپ ہم دونوں کے خواب کی تعبیر بتادیجئے کیوں کہ آپ صحیح تعبیر بتانے والوں میں سے ہیں، یا یہ کہ آپ صاحب علم ہیں (پہلے ترجمہ کے مطابق محسن سے مراد اچھی تعبیر دینے والا، اور دوسرے ترجمہ کے مطابق صاحب علم ہوگا) یا انا نراک من المحسنین کا مفہوم یہ ہے کہ آپ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، لہذا ہم

پر بھی احسان کیجئے اور اگر آپ کو معلوم ہو تو ہمارے خوابوں کی صحیح تعبیر بتا دیجئے۔

ای من المحسنین تاویل الرؤیا او من العالمین والاحسان بمعنی العلم و انما قالا ذالک لانهما رأیاه فی السجن یذکر الناس و یعبر رؤیاهم او من المحسنین الی اهل السجن فاحسن الینا بتاویل ما رأینا ان کنت تعرفه. (مظہری ج۵ص۱۶۲)

قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن عمل:- حضرت ضحاک بن مزاحم سے یہ سوال کیا گیا کہ **انا نراک من المحسنین** میں جس احسان کا تذکرہ ہے وہ کیا تھا؟ تو ضحاک نے جواب دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بیمار قیدیوں کی عیادت اور ان کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے (اور جیلر نے عملاً چونکہ جیل کا سارا انتظام آپ کے سپرد کر دیا تھا) جس کی بنا پر اگر کسی قیدی کی جگہ تنگ ہوتی تو آپ اسے کشادہ جگہ دیدیا کرتے تھے۔ اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو وہ چیز اس کے لئے فراہم کر دیا کرتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ تعالیٰ کی عبادت بھی خوب کرتے تھے اور پوری پوری رات نماز میں مشغول رہا کرتے تھے۔

روی ان الضحاک بن مزاحم سئل عن قوله " انا نراک من المحسنین " ما کان احسانه ؟ قال کان اذا مرض انسان فی السجن عاده و قام علیه، واذا ضاق علیه المجلس وسع له، واذا احتاج جمع له شیئا، وکان مع هذا یجتهد فی العبادة و یقوم اللیل کله للصلوٰة.

(مظہری ج۵ص۱۶۲، ابوسعود ج۴ص۲۷۶)

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن عمل کے بارے میں حضرت قتادہ سے منقول ہے کہ قید خانہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو بے حد غمگین رہا کرتے تھے جن

کا ہر قسم کا سہارا ٹوٹ چکا تھا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور آس بندھائی اور فرمایا: غم نہ کرو، خوش وخرم رہو اور صبر کرو، تم کو اس پر اجر وثواب ملے گا، قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس اخلاق کریمانہ اور غم خواری کو دیکھ کر کہا کہ خدا تم کو برکت دے تم کس قدر صاحب حسن و جمال ہو اور تمہارا اخلاق کتنا عمدہ اور اعلیٰ ہے۔ تمہارے ساتھ رہ کر ہمیں بھی برکت اور خوش خرمی حاصل ہوگی۔ بھلا یہ تو بتاؤ تمہارا نام اور حسب و نسب کیا ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا: میں یوسف بن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ اسحٰق (۱) بن خلیل اللہ ابراہیم ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال و اعلیٰ کردار کو دیکھ کر جیلر نے کہا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو آزاد کر دیتا، مگر یہ میرے اختیار میں نہیں ہے البتہ میں آپ کے حق مصاحبت کو اچھی طرح ادا کرنے کی کوشش کروں گا، آپ کے لئے اس بات کی پوری آزادی ہے کہ جیل خانہ کی جس کوٹھری میں چاہیں سکونت اختیار کریں۔

وعن قتادة كان في السجن ناس قد انقطع رجائهم و طال حزنهم فجعل يقول: ابشروا واصبروا توجروا، فقالوا بارك الله عليك ما احسن وجهك، وما احسن خلقك، لقد بورك لنا في جوارك، فمن انت يا فتىٰ؟ فقال انا يوسف بن صفي الله يعقوب بن ذبيح الله اسحٰق بن خليل الله ابراهيم، فقال عامل السجن لو استطعت

---

(۱) قرآن کریم کی آیات وصحیح روایات اور خود تورات کی شہادت سے یہ بات ثابت ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق نہیں بلکہ حضرت ابراہیم کے پہلے صاحبزادے حضرت اسماعیل ہیں جو ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ کے بطن سے تھے، جن کی اولاد میں نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔
(تفصیل کے لئے دیکھئے ذبیح کون؟ مؤلفہ مولانا حمید الدین فراہیؒ)

خلیت سبیلک و لکنی احسن جوارک تمکن ای بیوت السجن شئت. (ابوسعود ج ۴ ص ۲۷۶، مظہری ج ۵ ص ۱۶۲)

لطیفہ:- حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید خانہ میں داخل ہونے والے دونوں قیدیوں کو ان سے والہانہ تعلق ہوگیا، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کرتے ہوئے دونوں نے کہا: ہم کو تو آپ سے بڑی محبت اور بے انتہا تعلق ہوگیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا: خدا تم کو برکت عطا کرے، تم مجھ سے محبت ہرگز نہ کرنا کیونکہ جب بھی مجھ سے کسی نے محبت کی ہے تو ضرور مجھ پر کوئی افتاد پڑی ہے، چنانچہ بچپنے میں پھوپھی نے مجھ سے محبت کی تو مصیبت میں مبتلا ہوا۔ یعنی چوری کا الزام لگا، والد محترم نے محبت کی تو کنویں میں ڈالا گیا، اور پھر قافلہ والوں کے ہاتھوں فروخت ہوکر غلام بنادیا گیا، اور مصر پہونچ کر عزیز مصر کا غلام بنا اور جلاوطنی کی زندگی مقدر بنی، پھر عزیز مصر کی بیوی نے محبت کی تو مصیبت یہ آئی کہ قید خانہ کی راہ دیکھنی پڑی، اس پر ان دونوں نے جواب دیا کہ ہماری محبت تو غیر اختیاری ہے اور ہم مجبور ہیں۔

ولما دخل هذا الفتيان في السجن تألفا به وأحباه حبا شديداً وقالا له: والله لقد أحببناك حباً زائداً قال: بارک الله فيكما انه من احبني احد الا دخل على من محبته ضرر، أحبتني عمتي فدخل على الضرر بسببها واحبني أبي فاوذيت بسببه وأحبتني امرأة العزيز فكذالک فقالا: والله ما نستطيع الا ذالک. (ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۹)

حقیقت یا افسانہ:- جمہور مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ دونوں قیدیوں نے واقعتاً خواب دیکھے تھے، اور حضرت یوسف سے اس کی تعبیر چاہی تھی، مگر حضرت

عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے کوئی خواب وغیرہ نہیں دیکھا تھا بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا امتحان لینے کے لئے اپنی طرف سے خواب گھڑ کر بیان کیا تھا۔

"وعن عبداللہ بن مسعود قال: ما رأی صاحبا یوسف شیئاً کانا تحالما لیجربا علیه". (بحوالہ سابق)

فائدہ:- کسی نے اگر واقعتاً خواب دیکھا ہے اور وہ عمدہ قسم کا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا انعام ہے، لیکن اگر واقعتاً خواب دیکھا نہیں ہے بلکہ اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو انتہائی سنگین قسم کا جرم ہے، کیوں کہ جھوٹ فی نفسہ جرم عظیم ہے اور اس کی نسبت جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب ہو تو وہ انتہائی سنگین جرم بن جاتا ہے، لہذا خواب دیکھے بغیر اپنی طرف سے گھڑ کر ہرگز بیان نہیں کرنا چاہئے کہ اس میں دین و دنیا دونوں کی خرابی و بربادی ہے۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۔

بولا نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے، یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رب نے میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت کے وہ لوگ منکر ہیں۔

ترکیب:- جملہ قال.....مستانفہ برائے بیان اور جملہ لا یاتیکما طعام..... محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ ترزقانہ.....محلا مرفوع صفت ہے طعام کی اور نباتکما محلا مرفوع صفت ثانی ہے طعام کی، جملہ لایا تیکما صلہ ہے اسم موصول حرفی ان کا، اور جملہ ذالکما مما علمنی مستانفہ برائے بیان یا جملہ تعلیلیہ ہے، اور علمنی ربی اسم موصول ما کا، جملہ انی ترکت.....مستانفہ ہے اور جملہ ترکت ملۃ محلا مرفوع خبر ہے ان کی، لا یومنون باللہ محلا مجرور صفت ہے قوم کی اور جملہ ھم..... کافرون محلا مجرور معطوف ہے، جملہ لا یومنون پر۔ (اعراب القرآن ج۶ ص۴۲۹)

بتاویلہ میں ضمیر کا مرجع بیان شدہ خوابوں کا مجموعہ ہے، "ای بتاویل ما قصصتھما علی ذالکما" مراد علم تعبیر رؤیا ہے، ذالک اسم اشارہ بعید کا لانا علم تعبیر رؤیا کی قدر و منزلت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

أی ذالک التاویل والکشف عن المغیبات و معنی البعد فی ذالک للاشارۃ الی بعد منزلتہ و علو درجتہ.

معارف وحقائق

تعبیر رؤیا کا علم کیوں دیا گیا؟:- **انی ترکت ..... الخ:** حضرت یوسف علیہ السلام کے قول ''ذلکما مما علمنی ربی'' سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خداوند قدوس نے تعبیر رؤیا کا علم آپ کو کیوں دیا تھا، تو انہوں نے جواب دیا کہ اس لئے تعبیر رؤیا کا علم عطا فرمایا کہ میں نے اس کفر وشرک کو کبھی اختیار نہیں کیا جس پر عام لوگوں نے اتفاق کر رکھا ہے۔

وقع جوابا عن سوال نشأ مما تقدم و تعليلا له كانه قيل : لماذا علمک ربک تلک العلوم الجليلة الشأن ؟ فقال لأنی ترکت دين الكفر الذی اجتمعوا عليه من الشرک و عبادة الأوثان. (روح ج۶ ص۴۳۲)

ترکت سے مراد عدم اختیار ہے نہ کہ عمل کے بعد ترک کرنا۔

والمراد بالترک الامتناع فانه لا يتلوث بتلک قط. (بحوالہ سابق)

وهم بالآخرة الخ: هم کا تکرار ان کے اختصاص بالکفر کو بیان کرنے کیلئے ہے اور شاید بمقابلہ مبدأ انھوں نے انکار معاد میں شدت اختیار کر رکھی تھی تو انکار معاد میں ان کے مبالغہ کی وجہ سے هم کو برائے تاکید مکرر فرمایا:

لبيان اختصاصهم بالكفر و لعل انكارهم بالمعاد أشد من انكارهم للمبدأ فلاجل مبالغتهم فی انكار المعاد كرر هذ اللفظ للتاكيد. (کبیر ج۹ ص۱۱۰)

قال لا یاتیکما طعام الآیة کا مفہوم:- جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق خواب کی تعبیر دریافت کرنے والے دونوں قیدی حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن اخلاق اور زہد وتقویٰ کے گرویدہ ہو چکے تھے، چنانچہ جب انہوں نے اپنے

خوابوں کی تعبیر پوچھی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے پیغمبرانہ شفقت ورافت کی بنا پر اور موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مناسب سمجھا کہ پہلے ان کو اللہ کی وحدانیت کی دعوت دی جائے، اور ایمان باللہ کو ان کے گوش گزار کر دیا جائے، مگر ایمان باللہ کی دعوت سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوا کہ ان قیدیوں کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ میں اللہ کا نبی ہوں، اور دعوت توحید ہی کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں، اور خداوند تعالیٰ کے علم عطا کرنے کی بنا پر تمہارے خوابوں کی تعبیر سے پوری طرح واقف ہوں، چنانچہ فرمایا "قال یاتیکما" مفسرین نے اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی ہے۔

(۱) میں خاندان نبوت کا ایک فرد اور کفر وشرک سے منزہ اور پاک ہوں، اور سن لو کہ علم جیوتش اور کہانت وغیرہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے میرے پاس وحی آتی ہے۔ لہذا تم خاطر جمع رکھو میں تمہارے خوابوں کی بالکل صحیح تعبیر وقت مقررہ پر روزانہ کھانا آنے سے پہلے پہلے تم کو بتا دوں گا مگر پہلے تم یہ سنو کہ خوابوں کی تعبیر سے زیادہ ضروری اور اہم چیز اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار ہے، میں خود اسی کا مقر ہوں، اور تم کو بھی اسی کی دعوت دیتا ہوں تا کہ تم دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی سے ہم کنار ہو جاؤ۔

(۲) آیت کریمہ کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ متعینہ کھانا جو تم کو ملتا ہے اس کے تمہارے پاس آنے سے پہلے میں تم کو اس کی حقیقت پر مطلع کر دیتا ہوں یعنی آج کھانا کس قسم کا آئے گا، اس میں کون کون سی چیزیں ہوں گی، تو پھر میرے لئے تمہارے خوابوں کی تعبیر کا بتلانا کیا مشکل ہے، اور پھر کھانے کی حقیقت کا بتلا دینا نجوم وکہانت کی بنا پر نہیں بلکہ وحی الٰہی کی بنا پر ہے، گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے ان کو اپنی نبوت ورسالت کا یقین دلانا چاہا تا کہ آئندہ جو نصیحت کریں وہ زیادہ موثر اور اوقع فی

النفس ہو، اس تفسیر کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معجزے کے مثل ہوگا جو قرآں کریم میں ان کی زبان سے منقول ہے کہ "وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم "اور میں خبر دیتا ہوں ان چیزوں کی جو تم کھاتے ہو اور جو ذخیرہ بنا کر اپنے گھروں میں آئندہ کیلئے رکھ چھوڑتے ہو۔

(ماخوذ از مظہری ج ۵ ص ۱۶۳)

فائدہ:- سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے دونوں قیدیوں کے خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے ان کے سامنے اپنی دینی حیثیت کی وضاحت فرمائی، اور پھر ان کو ایک خدا کی عبادت و بندگی اختیار کرنے کی دعوت دی، تو در اصل اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ منجانب اللہ اس پر مامور تھے، اور اللہ کے ہر نبی و رسول کا فریضہ یہی ہے اور خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لئے دعوت توحید کا فریضہ اب امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ جب اور جہاں موقع ملے تو اس میں کوتاہی سے کام نہ لے ورنہ کل قیامت کے دن باز پرس سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔

اظہار کمال علی الاطلاق مذموم نہیں:- فخر و ریا اور دوسرے کی تحقیر و تذلیل کیلئے اپنے علم و فن اور کمال کا اظہار کرنا شریعت مطہرہ میں انتہائی مذموم ہے، لیکن اگر کسی کے اندر واقعی کمال موجود ہے اور وہ اس کا اظہار لوگوں کے سامنے اس لئے کرتا ہے تا کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں تو یہ نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب و محمود ہے، جیسا کہ آیت کریمہ " لا یاتیکما طعام الخ "(آل عمران ۴۹) اور " اما بنعمۃ ربک فحدث " سے معلوم ہو رہا ہے، نیز کئی ایک مواقع پر خود رسول اللہ ﷺ سے اپنے فضل و کمال کا اظہار ثابت ہے، چنانچہ "لو کان موسیٰ

حیا' والی روایت اور آپ کے فرمان ''ولا نبی بعدی'' اور ''انا سید ولد آدم ولا فخر'' اور کنت نبیا و آدم بین الماء والطین'' وغیرہ بہت سی روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) عن جابر بن عبداللہ ان النبی ﷺ قال " لو ان موسیٰ کان حیا ما وسعه الا ان یتبعنی.

(۲) عن حذیفةؓ ان النبی ﷺ قال " وانی خاتم النبیین لا نبی بعدی". (ذکرہ السیوطی فی الدر المنثور ج۶ ص۶۱۸، باحالۃ الی احمد)

(۳) عن ابی هریرةان النبی ﷺ قال : انا سید ولد آدم یوم القیٰمة و اول من ینسق عنه القبر و اول شافع و اول مشفع .

(مسلم ۲۲۷۸، ابوداؤد ۴۶۷۳ واحمد ۱۰۹۵۴)

(٤) عن میسرة الفجر قال : سألت رسول الله ﷺ متی کنت نبیا ؟ قال کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد.

(ابن سعد فی الطبقات ج۹ ص۵۸ فی ترجمۃ میسرۃ الفجر، احمد فی المسند ۲۰۵۴۶، اخرجہ احمد ۱۵۱۳۷)

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ إِبْرَاهِیْمَ وَ إِسْحَاقَ وَ یَعْقُوْبَ ، مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُّشْرِكَ بِاللهِ مِنْ شَیْءٍ ، ذَالِكَ مِنْ فَضْلِ اللهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۔

اور پکڑا میں نے دین اپنے باپ دادوں کا، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا کسی چیز کو یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے۔

ترکیب:- جملہ اتبعت ..... محلاً مرفوع معطوف ہے جملہ "ترکت" پر اور جملہ ما کان لنا، برائے تعلیل ہے، جملہ لنشرک صلہ ہے موصول حرفی ان کا، اور جملہ ذلک من فضل اللہ ..... مستانفہ قائم مقام ہے قول کے ہے۔ اور جملہ "لکن اکثر" معطوف ہے، ذالک من فضل اللہ ..... پر اور جملہ "لایشکرون" محلاً مرفوع خبر ہے لکن کی۔

معارف وحقائق

واتبعتُ ملّة آبائی الآیة کی تفسیر:- واتبعت ملة آبائی الخ: یعنی تعبیر رویا اور اسی طرح دوسرے تمام کمالات ومحاسن مجھے اس لئے حاصل ہوئے کہ میں نے اپنے معزز آباء واجداد حضرت ابراہیم واسحاق اور یعقوب (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے دین ومذہب اور شریعت کا اتباع کر رکھا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبر اور وحدانیت خداوندی کے علم بردار تھے، میں نے ان لوگوں کے طور طریق اور دین ومذہب کو کبھی اختیار نہیں کیا جو توحید الٰہی اور مبدأ ومعاد کے منکر تھے، حضرت

یوسف علیہ السلام نے اپنے قیدی ساتھیوں سے یہ بات اس لئے کہی تا کہ ان کو توحید الٰہی اور ایمان باللہ کی رغبت پیدا ہو اور اپنے طور طریقہ یعنی کفر و شرک سے نفرت ہو جائے۔

یعنی انه انما حاز هذه الكمالات و فاز بتلك الكرامات لسبب انه اتبع ملة آبائه الكرام و لم يتبع ملة قوم كفروا بالمبداء والمعاد، و انما قاله عليه السلام ترغيبا لصاحبيه فى الايمان و التوحيد و تنفير ا لهما عما كانا عليه من الشرك و الضلال. (ابوسعود ج۴ ص۲۷۷)

آباء واجداد اور حسب ونسب پر فخر کی حیثیت:- آدمی کے اندر اگر بذات خود کوئی خوبی اور فضل وکمال نہ ہو تو محض آباء واجداد کے فضل وکمال پر فخر کرنا اور اپنی عالی نسبی کا تذکرہ کرنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ یہ جرم عظیم اور اسلام کے بنیادی قانون ''اخوت اسلامی'' کے قطعاً منافی ہے، اور اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، کیونکہ عظمت وشرافت کا معیار آباء واجداد اور خاندانی برتری نہیں بلکہ تقویٰ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''ان اكرمكم عند الله اتقاكم'' (بلاشبہ اللہ کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے) اور حجۃ الوداع کے موقع پر ہزار ہا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موجودگی میں حضور انور ﷺ نے یہ پیغام دیا ہے، ان الله يقول: يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر و انثىٰ و جعلناكم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اكرمكم الله عند اتقاكم، فليس لعربى علىٰ عجمى فضل، ولا لعجمى على عربى فضل، ولا لاسود علىٰ ابيض فضل الا بالتقوىٰ، يا معشر القريش لا تجيئو بالدنيا تحملو نها علىٰ رقابكم و يجئ الناس بالآخرة فانى لا اغنى عنكم من الله شيئاً. (جمع الفوائد از معجم طبرانی کبیر)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اے افراد نسل انسانی بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیئے ہیں تا کہ (صلہ رحمی کے لئے) تعارف پیدا کرو، بلا شبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ متقی (نیک کردار ہے) پس (خوب یاد رکھو کہ) نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری ہے، نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی بزرگی، بلکہ ان سب کے لئے فضیلت کا معیار صرف تقویٰ (نیک عملی) ہے، اے گروہ قریش ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے زعم باطل کی وجہ سے قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ، اور دوسرے لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لے کر آئیں، واضح رہے کہ (تمہارے صرف قریشی ہونے کی وجہ سے) میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً بے پروا نہیں بنا سکتا۔

عن جابر بن عبداللہ ان النبی ﷺ قال : الا لا فضل لعربی علی عجمی الا بالتقویٰ. (الدر المنثور ج ۷ ص ۵۷۹)

لیکن اپنے اندر اگر خود شرافت اور فضل و کمال موجود ہے اور آباء و اجداد بھی اس کے ساتھ متصف ہیں اور ان کو فضل و کمال اور تقویٰ میں شہرت حاصل ہے۔ تو پھر ان کا تذکرہ کرنے اور اپنی عالی نسبی کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ فخر و غرور کی بنا پر نہ ہو، بلکہ لوگوں کی نفع رسانی اور ان کو خیر کی طرف مائل کرنے کیلئے ہو، حضرت یوسف علیہ السلام نے یہاں اپنے معزز و مکرم اور فخر انسانیت آباء و اجداد کا تذکرہ اسی واسطے کیا ہے کہ اگر چہ وہ بھی نیک نفسی اور عظمت و شرافت کے بام عروج پر فائز تھے، اور قید خانہ کے قیدیوں کو اس کا اعتراف بھی تھا، مگر بہر حال ابھی ایک موحد اور داعی الی اللہ کی حیثیت سے ان کو وہ شہرت حاصل نہیں تھی جو ان کے مکرم و معظم آباء و

اجداد کو حاصل ہو چکی تھی، لہذا اپنے مخاطبین کے دل میں جذبۂ شوق وتوجہ کی زیادتی کے واسطے حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کا تذکرہ فرمایا، یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ حسب موقع ومصلحت مومن اپنے دین کو اپنے مومن رجال واکابر کی جانب منسوب کرسکتا ہے، جیسا کہ آیات قرآنی ''ملة ابیکم ابراهیم'' (حج ۷۸) ''قل بل ملة ابراهیم حنیفاً (بقرہ ۱۳۵) اور فاتبعوا ملة ابراهیم حنیفاً (آل عمران ۹۴) میں اس کی جانب اشارہ موجود ہے۔

ضابطۂ خداوندی:- واتبعت ملة آبائی الخ کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ وضاحت فرمادی کہ یہ ضابطۂ خداوندی ہے کہ جو ہدایت کے راستہ پر چلے گا اور انبیاء ومرسلین کے راستہ کی پیروی کرے گا، اور ضلالت وگمراہی کے راستہ سے اجتناب کرے گا تو اللہ تعالیٰ نور ہدایت کو اس کے دل میں داخل کردے گا، اور نامعلوم علوم سے اسے بہرہ ور کردے گا، اور اسے ایسا امام ومقتدیٰ بنادے گا کہ لوگ خیر کے کاموں میں اس کی پیروی کریں، اور اسے راہ ہدایت کا داعی بنادے گا۔

و هکذا یکون حال من سلک طریق الهدیٰ، واتبع طریق المرسلین، واعرض عن طریق الصالین، فان الله یهدی قبله و یعلمه ما لم یکن یعلم و یجعله امام یهتدی به فی الخیر وداعیاً الی سبیل الرشاد. (ابن کثیر ج ۲ ص ۴۰۷)

جماعت انبیاء سے کفر وشرک ممکن نہیں ہے:- ماکان لنا ان نشرک بالله من شئی: یعنی کفر وشرک نہ ہم جماعت انبیاء کیلئے جائز ہے اور نہ ہی اس کا امکان کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر ایک قسم کی ایمانی طاقت وقوت رکھی ہے، اور ہم کو خصوصی علم وحکمت سے نوازا ہے، من شئی میں من نفی کامل کو بتانے کیلئے ہے،

یعنی خواہ وہ ملائکہ ہوں یا انبیاء کرام یا اپنے ہاتھوں کی تراشی ہوئی مورتیاں اور بت ہوں یا اجنہ وغیرہ کسی کو بھی خدا کی خدائی میں ذرہ برابر کوئی شرکت حاصل نہیں ہے۔

(ابوسعود ج ۴ ص ۲۷۸، مظہری ج ۵ ص ۱۶۴)

فائدہ:- انبیاء کرام کیلئے اشراک باللہ کا جواز تو معدوم ہے ہی ان کے لئے اس کا امکان بھی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف دوسروں کیلئے اگرچہ امکان موجود ہے مگر اس کا جواز بہرحال کسی کیلئے بھی نہیں ہے۔ لہذا **اما کان لنا الخ** میں **لنا** سے نوع انسانی کو مراد لیکر آیت کی یہ تفسیر بھی کی جاسکتی ہے کہ نوع انساں میں سے کسی کے کیلئے اس بات کا جواز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی بھی چیز کو شریک اور ساجھے دار قرار دے۔

ایمان باللہ اور توحید فضل خداوندی ہے:- **"ذالک من فضل اللہ علینا و علی الناس"** یعنی ایمان باللہ اور توحید براہ راست ہم پر فضل خداوندی ہے کہ اس نے ہم کو رسالت ونبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور دولت ایمان وتوحید کو ہمارے لئے لازم کردیا، اور ہم جماعت انبیاء کے واسطے سے عام لوگوں پر یہ فضل فرمایا کہ ان کی ہدایت کیلئے ہم کو اپنے احکامات دے کر ان کے پاس بھیجا تاکہ سہولت وآسانی کے ساتھ وہ رشد وہدایت کو حاصل کرکے دنیا وآخرت دونوں کی کامیابیوں سے ہم کنار ہوسکیں۔

"ولکن اکثر الناس لا یشکرون" یعنی نعمت ایمان کے حاصل ہونے پر اللہ کا احسان نہیں مانتے اور اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔

ای لا یشکرون اللہ علی نعمۃ الایمان. (روح ج ۶ ص ۴۳۳)

یا یہ مطلب ہے کہ بذریعۂ انبیائے کرام اللہ تعالیٰ نے ایمان وتوحید کی دعوت

دیگر لوگوں پر اپنا فضل نازل کیا مگر اکثر لوگ یعنی امت دعوت نے اس کے اس فضل و احسان کی قدر نہ کی اور توحید و ایمان باللہ کو اختیار نہیں کیا، یا یہ کہ خداوند قدوس نے تو اپنے فضل و کرم سے توحید پر دلالت کرنیوالی واضح نشانیاں اور دلائل قائم کر دیئے مگر اکثر لوگ ان نشانیوں اور دلیلوں میں غور و فکر نہیں کرتے، اور ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے بلکہ الٹے کفران نعمت کرتے ہیں کہ بجائے توحید اور ایمان باللہ کے کفر و شرک کو اختیار کرتے ہیں۔ (مظہری ج ۵ ص ۱۶۴، ابوسعود ج ۴ ص ۲۷۸)

ولکن اکثر الناس لا یشکرون: میں بجائے ضمیر کے اسم ظاہر کا لانا زیادتی توضیح و بیان کے واسطے ہے۔

انما وضع الظاهر موضع الضمير الراجع الى الناس لزيادة توضيح و بيان. (ابوسعود ج ۴ ص ۲۷۸)

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُ كُمْ مَا أَنْزَلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

اے رفیقو قید خانہ کے بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست، کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے، مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے، نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند، حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے، اس نے فرمادیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو، یہی ہے راستہ سیدھا، پر بہت لوگ نہیں جانتے۔

ترکیب:- جملہ ندا یا صاحبی .....مستانفہ اور جملہ ءَ أرباب .....خبر ندا کا جواب ہے۔ جملہ ''ما تعبدون ''مستانفہ اور جملہ ''سمیتموھا'' محلا منصوب صفت ہے۔ ''أسماء'' کی اور ''ما انزل اللہ بھا من سلطان ''محلا منصوب صفت ثانی ہے ''أسماء'' کی ا،ور جملہ ''ان الحکم الا للہ ''مستانفہ ماسبق کی علت کے طور پر ہے، اور جملہ امر.....علت ثانیہ ہے، جملہ ''ذالک الدین القیم ''مستانفہ اور'' لکن اکثر .....معطوف ہے۔'' ذالک الدین القیمُ پر، اور جملہ'' لا یعلمون'' محلا مرفوع خبر ہے لکن کی۔

معارف و حقائق

''یا صاحبی السجن'' آیت کریمہ کا یہ حصہ اضافت للظرف کے باب

سے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اصل یا صاحبی فی السجن ہے اور جائز ہے کہ مشبہ بالمفعول بہ کی جانب اضافت کے باب سے ہو تو معنیٰ "یا ساکنی السجن" (اے قیدخانہ کے ساکنین) کے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے قول (اصحاب النار) کی طرح۔

(الدر المصون ج۶ ص۴۹۸)

لفظ صاحب سے خطاب کی وجہ:- صاحب: بمعنی دوست، ساتھی کے لفظ سے خطاب کرنا انتہائی بلیغ وشیریں تخاطب ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدخانہ کے اپنے دونوں ہم نشینوں کو بعنوان صحبت مخاطب فرمایا کہ وہ ان کی جانب متوجہ ہوں اور پوری دلجمعی کے ساتھ ان کی باتوں کو سنیں، اور بذریعہ مثال اپنی بات کو اس لئے بیان کیا تاکہ حق پورے طور پر واضح ہوجائے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ء ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار.

متفرقون: مختلف، متعدد جو عاجز اور ممکن ہونے میں ایک جیسے ہوں خواہ سونے، چاندی، لوہے اور پتھر کی مورتیاں ہوں، یا ملائکہ، جن اور انسان وغیرہ ہوں۔

"شئی متعددۃ متساویۃ الاقدام فی الامکان والعجز سواء کانت أصناما من ذھب و فضۃ او حدید او حجر او غیرھا من الملائکۃ والبشر.

الواحد اپنی عظمت ذات، وکمال صفات میں اکیلا، بے مثال، نہ تو اس کی ذات میں کوئی اس جیسا، نہ صفات میں، اور نہ افعال میں۔

"المتوحد فی جلال ذاتہ و کمال صفاتہ لا یماثلہ شئی فی الذات ولا فی الصفات ولا فی الافعال". (مظہری ج۵ ص۱۶۴)

القھار سب پر غالب جس کا کوئی مقابل ومقاوم نہیں، الغالب الذی لا

یعادله و لا یقاومه غیره.

القهار : جس کی عظمت و بڑائی کے سامنے ہر چیز بے حقیقت ہو۔

ای الذی ذل کل شئی بعز جلاله و عظمة سلطانه. (ابن کثیر ج۲ص۴۰۷) یعنی مختلف انواع واشکال اور اقسام کے چھوٹے بڑے دیوتا، جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لو لگانا بہتر ہے۔ یا اس اکیلے زبردست خدا سے جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف و قبضہ حاصل ہے۔ اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے۔ نہ اختیار، نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے۔ نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے۔ خود سوچو کہ سر عبودیت ان میں سے کس کے سامنے جھکایا جائے۔ (فوائد عثمانی ص۳۱۸)

اللہ ہی کی بندگی لازم ہے:- **أرباب متفرقون الخ استفهام علی سبیل الانکار ہے، والمراد منه الاستفهام علی سبیل الانکار.** (کبیر ج۹ص۱۱۲)

یعنی اس اللہ کی عبادت و بندگی بہتر اور لازم ہے جو اکیلا ہے اور سب پر غالب و حکمراں ہے، نہ کہ ان مختلف معبودان باطلہ کی جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور جو خود دوسروں کے دست نگر اور محتاج ہیں۔

سوال و جواب:- یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معبودان باطلہ کیلئے لفظ رب کیونکر استعمال کیا جبکہ ان کا رب نہ ہونا متعین ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کیلئے لفظ رب استعمال کرنا کافرین کے اعتقاد کی بنا پر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ علی سبیل الفرض والتقدیر ان کیلئے رب کا لفظ استعمال کیا گیا ہو، اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ ان کو بفرض محال اگر رب مان بھی لیا جائے تو بتاؤ کہ یہ بہتر ہے یا اللہ کی ذات جو اکیلی اور غلبہ والی ہے، دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا باری تعالیٰ اور اصنام کے

درمیان تفاضل جائز اور درست ہے کہ ''انها خیر ام الله الواحد القهار'' کہا جا سکے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی علی سبیل الفرض ہے اور معنی یہ ہیں کہ بفرض محال اگر اصنام سے وہ چیز حاصل بھی ہو جائے جو خیر کو واجب و ثابت کرے تو بتاؤ کہ یہ بہتر ہے یا خدائے واحد جس کا کوئی ہمسر و مقابل نہیں۔

ههنا سوالا: الاول: لم سماها أربابا و ليست كذلك. والجواب: لاعتقادهم فيها انها كذالك وايضا الكلام خرج على سبيل الفرض والتقدير والمعنىٰ انها ان كانت اربابا فهى خير ام الله الواحد القهار. والثانى: هل يجوز التفاضل بين الاصنام و بين الله تعالىٰ حتى يقال انهاخير ام الله الواحد القهار؟ والجواب: انه خرج على سبيل الفرض والمعنىٰ: لو سلمنا انه حصل منها ما يوجب الخير فهى خير ام الله الواحد القهار. (کبیر ج۹ ص۱۱۳)

ما تعبدون من دونه الآية کا مفہوم:- ما تعبدون من دونه الا أسماء الخ: یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت و بندگی کو چھوڑ کر تم جن بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش کر رہے ہو ان کی کوئی حیثیت و حقیقت نہیں ہے بلکہ تمہارا یہ فعل محض باپ دادا کی اندھی تقلید ہے، بس کچھ نام ہیں جن کو تم اور تمہارے باپ دادا نے بغیر کسی دلیل کے اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے، ''ما تعبدون'' کے لئے جمع کا صیغہ لانا اس بات کو بتانے کیلئے ہے کہ مراد ہر وہ شخص ہے جو شرک میں ان دونوں جیسا ہو۔

خاطب الاثنين بلفظ الجمع لانه اراد كل من كان مثلهما فى الشرك. (مظہری ج۵ ص۱۶۴)

اسماء: سے مراد یا تو مسمیات ہیں یا یہ کہ مضاف محذوف ہے أی ذوات

المسميات اما ان يراد به المسميات او على حذف المضاف اى ذوات المسميات. (الدر المصون ج۶ ص۴۹۸)

شرک کا جواز نہ عقل سے ثابت ہے نہ نقل سے:- "ما أنزل الله بها من سلطٰن" بھا میں ضمیر غیر اللہ کی معبودیت کی جانب راجع ہے، اى بعبادتها (جلالین ص۱۹۳) یا ان کے خدائی نام رکھ لینے کی طرف اى بتسميتها (کشاف ج۲ ص۲۵۷) مطلب یہ ہے کہ شرک پر نہ تو کوئی دلیل عقلی موجود ہے نہ نقلی کہ جس سے اس کی صحت پر استدلال کیا جا سکے، اس کے برخلاف توحید کی صحت وصداقت بے شمار دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ثابت ہے۔ لہذا تم پر لازم ہے کہ توحید کی صحت پر دلیل طلب کرنے کے بجائے پہلے شرک کی صحت پر کوئی ادنیٰ سی دلیل پیش کرو۔

اى لم يجعل الله سبحانه دليلا على وجودها، او حجة و برهانا علىٰ استحقاقها للعبادة، كما نصب الله تعالىٰ دلائل علىٰ وجود نفسه، و براهين علىٰ استحقاقه للعبادة، و آيات انزل على رسله و انبيائه.

(مظہری ج۵ ص۱۶۴)

تکوینی طور پر حکم صرف اللہ ہی کا نافذ ہے اور حکم تشریعی بھی صرف اسی کا حق ہے:- ان الحكم الا لله: ان نافیہ ہے یعنی تکوینی طور پر حکم صرف اسی کا نافذ ہے صحت، بیماری، موت، حیات، ہوا، پانی وغیرہ تمام چیزیں اسی کے تابع فرمان ہیں۔ کسی بت وغیرہ کا کوئی ادنیٰ سا تصرف بھی ان پر نہیں ہے، اور جس طرح حکم تکوینی صرف اسی کا نافذ ہے ایسے ہی حکم تشریعی بھی صرف اسی کا حق ہے یعنی عبادت و بندگی بھی صرف اسی کی جائز ہے اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت و بندگی کا کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ علی الاطلاق وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے، اور اس کی خالقیت و

مالکیت دلائل عقلیہ ونقلیہ دونوں سے ثابت ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:- ''امر الا تعبدوا الا ایاہ'' جملہ مستانفہ، جواب ہے ایک سوال کا ''ان الحکم الا للہ'' سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اللہ کا حکم کیا ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بلسان انبیاء علیہم السلام جواب مرحمت فرمایا کہ اس کا حکم یہ ہے کہ عبادت وبندگی صرف اسی کی کیجائے، '' ذالک الدین القیم '' یہی صحیح اور سیدھا راستہ ہے کیونکہ دلائل عقلیہ ونقلیہ دونوں سے اس کی حقانیت و صداقت ثابت ہے، ''الثابت الذی دلت علیہ البراھین العقلیۃ و النقلیۃ''. (روح المعانی ج۶ ص۴۳۵)

اور بقول امام راغب قیم بمعنی مقوم ہے یعنی ایسا دین جو معاش ومعاد اور دنیا وآخرت دونوں کو درست کرنیوالا ہے۔ (لغات القرآن ج۵ ص۱۲۱)

ولکن اکثر الناس لا یعلمون:- یعنی دین بالکل سہل اور آسان ہے، اور دلائل عقلیہ ونقلیہ دونوں سے ثابت ہے مگر رسم پرستی، اور عناد وتعصب کی بنا پر اکثر لوگ اس سے غافل ہیں اور برابر اس کا انکار کئے جارہے ہیں۔

رشد وہدایت کے اس پیغام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام ان کے خوابوں کی تعبیر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهُ خَمْراً وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّأْسِهِ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيَانِ .

اے رفیقو قید خانہ کے ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائے گا اپنے مالک کو شراب اور دوسرا جو ہے سو سولی دیا جائے گا پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق تم چاہتے تھے۔

ترکیب ولغات:- جملہ نداء یا صاحبی .....مستانفہ جملہ احدکما فیسقی .....جواب ہے ندا کا، اور جملہ "لیسقی" محلا مرفوع احدکما مبتدا کی خبر ہے۔ اور جملہ الآخر فیصلب .....معطوف ہے۔ جواب ندا پر، اور جملہ یصلب .....محلا مرفوع خبر ہے "الآخر" مبتدا کی، جملہ "تاکل الطیر" محلا مرفوع معطوف ہے جملہ یصلب پر، اور جملہ قضی الامر .....مستانفہ، اور جملہ تستفتیان صلہ ہے الذی اسم موصول کا۔

یا صاحبی السجن : سقی یسقیٰ بمعنی پلانا۔ ربہ لفظ رب علی الاطلاق جبکہ بغیر اضافت کے استعمال کیا جائے، تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے، اور حالت اضافت میں غیر اللہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے، جیسے رب الدار اور رب الفرس وغیرہ، اس کے معنیٰ آقا، سید اور مالک کے آتے ہیں۔ یہاں ربہ میں رب سے مراد آقائے مجازی شاہ مصر ہے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو آقائے مجازی کے معنی میں بار بار استعمال کیا ہے۔

معارف وحقائق

ساقی اور نانبائی کے خواب کی تعبیر:- اما احد کما فیسقی ربه خمراً:

یہ خطاب ساقی سے ہے، دعوت توحید سے فارغ ہونے کے بعد حسب وعدہ حضرت یوسف علیہ السلام اب خواب کی تعبیر بیان کررہے ہیں۔ تعبیر اگرچہ واضح اور متعین تھی مگر اس کے باوجود پیغمبرانہ شرافت کی بنا پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے تعیین کے ساتھ بیان نہیں کیا تاکہ جسے سولی دی جانے والی ہے وہ ابھی سے رنج وحزن میں مبتلا نہ ہو۔

واما الآخر: یہ تعبیر نانبائی کے خواب کی ہے۔ دونوں خوابوں کی جو تعبیر بیان کی گئی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جس نے یہ دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے۔ وہ پھر آزاد ہوکر بادشاہ کے ساقی کی خدمت انجام دے گا، اور جس نے روٹیوں کو والا خواب دیکھا ہے، اس کو سولی دی جائے گی، جن باتوں کے بارے میں تم نے سوال کیا تھا وہ فیصل ہوچکی، اور فیصلہ یہی ہے جو میں نے بیان کیا، کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا ہے، جب تحقیقات ختم ہوگئیں تو داروغہ پر جرم ثابت ہوگیا اور ساقی کو بری کردیا گیا۔

(قصص القرآن ج ۱ ص ۳۰۲)

حضرت یوسف علیہ السلام نے الہام یا وحی الٰہی سے تعبیر بتائی تھی:-

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس انداز سے تعبیر بتائی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تعبیر الہام الٰہی یا وحی الٰہی کے ذریعہ بتائی گئی ہے۔ لہذا اس کے غلط ہونے اور بدل جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، جمہور مفسرین تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ساقی اور خباز نے واقعتاً خواب دیکھتے تھے مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت

میں مروی ہے جسے امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم نے خواب وغیرہ نہیں دیکھا ہے، ہم تو محض کھیل کر رہے تھے، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا کہ ''قضی الامر'' مطلب یہ ہے کہ اب تمہارے ساتھ معاملہ وہی ہوگا جو بیان کیا جاچکا خواہ تم نے سچ کہا ہو یا جھوٹ۔

عن ابن مسعود رضی الله عنه قال: ما رأی صاحبا یوسف شیئاً إنما تحا لما لیجربا علمه، فلما اول رؤیا هما قالا: انما کنا نلعب ولم نر شیئاً، فقال علیه السلام "قضی الامر". (روح المعانی ج۶ ص۴۳۶)

خواب کی حقیقت اور اس کی تعبیر کے بارے میں مفصل بحث'' انی رأیت احد عشر کوکباً'' کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ أَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنْسٰهُ الشَّیْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ۔

اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں میرا ذکر کرنا اپنے خداوند کے پاس سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے خداوند سے پھر رہا قید میں کئی برسوں۔

ترکیب:- جملہ قال.....مستانفہ، جملہ ظن.....صلہ ہے الذی اسم موصول کا، جملہ "اذکرنی" محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "انسٰہ الشیطان" معطوف علی المقدر ہے، تقدیر عبارت فخرج فانساہ ہوگی، اور اگر انساہ کی ضمیر غائب یوسف کی طرف راجع ہو تو جملہ مستانفہ ہو جائے گا۔ (حاشیہ اعراب القرآن) جملہ لبث .....جملہ انساہ الشیطان پر معطوف ہے۔

معارف وحقائق

وقال للذی ظن انه ناج منهما: ظن کی ضمیر اگر یوسف کی طرف راجع ہو تو وہ یقین کے معنیٰ میں ہوگا۔ کیونکہ قضی الامر الذی فیه تستفتیان "یقین کے معنیٰ پر ہی دلالت کرتا ہے۔ المراد بالظن الیقین ان کان الضمیر راجعا الی یوسف لکونه علی الیقین یدل علیه قوله "قضی الامر الذی فیه تستفتیان" اور ضمیر کا مرجع اسم موصول یعنی ساقی کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ وجاز ان

یکون الضمیر راجعا الی الموصول وھو الساقی. (مظہری ج۵ص۱۶۵)

یعنی دونوں میں سے جس کے نجات اور آزادی پانے کا حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین تھا اس سے کہا، یا جس کو یہ غالب گمان تھا کہ نجات پائے گا اس سے کہا اذکرنی عند ربک حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اپنے آقا شاہ مصر کے سامنے میرا تذکرہ کردینا کہ جیل خانہ میں ایک غلام قیدی ہے جسے ظلماً قید کردیا گیا ہے۔ اس کے اوصاف واحوال اس طرح کے ہیں تاکہ وہ مجھے آزاد کردے۔

"یعنی عندالملک وقل له ان فی السجن غلاماً محبوساً ظلما وصفه کذاکی یخلصنی".

فانسٰه الشیطان الآیه کے بارے میں مفسرین کے اقوال:-

فانسٰه الشیطان ذکر ربه: بقول مجاہد اور محمد بن اسحاق وغیرہ، ھا ضمیر نجات پانے والے کی جانب راجع ہے۔ یعنی ساقی جو حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ وعدہ کرکے آیا تھا کہ جرم سے بری ہوجانے کے بعد وہ بادشاہ کے سامنے ان کا تذکرہ کرے گا۔ اپنی برأت اور ساقی گری کی خدمت پر دوبارہ مامور ہونے کے بعد کچھ ایسا مست ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اسے بالکل یاد ہی نہ آئے۔

اور ابن جریر اور بغوی نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ فانساہ کی ضمیر کو حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب پھیرتے اور یہ معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف کو بھلا دیا کہ ان کا بادشاہ سے مدد کیلئے ساقی سے کہنا ناموزوں ہے مگر ابن کثیر نے اسے سختی کے ساتھ رد کردیا ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایسا شخص ہم کو اس

طرح دین حق کی تلقین کرتا ہے اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے اور اس تفسیر کی صحت کیلئے قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام اور ان دو شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ ایک دعوت و تبلیغ اسلام کا، اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان ہر دو شخصوں کے سامنے اپنا قصہ بیان کیا ہو اور ان کی توجہ اس طرح مبذول کرائی ہو پھر بغیر ذکر سابق کے اس طرح ''اذکرنی عند ربک'' میں اجمال کے کیا معنیٰ؟ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۰۳)

نسیان کی نسبت شیطان کی جانب کرنے کی وجہ:- فانساہ الشیطان میں انساء کی نسبت شیطان کی جانب کرنا بایں معنیٰ ہے کہ اس نے ساقی کے دل میں طرح طرح کے خیالات اور وسوسے ڈال کر اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ایسا بے توجہ کر دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خیال اس کے دل سے محو ہو گیا، ورنہ انساء کو پیدا کرنے والی ذات تو حقیقت میں اللہ کی ہے۔ (ابو سعود ج ۴ ص ۲۸۰)

قید خانہ میں رہنے کی مدت:- فلبث فی السجن بضع سنین: بضع بمعنی چند، لفظ بضع کا اطلاق تین سے لے کر نو تک کے عدد کیلئے ہوتا ہے۔ البضع ما بین الثلاث الی التسع کما روی عن قتادۃ. (روح ج ۶ ص ۴۳۷)

کسی صحیح روایت سے ان چند سالوں کی تعیین نہیں ہو سکی، البتہ لفظ بضع سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ مدت نو سال کے اندر اندر ہے، اکثر حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ یہ مدت سات سال ہے، اور کلبی کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ساقی سے ''اذکرنی عند ربک'' کہنے سے پہلے پانچ سال

اور اس کے بعد سات سال قید خانہ میں رہے، اس طرح کل مدت بارہ سال ہو جاتی ہے۔ (مظہری ج۵، ابوسعود ج۴)

واکثر المفسرین علیٰ انه لبث فی السجن سبع سنین.....وقال الکلبی لبث خمس سنین قبل ذالک و سبعا بعد قوله "اذکرنی عند ربک" فکل ذالک اثنتا عشرة سنة".

غیر اللہ سے استعانت شان انبیاء سے فروتر ہے:- **فلبث فی السجن بضع سنین:** جرم سے بری اور ساقی گری کی خدمت پر دوبارہ مامور ہونے کے بعد اپنے محسن حضرت یوسف علیہ السلام کو بھول جانا اور ان کے خیال کا ساقی کے دل سے محو ہو جانا، اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا مزید چند سال تک قید خانہ میں پڑے رہنا اس کی علت جمہور مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت کے موقع پر استعانت بغیر اللہ جائز اور درست ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کی شان اور رتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ وہ اپنے کسی بھی معاملہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے موزوں نہ تھا کہ خدا پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب پر بھروسہ کریں اور بادشاہ سے اپنی مظلومیت کے دفاع کے طالب ہوں، اس لئے خدا کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ان کو ابھی چند سال اور قید خانہ میں رکھے، لہذا ساقی کو شیطان نے ایسا بھلایا کہ وہ یوسف کا کچھ بھی ذکر نہ کر سکا۔

استعانت بغیر اللہ کا حکم:- حضرت تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ازالۂ شدت و محن کیلئے کسی مخلوق سے استعانت کرنے میں مطلق مضائقہ نہیں۔ خصوصاً اس سے جس پر احسان کیا ہو، احسان سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے ہر استعانت گوارا ہو جاتی ہے۔

فائدہ:- حضرت یوسف علیہ السلام کے قید خانہ میں پڑے رہنے کا ذکر بطور عتاب نہیں بلکہ اسے محض نسیان پر مرتب کرنے سے مقصود صرف اس امر کا اظہار ہے کہ وہ شخص جو درمیانی واسطہ تھا چونکہ بھول گیا اس لئے کوئی سامان آپ کے نکلنے کا نہ ہو سکا۔

(ماجدی ج۲ص۶۱۰)

(پانچویں رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ)

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيْ أَرىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَاكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَ أُخَرَ يَابِسَاتٍ يَاأَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُوْنِيْ فِيْ رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُوْنَ۔

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں دبلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، اے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے۔

ترکیب ولغات:- جملہ قال الملک.....مستانفہ، جملہ انی أریٰ..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ اریٰ مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ یاکلھن محلا مجرور صفت ہے بقرات کی، جملہ نداء یا ایھا الملأ مستانفہ، جملہ افتونی جواب ہے ھذا کا، جملہ کنتم تعبرون، مستانفہ، اور جواب شرط محذوف ہے جس پر اس کا ما قبل دلالت کر رہا ہے۔ای ان کنتم للرؤیا تعبرون فافتونی، جملہ تعبرون محلا منصوب خبر ہے کنتم کی۔

وقال الملک انی اریٰ سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف و سبع سنبلات خضر و أخر یابسات الخ، بقرات جمع ہے بقرۃ کی بمعنی گائیں، سمان بروزن فعال بکسر الفاء جمع ہے سیمنۃ کی اور سمینۃ مونث ہے سمین کا، سمین کی جمع بھی سمان آتی ہے، چنانچہ اہل عرب جس طرح "نساء کرام" اور "رجال کرامٌ" استعمال کرتے ہیں ایسے ہی رجال سمان کی ترکیب بھی ان کے یہاں مستعمل ہے۔

صفة لبقرات وھو جمع سمینة و یجمع سمین ایضا علیه یقال :

رجال سمان كما يقال نساء كرام و رجال كرام،سمين بروزن فعيل صفة مشبهة، سمن يسمن باب فرح وزنه فعيل.

(الدرالمصون ج۶ص۵۰۱واعراب القرآن ج۶ص۴۳۸)

سمان بمعنی موٹی تازی،فربہ، عجاف ،لاغر،دبلی،امام عزیزی بجستانی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں:عجاف وہ ہیں جولاغری میں انتہا کو پہونچ چکی ہوں،اور تاج العروس میں ہے کہ عجاف کے معنی ہیں ایسی لاغر کہ جن پر نہ گوشت ہو نہ چربی، عجاف،اعجف اور عجفاء دونوں کی جمع ہے۔جو عجف سے مشتق ہیں اور دونوں صفت مشبہہ کے صیغے ہیں، پہلا واحد مذکر کا اور دوسرا واحد مونث کا۔

(لغات القرآن ج۴ص۲۴۰)

امام رازی تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ: امام لیث کہتے ہیں کہ عجف کے معنی ہیں چربی کا ختم ہونا،اس کا فعل عجف یعجف اور مذکر کی صفت اعجف اور مونث کی عجفاء آتی ہے۔اور دونوں کی جمع عِجَاف (بروزن فعال بکسر الفاء) ہے عربی زبان میں سوائے اعجف اور عجفاء کے افعل اور فعلاء کی کوئی جمع فعال کے وزن پر نہیں آتی اور عجاف کا بروزن فِعال جمع آنا شاذ ہے،لفظ سمان پر محمول کر کے سمان اور عجاف بولتے ہیں،سمان اور عجاف چونکہ ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں اور اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ ایک نظیر کو دوسری نظیر پر اور ایک نقیض کو دوسری نقیض پر حمل کرلیا کرتے ہیں۔

قال الليث:العجف ذهاب السمن، والفعل عجف يعجف والذكر اعجف، والانثىٰ عجفاء، والجمع عجاف فى الذكر ان والاناث و ليس فى كلام العرب افعل و فعلاء جمعا على فعال غير اعجف و عجاف وهى شاذة

حملوها علی لفظ سمان فقالوا: سمان و عجاف لانهما نقیضان و من دأبهم حمل النظیر علی النظیر و النقیض علی النقیض. (کبیر ج۹ ص۱۱۸)

یہاں عجاف عجفاء مونث کی جمع واقع ہے۔ قاعدہ کے لحاظ سے عجفاء کی جمع عجف ہونا چاہئے تھی، جیسا کہ حمراء کی جمع حمر ہے۔ مگر اہل عرب کی عادت کے مطابق یا تو یہ اپنی نقیض سمان پر محمول ہے یا اپنی نظیر ضعاف (بمعنی کمزور، لاغر) پر بہر حال یہ جمع خلاف قیاس اہل عرب سے مروی ہے۔ (لغات القرآن ج۴ ص۲۴۰)

سنبلات: جمع ہے سنبلة کی، بمعنی بالیں، خوشے، خضر بمعنی سبز، ہرے، جمع ہے خضراء کی جو اخضر کا مونث ہے، اور اخضر بروزن افعل صفت مشبہ ہے باب فرح سے، اخر بمعنیٰ دوسرے جمع ہے اخریٰ کی، یابسات خشک جو تر و تازہ نہ ہو، اسم فاعل جمع مونث واحد یابسة جو مونث ہے یبس کا باب سمع سے، افتونی بروزن افعونی، مجھ کو خبر دو، مجھ کو جواب دو، افتوا، افتاء سے مذکر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم، اصل میں افتیونی تھا بضم الیاء قبل الواو، یاء کا ضمہ نقل کر کے تاء کو دیدیا پھر اجتماع ساکنین کیوجہ سے یاء گر پڑی تو افتونی ہوگیا۔

معارف وحقائق

رویای:- بمعنی میرا خواب، قرآن مجید میں یہ لفظ بغیر واو کے صرف ہمزہ کے ساتھ بغیر مرکز ہمزہ کے لکھا جاتا ہے، یہ مصدر ہے، رای یری کا جس کے معنی خواب دیکھنے کے ہیں۔ نیز بروزن فعلیٰ یہ خواب کا اسم بھی ہے۔ بیضاوی لکھتے ہیں کہ رویا رویۃ ہی کی طرح ہے مگر وہ خواب میں دیکھنے کیلئے مخصوص ہے۔ (۱)

(۱) رؤیاء کو خواب میں دیکھی جانے والی اشیاء کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے، آیت کریمہ "قال یا بنی لا تقصص رؤیاک" میں دلیل کے ساتھ اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

ان دونوں میں تانیث کے دو حرفوں کا فرق ہے۔ جیسے کہ قربۃ اور قربیٰ ہے۔ واحدی نے تصریح کی ہے کہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ جیسے یسریٰ پھر جب یہ اس چیز کا نام قرار پایا جو سونے والے کی تخیل میں ہوتا ہے۔ تو اسماء کی جگہ استعمال کیا گیا۔

(لغات القرآن ج۴ ص۱۲۰)

للرؤیاء میں بقول بعض لام زائد ہے۔ معمول کے عامل پر مقدم ہونے کی وجہ سے عامل کی تقویت کیلئے لایا گیا ہے۔ اور بقول بعض تعبرون ما یتعدیٰ باللام کے معنی کو متضمن کر دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت ''ان کنتم تنتدبون لعبارة الرؤیا'' ہے اور ایک قول یہ ہے کہ للرؤیای کنتم کی خبر ہے۔ اس بنیاد پر تعبرون کی ترکیب دو طرح سے ہوگی۔ ایک یہ کہ اسے کنتم کی خبر ثانی قرار دیا جائے، اور دوسرے یہ کہ کنتم کی ضمیر مرفوع سے حال قرار دیا جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لام کو بیان کیلئے قرار دیکر اسے محذوف کے متعلق کر دیا جائے جیسا کہ (وکانوا فیه من الزاهدین) میں من کو بیانیہ قرار دیکر اسے فعل محذوف اعنی کے متعلق قرار دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت ''اعنی للرؤیا'' ہوگی اور اس صورت میں تعبرون کا مفعول محذوف ہوگا۔ تقدیر عبارت تعبرونها ہوگی۔

قوله : للرؤیا فیه اربعة اوجه : احدها ان اللام فیه مزیدة فلا تعلق لها بشئی و زیدت لتقدم المعمول مقویة للعامل، والثانی ان یضمن تعبرون معنی ما یتعدیٰ باللام تقدیره ان کنتم تنتدبون لعبارة الرؤیا، الثالث ان یکون للرؤیا وهو خبر کنتم و علیٰ هذا فیکون فی تعبرون وجهان احدهما: انه خبر ثانی ل کنتم والثانی : انه حال من الضمیر المرتفع، والرابع ان تتعلق اللام بمحذوف علی انها للبیان

کقوله تعالیٰ : وکانوا فیه من الزاهدین تقدیره اعنی فیه وکذالک هذا تقدیره اعنی للرؤیا و علیٰ هذا فیکون مفعول تعبرون محذوفاً تقدیره تعبرونها. (الدرالمصون ج۶ ص۵/۵۰۴)

تعبرون : تم تعبیر بیان کرتے ہو۔ باب نصر سے فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر، تعبیر کے معنیٰ ہیں: صورت مثالی سے ان معنوی چیزوں کی طرف منتقل ہونا جن معانی کی یہ صورت مثالیہ ہے (مثلاً دودھ صورت مثالی ہے علم کی جو ایک معنوی چیز ہے)

تعبیر: مشتق ہے عبور سے جس کے معنیٰ ہیں گذر جانا اور عبرت الرؤیاء عبارة (بالتخفیف) عبرتها تعبراً (بالتشدید) کی بہ نسبت اثبت ہے۔

التعبیر :۔ وهی الانتقال من الصورة المثالیة الی المعانی النفسانیة التی هی صورها فی عالم المثال من العبور وهو المجاوزة و عبرت الرؤیاء عبارة اثبت من عبرتها تعبیراً. (مظہری ج۵ ص۱۶۷)

ان کنتم للرؤیا تعبرون : یعنی اگر تم تعبیر خواب کی حقیقت سے واقف ہو اور صحیح اور عمدہ تعبیر دے سکتے ہو تو تم ضرور میرے خواب کی تعبیر بیان کرو۔

وقال الملک انی أری سبع بقرات : الآیة

ماقبل سے ربط :- ساقی جس کے نجات پانے کا حضرت یوسف علیہ السلام کو پورا پورا یقین تھا جب وہ قید خانہ سے جانے لگا تو انہوں نے اس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تا کہ آزادی کی کوئی راہ پیدا ہو سکے، مگر شیطان نے ساقی کے دل میں طرح طرح کا وسوسہ وغیرہ ڈال کر حضرت یوسف علیہ السلام کے خیال کو اس کے دل سے محو کر دیا، چنانچہ اس وقت تو آزادی کی کوئی راہ پیدا نہ ہو سکی، لیکن پھر مدت دراز کے بعد قید خانہ سے نکلنے کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ شاہ مصر نے ایک بڑا ہی عجیب وغریب

خواب دیکھا جس نے اسے خوف زدہ کردیا چنانچہ اس نے اس کی تعبیر معلوم کرنے کیلئے کاہنوں اور نجومیوں کو جمع کیا اور اپنا خواب بیان کر کے اس کی تعبیر چاہی۔ لیکن وہ لوگ اس کی تعبیر سے عاجز رہے، تو ساقی کو اچانک حضرت یوسف علیہ السلام یاد آئے اس طرح بادشاہ کا یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے قید خانہ سے نکلنے کا سبب بنا۔

فرعون کا خواب:- صاحب قصص القرآن لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ فراعنۂ مصر کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خاندان شاہی نسلی اعتبار سے ''عمالقہ'' میں سے تھا۔ مصر کی تاریخ میں ان کو ''ہکسوس'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی۔ جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ عرب عاربہ کی ایک شاخ تھی، نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی باہمی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے اور مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب فاراع (فرعون) تھا اس لئے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہ وقت اس کا اوتار اور فاراع کہلاتا تھا۔ فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا، اور اس زمانہ کے فرعون کا نام عرب مورخوں نے ریان بتایا ہے، اور مصری آثار میں ایونی کے نام سے موسوم ہے۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زنداں ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں اور دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں۔ اور سات سرسبز وشاداب بالیاں ہیں اور سات خشک، خشک بالیوں نے سرسبز بالیوں کو کھا لیا۔ بادشاہ صبح اٹھا تو پریشان خاطر تھا اور اس عجیب و غریب خواب سے حیران، فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب بیان کیا اور اس کی

تعبیر چاہی درباری بھی اس کو سن کر فکر و تردد میں پڑ گئے۔ اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی درماندگی و بیچارگی کو چھپانے کیلئے کہنے لگے بادشاہ یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے، ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں لیکن پریشان خیالات حل نہیں کر سکتے۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۰۴/۵)

بلاغت:- انی اریٰ سبع بقرات: میں اریٰ مضارع کا صیغہ ماضی کی حالت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ سمان، عجاف، ان دونوں کے درمیان صنعت طباق پائی جاتی ہے، اور ایسے ہی خضر ..... یابسات کے درمیان بھی صنعت طباق ہے۔ (صفوۃ ج ۲ ص ۵۴)

صنعت طباق کی تعریف:- کلام میں ایسے دو معنیٰ کا ذکر کرنا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں اس کو صنعت طباق کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ میں سمان و عجاف اور خضر و یابسات آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سمان، عجاف کی اور خضر، یابسات کی۔

قَالُوْا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَاوِيْلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِيْنَ.

بولے یہ خیالی خواب ہیں اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں ۔

ترکیب ولغات:- جملہ قالوا.....مستانفہ جملہ (ھی) اضغاث.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا (اضغاث) (اصل میں خبر ہے مبتدا محذوف ھی یا ھذہ یا تلک کی) جملہ مانحن ..... بعالمین محلاً منصوب معطوف ہے قول کے مقولہ پر۔

أضغاث: بروزن افعال جمع ہے ضغث کی جس کے معنی سینکوں کے مٹھے یا لکڑیوں کے گٹھر کے آتے ہیں۔ احلام بروزن افعال جمع ہے حلم کی بمعنی خواب دیکھنا۔

معارف وحقائق

اضغاث احلام میں اضغاث مضاف اور احلام مضاف الیہ ہے کیونکہ سینکوں کے مٹھے اور لکڑیوں کی گٹھری میں بری بھلی ہر طرح کی سینکیں یا لکڑیاں مل جلی ہوتی ہیں، اس لئے خوابہائے پریشاں یا طرح طرح کے خیالی خواب کو اضغاث احلام کہتے ہیں، عالمین جاننے والے، علم رکھنے والے، اسم فاعل جمع مذکر بحالت نصب و جر جمع ہے، عالم کی "قالوا اضغاث احلام" الخ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے اعیان سلطنت فن تعبیر خواب سے ناواقف تھے اسی لئے بادشاہ کے کلام میں شک پایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے اعیان سلطنت کو ان کنتم للرؤیای تعبرون، ان حرف شک سے خطاب کیا، اور خود انھوں نے بھی "مانحن بتاویل الأحلام بعالمین" سے علم کی نفی کی ہے، رہا ان کا قول اضغاث احلام تو یہ جاننے کی دلیل نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تفصیلاً تو ہم تعبیر خواب کا علم رکھتے نہیں، مگر خوابوں کی جیسی

شان ہوتی ہے، اس سے احتمالا اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی خواب نہیں بلکہ محض ایک خیال ہے اور اتنا علم اجمالی مہارت فن کی دلیل نہیں بن سکتا، نیز ساقی کا یہ کہنا کہ انا انبئکم الخ، اس سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ تعبیر کے عالم نہ تھے، ورنہ علماء تعبیر کے فیصلہ کے بعد ارکان سلطنت کے روبرو ایسی جرأت نہ ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ جانتے نہ تھے بلکہ وہ بھی مشتاق ومنتظر تھے، اور اعیان سلطنت کا جواب اضغاث احلام چونکہ تعبیر نہ تھا اس لئے خواب کی وہی تعبیر واقع ہوئی جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دی تھی۔ (بیان القرآن ج۵ ص۸۲/۸۳)

وقال الملک لهم " ان کنتم للرؤیاء تعبرون " للتدلیل علی انهم لم یکونوا فی علمه عالمین بها لانه اتی بکلمة " ان " التی تفید التشکیک رجاء اعترافهم بالقصور مطابقا لشک الملک الذی اخرجه مخرج الاستفهام عن کونهم عالمین بالرؤیا اولا وقول الفتیٰ " انا انبئکم " بتاویله الی قوله لعلی ارجع الی الناس لعلهم یعلمون . دلیل علی ذالک ایضا واللہ اعلم. (اعراب القرآن ج۶ ص۴۴۲)

جو تعبیر پہلے دی جائے وہی واقع ہو جاتی ہے:-

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ خواب معلق رہتا ہے جب تک اس کی تعبیر بیان نہ کر دی جائے اور جب تعبیر بیان کر دی جاتی ہے تو وہ واقع ہو جاتی ہے۔

عن النبی ﷺ قال : الرؤیا علی رجل طائر ما لم تعبر فاذا عبرت وقعت. (ابوداؤد ص۶۸۵)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ خواب کی پہلی ہی تعبیر واقع ہوا کرتی ہے۔

عن انس مرفوعاً :الرؤیا لاول عابر. (فتح الباری ج۱۲ص۴۳۲)

''خواب کی پہلی تعبیر ہی واقع ہوا کرتی ہے، اس کے متعلق حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

بشرطیکہ وہ خواب اصل تعبیر کے اعتبار سے اس (پہلی) تعبیر کا احتمال رکھتا ہو۔ اور اگر قاعدہ کے موافق تعبیر اول محتمل نہ ہوتو پھر اس کا واقع ہونا ضروری نہیں، پس جہاں کہیں دو تعبیروں میں سے دوسری واقع ہو اور پہلی نہ ہوتو سمجھ لو کہ پہلی تعبیر قاعدہ کے موافق نہ تھی۔ اور تعبیر خواب کے قاعدے انتہائی دقیق ہیں اس لئے ان کا احاطہ بہت ہی دشوار ہے۔ (بیان القرآن ج۵ص۸۳)

بلاغت:- خواب کے واحد ہونے کے باوجود اضغاث احلام کو الرؤیا کی خبر بنا کر جمع کا صیغہ لانا وصف بطلان حلم میں مبالغہ کے واسطے ہے جیسا کہ اہل عرب بطور مبالغہ فلاں یرکب الخیل و یلبس العمائم الخز، اس شخص کیلئے بولتے ہیں جو صرف ایک گھوڑے پر سوار ہو اور جس کے سر پر صرف ایک ہی ریشمی عمامہ ہو۔

فقد جمعوا الضغث فقالوا اضغاث احلام وجعلوه خبرا للرؤیا مع انها واحدة للمبالغة فی وصف الحلم بالبطلان وهو کما تقول : فلان یرکب الخیل و یلبس العمائم الخز لمن لا یرکب الا فرسا واحدا وماله الا عمامة فردة. (اعراب القرآن ج۶ص۴۴۲، روح ج۶ص۴۴۱)

مبالغہ کی تعریف:- کسی وصف کو شدت یا ضعف میں اس حد تک پہونچا دینا کہ اس حد تک اس کا پہونچنا بعید ہو یا محال ہو، تاکہ سننے والوں کو یہ گمان نہ رہے کہ اس وصف کی شدت یا ضعف کا کوئی مرتبہ باقی ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ.

اور بولا جو بچا تھا ان دونوں میں سے اور یاد آ گیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو۔

ترکیب ولغات:- جملہ قال الذی..... معطوف ہے جملہ قالوا پر، جملہ ''نجا.....'' صلہ ہے الذی اسم موصول کا، جملہ ''ادکر'' معطوف ہے۔ جملہ نجا .....پر، جملہ'' انا انبئکم.....'' محلا منصوب مقولہ ہے قال کا، جملہ ''انبئکم .....'' محلا مرفوع خبر ہے، انا مبتدا کی، اور جملہ'' ارسلون ''معطوف ہے جملہ مستانفہ مقدر پر ای تھیوؤا فارسلون .

ادّکر اصل میں اذتکر تھا پہلے تائے افتعال کو دال سے بدلا بعدہ قرب مخرج کی وجہ سے ذال کو بھی دال سے بدل کر ایک کا دوسرے میں ادغام کر دیا تو ادکر ہو گیا۔ (اعراب القرآن)

جمہور قراء نے اسے ادّکر ہی پڑھا ہے۔ اور صاحب کشاف نے اسی کو فصیح قرار دیا ہے، اور حسن بصری سے اذکر منقول ہے بمعنی تذکر۔ ''قال صاحب الکشاف وادکر بالدال ھو الفصیح و عن الحسن واذکر بالذال ای تذکر بعد امة ای بعد حین''.

معارف وحقائق

جس طرح امت ایک بڑی جماعت کے اجتماع سے بنتی ہے۔ ایسے ہی حین

اور وقت بھی بہت سے ایام کے اجتماع سے حاصل ہوتا ہے تو گویا حین اور وقت ایام و ساعات کے اعتبار سے امت ہے، (اس مناسبت سے مدت دراز کو بتانے کیلئے لفظ امة استعمال فرمایا) اور امام اشھب العقیلی نے بعد امة بکسر الھمزۃ پڑھا ہے، بمعنی بعد وجدان النعمة.

قال عدی. ثم بعد الفلاح والملک والامة وارتهم هناک القبور.

ترجمہ:- عدی نے کہا کہ پھر کامیابی اور حکومت اور نعمت کے بعد ان کو قبروں نے چھپالیا، وأنشد غیره :

الا لا اریٰ ذا امة اصبحت به فتترکه الایام وهی کما هیا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور زید بن علی وغیرہ نے بعد اَمَـهٍ بفتح الھمزۃ وتخفیف المیم وہاء منونہ کے ساتھ پڑھا ہے، جو مشتق ہے الامه بمعنی نسیان سے ،اور مجاہد وعکرمہ نے بعد اَمْهٍ (بسکون المیم) پڑھا ہے (بعد امة) ای بعد حین . وذلک لان الحین انما یحصل عند اجتماع الایام الکثیرة کما ان الامة انما تحصل عند اجتماع الجمع العظیم، فالحین کالامة من الایام والساعات، و قرء اشهب العقیلی بعد امة بکسر الهمزة، والامة النعمة، قال عدی : ثم بعد الفلاح والملک والامة وارتهم هناک القبور. (کبیر ج۹ ص۱۱۹)

وانشد غیره .

الا لا اریٰ ذا امة اصبحت به فتترکه الایام وهی کما هیا

وقرء ابن عباس و زید بن علی و قتادة والضحاک وابورجاء

"امه" بفتح الهمزة وتخفيف الميم و هاء منونة، من الامه وهو النسيان، و قراء مجاهد و عكرمه "بعد امه" بسكون الميم.

(الدر المصون ج۶ ص۵۰۸)

واذّكر بعد امة الآيه كا مفهوم:- مذکورہ تمام قرأتوں کے مطابق آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ شاہ مصر کے اعیان سلطنت جب اس کے خواب کی تعبیر بیان کرنے سے عاجز ہوگئے تو ساقی نے بادشاہ سے کہا: قید خانہ میں ایک نیک صالح مرد محبوس ہے، جس نے میرے اور خباز کے خواب کی بالکل صحیح تعبیر بتائی تھی۔ اگر آپ اجازت دیں تو قید خانہ میں جا کر اس مرد صالح سے آپ کے خواب کی صحیح تعبیر لے آؤں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر شاہِ مصر کے سامنے:- واذکر بعد امة: زمانہ دراز کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام ساقی کو یاد آئے، اور اسے یہ بات یاد آئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے سامنے اپنا تذکرہ کرنے کی وصیت کی تھی، یا یہ کہ بادشاہ کے پاس نعمت پالینے کے بعد ساقی کو حضرت یوسف علیہ السلام یاد آئے، یا یہ کہ بھول جانے کے بعد وہ پھر اسے یاد آئے۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام ساقی کو یاد آئے تو اس نے بادشاہ سے ان کے اوصاف وفضائل اور مظلومانہ قید میں ڈالے جانے کے واقعہ کو بیان کر کے درخواست کی کہ مجھے جیل خانہ میں جانے کی اجازت مرحمت فرمایئے تا کہ آپ کے خواب کی صحیح تعبیر سے میں آپ کو واقف کرا سکوں۔ چنانچہ اسے اجازت دی گئی اور وہ تعبیر خواب کیلئے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس جیل خانہ پہونچا۔

فارسولون اصل میں فارسلونی تھا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

سے منقول ہے کہ قید خانہ چونکہ شہر سے باہر تھا، اس لئے ساقی نے فارسلون یعنی بھیجے جانے کی درخواست کی۔

"قال ابن عباس لم یکن السجن فی المدینة و لهذا قال فارسلون". (صفوۃ ج۲ص۵۰)

حضرت یوسفؑ کا نام نہ لینے کی وجہ:- فارسلون: مراد حضرت یوسف علیہ السلام ہیں مگر ساقی نے ان کا نام اس لئے نہیں لیا تا کہ اسی کو بھیجا جائے، کسی اور کے ذمہ یہ کام سپرد نہ کر دیا جائے، اور ضمیر جمع اگر تنہا بادشاہ کے لئے استعمال کی گئی ہے تو یہ بطور تعظیم ہے جیسا کہ بادشاہوں سے خطاب میں یہ بات معروف ہے۔

(روح ج۶ص۴۴۳)

يُوْسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيْقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ أُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْ أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ.

جا کر کہا اے یوسف! اے سچے حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موٹی ان کو کھائیں سات دبلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی تا کہ لے جاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو۔

ترکیب:- جملہ ندا ''یوسف.....'' مستانفہ، جملہ ''افتنا'' ندا کا جواب، جملہ ''یاکلھن'' محلا مجرور صفت ہے بقرات کی یا سبع کی، جملہ ''لعلی ارجع'' مستانفہ برائے بیان جملہ ''ارجع'' محلا مرفوع خبر ہے، لعل کی، جملہ ''لعلھم یعلمون برائے تعلیل جملہ ''یعلمون'' محلا مرفوع خبر ہے لعلھم کی۔

معارف و حقائق

صدیق کی تعریف:- صدیق بروزن فعّیل (بکسر الفاء وتشدید العین) مبالغہ کا صیغہ ہے اور صدق سے مشتق ہے، بمعنی بہت سچا، شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں کہ ''صدیق وہ کہ جو وحی میں آئے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے، امام راغب رقم طراز ہیں: صدیق وہ ہے جس سے کثرت سے صدق ظاہر ہو، اور بقول بعض جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اور ایک قول یہ ہے کہ سچائی کی عادت ڈال لینے کی وجہ سے جس سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو، اور بقول بعض، صدیق وہ ہے جو قول و اعتقاد میں سچا اور

اپنے عمل سے اپنے صدق کو ثابت کردے۔ (لغات القرآن ج۴ص۲۲،۲۴)

ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو لفظ صدیق سے خطاب کیوں کیا؟:-

''یوسف ایھا الصدیق'' یہاں عبارت کا بعض حصہ محذوف ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ساقی نے جب بادشاہ سے قید خانہ میں جا کر تعبیر معلوم کرنے کی درخواست کی تو بادشاہ نے اسے جانے کی اجازت دیکر روانہ کیا چنانچہ وہ قید خانہ میں داخل ہوا اور اس نے کہا ''یوسف ایھا الصدیق'' ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو لفظ صدیق سے اس لئے مخاطب کیا کہ قید خانہ کی مصاحبت کے درمیان اس نے کبھی آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے نہیں پایا تھا، یا اس لئے کہ اس نے اپنے خواب کی سچی تعبیر پائی تھی۔ ساقی کے اس تعظیمی جملہ کے استعمال سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی کسی سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس کی تعظیم کرے، اور ایسے الفاظ سے مخاطب کرے جو اس کی جلالت شان پر دلالت کرتے ہوں، پھر اس تخاطب کے بعد ساقی نے بعینہٖ بادشاہ کا خواب اسی کے الفاظ میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بیان کیا، اور اس نے یہ بہت ہی اچھا کام کیا۔ اس لئے کہ کبھی الفاظ کے اختلاف سے بھی خواب کی تعبیر بدل جایا کرتی ہے۔ تعبیر خواب کے فن کی کتابوں میں اس کی صراحت اور تفصیل موجود ہے۔ (کبیر ج۹ص۱۱۹)

لفظ افتنا استعمال کرنے کی وجہ:-

افتنا فی سبع بقرات.....و اخر یابسات : یعنی آپ بادشاہ کے اس خواب کی تعبیر، اس کے نتائج اور حکم کو بتا دیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت شان کی بنا پر ساقی نے لفظ فتویٰ استعمال کیا۔ اور پھر افتنا جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا کہ یہ خواب خود اس کا نہیں تھا بلکہ وہ تو صرف سفیر و معبر تھا۔ (روح ج۶) ''لعلی ارجع الی الناس'' یعنی تا کہ میں خواب کی

تعبیر لے کر بادشاہ اور اعیان سلطنت کے پاس یا اہل مصر کے پاس جاؤں، اور آپ کی بتائی ہوئی تعبیر سے ان کو باخبر کروں۔

''لعلهم يعلمون'' تاکہ وہ لوگ بھی صحیح تعبیر سے واقف ہو جائیں اور پھر بواسطۂ تعبیر آپ کے فضل و کمال کا بھی ان کو علم ہو جائے تو قید خانہ سے رہائی اور نجات کا سامان ہو جائے۔

''لعلی ارجع'' الخ ساقی چونکہ تمام معبرین کے عجز کا مشاہدہ کر چکا تھا جس کی بنا پر اسے اس بات کا خوف تھا کہ ممکن ہے حضرت یوسف علیہ السلام بھی تعبیر بیان نہ کر سکیں۔ اس لئے اس نے ''لعلی ارجع الی الناس'' کا جملہ استعمال کیا۔

لانه رأى عجز سائر المعبرين عن جواب هذه المسئلة فخاف ان يعجز هو ايضا عنها، فلهذا السبب قال: لعلی ارجع الی الناس. (کبیر ج۹ ص۱۲۰)

بلاغت:- ''يوسف ايها الصديق'' یہ براعت استہلال کے قبیل سے ہے، حصول مقصد کی طمع میں ساقی نے سوال سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح و ثنا بیان کی کیوں کہ حصول مقصد کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ (صفوۃ ج۲ ص۵۴)

براعت استہلال کی تعریف:- براعت استہلال اسے کہتے ہیں کہ کلام کے آغاز میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو مقصد کلام پر دلالت کرتے ہوں۔

کمال صبر و استقلال:- حضرت یوسف علیہ السلام کے کمال صبر و استقلال اور جلالت قدر کا اندازہ کیجئے کہ ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا، نہ عطاء علم میں بخل سے کام لیا، نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زنداں میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو

اچھا ہے، ان کی یہی سزا ہے، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اس وقت خواب کی تعبیر دی اور اور اپنی جانب سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلا دی اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۰۶/۳۰۷)

فائدہ:— خداوند قدوس کے چنیدہ اور نیک بندوں کا وطیرہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں انسانیت کے خیر خواہ ہوتے ہیں، اور اپنے ذاتی معاملات میں نہ صرف یہ کہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں بلکہ ہمیشہ حسن سلوک کا معاملہ کرتے ہیں، ان کے دل و دماغ میں انتقام اور بدلہ کا کبھی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا کرتا۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَأْباً فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهٖ إِلَّا قَلِيْلاً مِمَّا تَاْكُلُوْنَ ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيْلاً مِمَّا تُحْصِنُوْنَ ، ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۔

کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئے گا اس کے پیچھے ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

ترکیب:- جملہ ''قال .....مستانفہ برائے بیان، جملہ'' تزرعون .....محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ'' حصدتم .....'' محلا منصوب معطوف ہے جملہ تزرعون پر، جملہ ''ذروہ محلا مجزوم جواب شرط جو مقترن بالفاء ہے، جملہ تاکلون صلہ ہے اسم موصول کا اور ضمیر عائد محذوف ہے، جملہ یاتی ..... سبع'' محلا منصوب معطوف ہے جملہ تزرعون پر، جملہ یاکلن.....محلا مرفوع صفت ہے سبع کی، اور جملہ قدمتم لھن صلہ ہے اسم موصول کا، جملہ ''تحصنون'' صلہ ہے اسم موصول ما ثانیہ کا، جملہ ''یاتی .....عام'' محلا منصوب معطوف ہے جملہ یاتی سبع پر، جملہ ''یغاث الناس'' محلا مرفوع صفت ہے عام کی، جملہ یعصرون محلا مرفوع معطوف ہے، جملہ یغاث پر۔

معارف و حقائق

''قال تزرعون سبع سنين دأبا فما حصدتم فذروه فی سنبله الا قليلا مما تاكلون.

سنین کے معنی کی وضاحت:- سنین : سال، برس، قحط، جمع ہے سنة کی مصباح میں ہے کہ سنة کی جمع، جمع مذکر سالم کی طرح آتی ہے، چنانچہ سنون اور سنین بولا جاتا ہے اور اضافت میں نون حذف ہو جاتا ہے، اور ایک لغت میں تمام حالتوں میں یاء برقرار رہتی ہے اور نون کو صرف اعراب قرار دیا جاتا ہے، جس کو حالت نکرہ میں تنوین دی جاتی ہے، اور حالت اضافت میں حذف نہیں کیا جاتا، گویا کہ وہ اصل کلمہ میں ہے۔ اور اسی لغت پر یہ حدیث ہے۔

اللهم اجعلها سنين كسنى يوسف. (بخاری ۸۰۴، ۱۰۰۶، مسلم ۶۷۵)

امام راغب فرماتے ہیں کہ بسا اوقات یہ لفظ قحط سالی کیلئے بولا جاتا ہے۔ ولقد اخذنا آل فرعون بالسنين میں سنین سے مراد سالہائے قحط ہی ہیں۔ تاج العروس میں تصریح ہے کہ سنین قحط سالی کے معنی میں معنی مجازی ہیں۔

دأبا: دأب کے معنی حال، عادت، رسم، دستور، اور اس عادت مستمرہ کو دأب کہتے ہیں جو ہمیشہ ایک حالت پر رہے۔ دأبا لگاتار کسی کام میں لگے رہنا۔

قال تزرعون : ساقی سے خواب سننے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر کو بیان کرنا شروع کیا۔ ''تزرعون'' خبر، امر کے معنی میں ہے جیسا کہ قول باری والمطلقات يتربصن'' (سورہ بقرہ:۲۲۸) میں يتربصن اور والوالدات يرضعن (سورہ بقرہ:۲۳۳) میں يرضعن خبر امر کے معنی میں ہے۔ معنیٰ یہ ہوں گے کہ تم کھیتی کرو، خبر کو امر اور امر کو بصورت خبر ذکر کرنا ایجاب کے اندر مبالغہ کے معنیٰ کو پیدا

کرنے کے لئے ہوتا ہے، ''تزرعون'' کے امر کے معنیٰ میں ہونے کی دلیل قول باری تعالیٰ ''فذروہ فی سنبلہ'' ہے۔

قراءت دأبا کی تحقیق اور تعبیر کا بیان:۔ دأبا: بمعنی جم کر، لگا تار، جمہور نے اسے ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور ایک قرأت ہمزہ کے فتحہ کی بھی ہے۔ لہذا یہ مانند شمْع اور شمَع، نهْر اور نهَر کے ہوگا کہ ان میں دونوں لغت منقول ہے، بقول زجاج دأبا چونکہ ''تدأبون دأبا'' کے معنی میں ہے اس لئے منصوب ہے یعنی فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مصدر ہے اور حال کی جگہ میں واقع ہے۔ تقدیر عبارت ''تزرعون دائبین'' ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ تم کھیتی کرو اس حال میں کہ تم اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے ہو یعنی ابتدائی سات سالوں میں خوب جم کر کھیتی کرو اور جو کچھ پیداوار ہو تو دانے کے بجائے بالیوں میں لگا ہوا چھوڑ دو صرف ضرورت کے بقدر اس میں سے داہ کر استعمال کرو۔ بقیہ بالیوں میں لگا ہوا اس لئے چھوڑ دو تا کہ وہ خراب نہ ہو اور اس میں گھن وغیرہ نہ لگنے پائیں۔ کیونکہ دانہ جب تک بالیوں میں لگا رہتا ہے خراب ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ (کبیر ج ۹ ص ۱۲۰)

''ثم یأتی من بعد ذلک سبع شداد یاکلن مما قدمتم لهن الا قلیلا مما تحصنون''.

شداد: بمعنی سخت، مضبوط، جمع ہے شدید کی، شدید کی جمع اشداء اور شدود بھی آتی ہے۔ سبع شداد میں ماتقدم کی دلالت کی بنا پر ممیّز کو جو موصوف ہے حذف کر دیا۔ أی سبع سنین شداد، یاکلن میں کھانے کی نسبت سنین کی جانب مجازاً ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ ''والنهار مبصرا'' میں دیکھنے کی نسبت نہار کی طرف مجازاً ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کھانا ورد یکھنا چونکہ سال اور دن کے اندر

ہوتا ہے، اس لئے سال اور دن کی طرف کھانے اور دیکھنے کو منسوب کر دیا گیا۔

حذف الممیز وھو الموصوف لدلالة ما تقدم علیه و نسب الاکل الیھن مجازا کقوله " والنھار مبصرا" لما کان الاکل والابصار فیھما جعلا کانھما واقعان فیھما. (الدر المصون ج۶ ص۵۱۰)

مما تحصنون : احصان بمعنی اکٹھا کرنا، بچا کر حفاظت سے رکھنا، کسی چیز کو قلعہ میں ڈال دینا تا کہ محفوظ رہے۔

قال تزرعون الآیه کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ خوشحالی کے سات سالوں کے بعد پھر تنگی کے سات سال آئیں گے کہ ان میں غلہ وغیرہ کچھ نہ پیدا ہوگا، اور تنگی کے ان سالوں میں تم اپنا اندوختہ کھا کر ختم کر ڈالو گے، صرف بیج ڈالنے کے بقدر غلہ باقی رہ جائے گا تا کہ تم اسے کھیتوں میں ڈال کر پھر نیا غلہ پیدا کر سکو۔

"ثم یاتی من بعد ذلک عام فیه یغاث الناس و فیه یعصرون"عام :- امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ عام، سنة کی طرح سے ہی ہے، لیکن بسا اوقات سنة کا استعمال اس سال کیلئے ہوتا ہے جس میں سختی یا قحط ہو اور اسی لئے قحط کی تعبیر لفظ سنة سے کی جاتی ہے، اور عام کا استعمال اس برس کیلئے ہوتا ہے جس میں فراخی اور سرسبزی ہو۔

آیت کریمہ **" ثم یاتی من بعد ذلک عام فیه یغاث الناس "** میں ماقبل کی طرح لفظ سنة کے بجائے عام کا لانا غالباً مذکورہ فرق کو بتانے ہی کیلئے ہے کہ پچھلے سختی کے سالوں کی طرح آنے والا سال سخت نہیں بلکہ انتہائی خوشحالی کا ہوگا۔ اس لئے بجائے لفظ سنة کے عام ذکر فرمایا:

"عام" ھو کالسنة لکن کثیراً ما یستعمل فیما فیه الرخاء

والخصب ، والسنة فيما فيه الشدة و الجدب ولهذا يعبر عن الجدب بالسنة، وكانه تحاشيا عن ذالک و تنبيها من اول الامر علىٰ اختلاف الحال بينه و بين السوابق عبربه دون السنة.

(روح ج۶ص۳۴۵،لغات القرآن ج۳ص۲۳۸)

"فيه يغاث الناس" یغاث میں الف کے،واو اور یاء دونوں سے بدلے ہوئے ہونے کا احتمال ہے۔چنانچہ وہ یا تو غوث بمعنی کشادگی سے مشتق ہے یا غیث بمعنی بارش سے،تقدیر اول پر اس کا فعل رباعی ہوگا،یقال: أغاثنا اللّٰه" یعنی اللہ نے مکارہ کو ختم کر کے ہماری مدد فرمائی،اور تقدیر ثانی پر اس کا فعل ثلاثی ہوگا۔ یقال غيث البلاد جبکہ حاجت کے وقت بارش ہوجائے۔

يجوز ان تكون الالف من واو، وان تكون عن ياء، اما من الغوث وهو الفرج و فعله رباعي يقال : اغاثنا الله من الغوث واما من الغيث، وهو المطر يقال: "غيث البلاد" اى مطرت. (الدرالمصون ج۶ص۵۰۱،ابوسعود ج۴ص۲۸۳)

"وفيه يعصرون" حمزہ اور کسائی نے "تعصرون" بصیغۂ خطاب پڑھا ہے کیوں کہ ماقبل میں کلام بصیغۂ خطاب ہی واقع ہوا ہے۔اور باقی (یعنی جمہور کی قرأت میں) یعصرون بصیغۂ غائب ہے۔اس لئے کہ ضمیر راجع ہے الناس کی جانب،اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انگور سے اس کا رس،زیتون سے روغن زیتون اور تل سے روغن تل نکالیں گے،وغير ذالک.

حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ ہے کہ خوب خوشحالی اور نعمتوں کی کثرت ہوگی۔

اور ابوعبیدہ نے "تعصرون" بصیغۂ خطاب بضم الصاد پڑھا ہے،بمعنی نجات

پانا، یعنی تم شدت ومحن اور قحط سالی سے نجات پاؤ گے۔

قراء حمزه والكسائى بالتاء الفوقانية على الخطاب لان الكلام كله على الخطاب والباقون بالياء التحتانية على ان الضمير راجع الى الناس ومعناه يعصرون العنب والزيتون والسمسم و نحو ذلك اراد به خصب السنة وكثرة نعيمها . قال ابوعبيدة "تعصرون" اى تنجون من الكرب والجدب. (مظہری ج۵ص۱۶۸)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے "یعصرون" کی تفسیر "یحلبون" منقول ہے۔ (روح ج۶ص۴۴۵، وابن کثیر ج۲ص۴۲۳)

علامہ عثمانی کا بیان:- مذکورہ آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے علامہ عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتلانے میں دیر نہ کی، نہ کوئی شرط لگائی، نہ اس شخص کو شرمندہ کیا کہ تجھ کو اتنی مدت بعد اب میرا خیال آیا، اس سے انبیاء علیہم السلام کے اخلاق ومروت کا اندازہ ہوتا ہے، پھر وہ صرف خواب کی تعبیر مانگتا تھا۔ آپ نے تین چیزیں عطا فرمائیں، تعبیر، تدبیر، تبشیر، آپ کے کلام کا حاصل یہ تھا کہ سات موٹی گائیں اور سات ہری بالیں سات برس ہیں جن میں متواتر خوشحالی رہے گی، کھیتوں میں خوب پیداوار ہوگی، حیوانات ونباتات خوب بڑھیں گے، اس کے بعد سات سال قحط کا ہوگا، جس میں سارا پچھلا اندوختہ کھا کر ختم کر ڈالو گے، صرف آئندہ تخم ریزی کیلئے کچھ تھوڑا سا باقی رہ جائے گا، یہ سات سال دبلی گائیں اور سوکھی بالیں ہیں، جو موٹی گایوں اور ہری ڈالیوں کو ختم کر دیں گے، تعبیر بتلانے کے دوران حضرت یوسف علیہ السلام نے از راہ شفقت و ہمدردیٔ خلائق ایک تدبیر بھی تلقین فرمادی کہ اول سات

سال میں جو پیداوار ہو اسے بڑی حفاظت سے رکھو۔ اور کفایت شعاری سے اٹھاؤ، کھانے کیلئے جس قدر غلہ کی ضرورت ہو اسے الگ کرلو اور تھوڑا تھوڑا احتیاط کے ساتھ کھاؤ، باقی غلہ بالوں میں رہنے دو تا کہ اس طرح کیڑے وغیرہ سے محفوظ رہ سکے، اور سات سال کی پیداوار چودہ سال تک کام آئے۔ ایسا نہ کرو گے تو قحط کا مقابلہ کرنا دشوار ہوگا۔ یہ تعبیر اور تدبیر بتلانے کے بعد انہوں نے بشارت سنائی جو غالبا آپ کو وحی سے معلوم ہوئی ہوگی۔ یعنی سات سال قحط رہنے کے بعد جو سال آئے گا اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے فریاد رسی ہوگی۔ اور خوب مینہ برسے گا۔ کھیتی باڑی، پھل میوے نہایت افراط سے پیدا ہوں گے، جانوروں کے تھن دودھ سے بھر جائیں گے، انگور وغیرہ نچوڑنے کے قابل چیزوں سے لوگ شراب کشید کریں گے، یہ آخری بات سائل کے حسب حال فرمائی۔ کیونکہ وہ یہی کام کرتا تھا۔ (فوائد عثمانی ص ۳۱۹، ۳۲۰)

قرآن کریم کی بلاغت کلام کا اعجاز:- یہ قرآن عزیز کی بلاغت کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب اور اس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تا کہ کلام میں تکرار اور دہرانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۰۶)

قرآن کریم خدا کا کلام ہے:- آیت کریمہ "فما حصدتم فذروه فی سنبله" سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کھیتی کو کاٹنے کے بعد اگر دانوں کو بالوں میں لگا ہوا چھوڑ دیا جائے تو اس میں گھن وغیرہ نہیں لگتے، اور وہ ضائع ہونے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور مذکورہ بات کا جاننا علم و تجربہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور یہ بات اپنی جگہ محقق اور ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہ کاشتکار تھے اور نہ آپ کو اس کا کوئی علم و تجربہ تھا، اس کے باوجود قرآن کریم میں "فما حصدتم فذروه فی سنبله" کی آیت کا آنا اس

بات کا واضح اور قطعی ثبوت ہے کہ قرآن آپ ﷺ کا کلام نہیں بلکہ منزل من اللہ ہے۔

فی هذه الآية نكتة علمية وهي ان الحصيد اذا بقي في سنبله فانه يبقى مصونا من السوس والتلف، وقد ثبت ذالك بالخبرة والعلم ورسول الله لم يكن مزارعا و ليست لديه خبرة كهذه الخبرة مما يثبت قطعا بان هذا القرآن ليس من عند رسول الله بل هو من عند الله عزوجل. (اعراب القرآن ج۶ ص۴۴۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں پڑنے والا قحط:- یہ قحط جو اس وقت پڑا، دنیا کے سخت ترین قحطوں میں سے ہوا ہے اور عالم کی تاریخ قحط میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، آگے چل کر یہ حدود مصر تک محدود نہ رہا بلکہ حجاز، فلسطین، شام تمام ممالک ملحقہ میں اس کی شدت محسوس ہوئی بلکہ توریت میں تو یہاں تک درج ہے کہ یہ قحط عالمگیر تھا اور ساری دنیا اس مصیبت سے بلبلا اٹھی۔ آیت کریمہ ''یغاث الناس و فیه یعصرون'' سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ قحط صرف ملک مصر تک محدود نہ تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی تحریر فرماتے ہیں:

اوپر سے حضرت یوسف علیہ السلام کا تخاطب اہل مصر سے چلا آرہا ہے اور ہر جگہ صیغۂ جمع مخاطب استعمال ہو رہا ہے۔ اور اس سارے کلام کا تعلق انتظامات قحط سے ہے۔ یہاں پہنچ کر یک بیک صیغہ بدل جاتا ہے اور بجائے مخاطب کے غائب کا ہو جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کیلئے بارش یا فریاد رسی ہوگی۔ لوگ شیر نچوڑیں گے۔ گویا صاف اشارہ اس طرف کر دیا کہ رفع قحط کا تعلق تنہا مصر سے نہیں باہر کے ملکوں سے بھی ہے۔ اور بارش دنیا کے مختلف علاقوں میں ہوگی۔ (ماجدی ج۲ ص۶۱۴)

بلاغت:- یاکلن ما قدمتم لهن: اس میں صنعت مجاز عقلی ہے اس لئے

کہ کھانے والے سنین نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گذشتہ سالوں میں غلوں کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ لہذا یہ فصحاء کے قول ''نهار الزاهد صائم و ليله قائم'' کی طرح اسناد الی الزمان کے قبیل سے ہے۔

يا كلن ما قدمتم لهن ، فيه مجاز عقلى لان السنين لا تاكل وانما ياكل الناس ما ادخروه فيها فهو من باب الاسناد الى الزمان كقول الفصحاء: نهار الزاهد صائم و ليله قائم. (صفوۃ ج۲ ص۵۴)

(چھٹے رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ.

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس پھر جب پہونچا اس کے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا اپنے مالک کے پاس اور پوچھ اس سے کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹے اپنے ہاتھ میرا رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے۔

ترکیب:- جملہ **قال الملک** مستانفہ، جملہ **ائتونی** بہ.....محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ **لما جاء ہ** .....معطوف ہے جملہ **قال الملک** پر، جملہ **قال** .....جواب شرط غیر جازم، جملہ "**ارجع**" محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ **اسالہ**..... محلاً منصوب معطوف ہے قول ثانی کے مقولہ پر، جملہ **ما بال**.....سوال کی تفسیر ہے، جملہ **قطعن** .....صلہ ہے اسم موصول "**اللاتی**" کا، جملہ "**ان ربی علیم**" مستانفہ ہے۔

معارف و حقائق

حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی جو تعبیر بتائی ساقی نے اسے من وعن بادشاہ کے گوش گزار کر دیا، بادشاہ نے ساقی کی زبان سے پہلے کچھ جملے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف میں سنے تھے، اب جو ایسی موزوں اور دل نشیں تعبیر، رعایا کی ہمدردی کی تدبیر اور اس کے بعد خوشحالی کی بشارت کو سنا تو ان کے علم وفضل، عقل ودانش اور حسن اخلاق کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ گیا، اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ، **و قال الملک ائتونی**، تاکہ اس کی زیارت

سے بہرہ اندوز ہوں اور اس کے مرتبہ اور قابلیت کے موافق عزت کروں۔

شاہ مصر کی طلب اور حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب:- قاصد جب بادشاہ کا پیغام اشتیاق لیکر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور قید خانہ سے نکل کر دربار شاہی میں تشریف لے چلنے کی درخواست کی تو انہوں نے بڑی بے نیازی کے ساتھ باہر آنے سے انکار کر دیا، اور قاصد سے کہا کہ تم واپس جا کر اپنے مالک (بادشاہ) سے پوچھو کہ اسے ان عورتوں کے بارے میں بھی کچھ خبر ہے جنہوں نے دعوت کے موقع پر اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، جب تک ان کے معاملہ کی حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آجاتی اور ان کی مکاریاں طشت از بام نہیں ہو جاتیں اس وقت تک میں قید خانہ سے باہر نہیں آسکتا، اور میرا پروردگار تو ان کی مکاریوں سے خوب واقف ہے، یعنی اللہ پر تو میری بے گناہی اور عورتوں کے جوڑ توڑ روشن ہیں ہی، میں چاہتا ہوں کہ میرے جیل سے باہر آنے سے قبل خلق پر بھی میری بے گناہی روشن ہو جائے، **فلما جاءہ الرسول قال ارجع الی ربک فسئلہ ما بال النسوۃ اللتی قطعن ایدیھن ان ربی بکیدھن علیم .**

بال: بمعنی حال، خبر، جس حال کی پرواہ کی جائے وہ بال کہلاتا ہے۔ اور کبھی جس حالت پر دل جمنے لگے اس کو بھی بال کہتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے مجازاً اس کے معنی دل اور جی کے آتے ہیں۔ (لغات القرآن ج۲ ص۲۱)

اللّٰتی: ایک قراءت اللّائی بھی منقول ہے۔ اور دونوں حالتوں میں یہ جمع ہے۔ ''التی'' کی۔

کید: مصدر و اسم مصدر، بمعنی اچھی تدبیر، بری تدبیر، مکر و فریب، یہاں بری تدبیر یعنی مکر و فریب مراد ہے۔

معاملہ کی تحقیق کا سوال کرنے کے بجائے دریافت حال کے سوال کی وجہ:-

" فسئله ما بال النسوة الّتی" حضرت یوسف علیہ السلام نے قاصد سے یہ نہیں کہا کہ جاکر اپنے بادشاہ سے یہ کہو کہ وہ ان عورتوں کے معاملہ کی تحقیق کرے۔ جنہوں نے دعوت کے موقع پر اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، بلکہ یہ کہا کہ تم واپس جاکر بادشاہ سے ان عورتوں کے معاملہ کو دریافت کرو، حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ طرز اس لئے اختیار کیا تا کہ بادشاہ کو معاملہ کی تحقیق کا شوق پیدا ہو اور تا کہ آپ کی نزاہت و برأت خوب اچھی طرح واضح ہو جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام قاصد سے اگر یہ کہتے کہ تم جاکر بادشاہ سے کہو کہ وہ معاملہ کی تحقیق کرے تو اس کی طرف سے تساہل اور بے پرواہی کا بھی معاملہ ہو سکتا تھا۔

ای ففتشه من شأنهن وانما لم یقل فاسئله ان یفتش من ذلک حثا للملک علی الجد فی التفتیش لتبین براء ته و یتضح نزاهته اذا السوال مما یهیج الانسان علی الاهتمام فی البحث للتفصی عما توجه الیه واما الطلب فمما قد یتسامح ویتساهل فیه ولا یبالی به.

(ابوسعود ج ۴ ص ۲۸۴)

بادشاہ کے پیغام پر فوراً لبیک نہ کہنے کی وجہ:-

حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور اور بے خطا برسوں سے قید خانہ میں بند تھے۔ اور بلا وجہ ان کو زندانی بنا دیا گیا تھا، اب جب کہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سنایا ہے تو چاہئے تھا کہ وہ مسرت و خوشی کے ساتھ زنداں سے باہر نکل آتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور گذشتہ معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خانوادۂ نبوت سے ہیں، اور خود بھی برگزیدہ نبی اور پیغمبر ہیں، اس لئے غیرت و حمیت

اور عزت نفس کے بدرجۂ اتم مالک ہیں، انہوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم وکرم سمجھا جائے گا اور میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائے گا، اس لئے صرف عزت نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی، بلکہ دعوت وتبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے۔ پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آجائے، اور حق ظاہر وواضح ہو جائے۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۰۷)

حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح وتوصیف اور نبی اکرم ﷺ کا عجز وانکسار:-

مسند احمد اور بخاری ومسلم کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، حضور انور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اگر میں اس قدر مدت دراز تک قید خانہ میں رہتا جس قدر کہ یوسف رہے تو بلانے والے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیتا۔ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قول: **فسئله ما بال النسوة التی قطعن ایدیهن ان ربی بکیدهن علیم**، کے سلسلے میں بیان فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو فوراً باہر نکل آتا اور کوئی عذر وغیرہ نہ کرتا۔

ایک اور حدیث مرسل میں حضرت عکرمہ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر اور حسن خلق پر رشک آتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے جب ان سے موٹی اور دبلی گایوں کے بارے میں سوال کیا گیا، اگر ان کی جگہ پر میں ہوتا تو رہائی کی شرط کے بغیر تعبیر نہ بتاتا۔ اور مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر وحسن خلق پر بڑا رشک آتا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، جب ان کے پاس (بادشاہ کا) قاصد آیا، اور اگر میں ہوتا تو فوراً باہر نکل جاتا۔

ففی المسند والصحیحین عن ابی هریرة قال: قال رسول الله ﷺ ولولبثت فی السجن ما لبثت یوسف لاجبت الداعی.

(بخاری ج۶ ص۹۷، مسلم ج۱ ص۹۲)

وفی لفظ لاحمد عن ابی هریرة عن النبی ﷺ فی قوله "فسئله مابال النسوة التی قطعن ایدیهن ان ربی بکیدهن علیم". فقال رسول الله ﷺ "لوکنت انا لاسرعت الاجابة وما ابتغیت العذر". (مسند احمد ج۲ ص۳۴۷)

وعن عکرمة قال قال رسول الله ﷺ لقد عجبت من یوسف وصبره وکرمه والله یغفر له حین سئل عن البقرات العجاف والسمان لوکنت مکانه ما اجبتهم حتی اشترط ان یخرجونی، ولقد عجبت من یوسف وصبره وکرمه والله یغفر له حین اتاه الرسول ولو کنت مکانه لبادرتهم الباب. هذا حدیث مرسل.

(ابن کثیر ج۲ ص۴۴۷، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۱۶۴)

مذکورہ احادیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح وتوصیف اور لطیف پیرایہ میں اپنی عبودیت کاملہ کا اظہار ہے، کیونکہ آپ کے مزاج ومذاق میں عامۂ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اور ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جس مقام بلند پر فائز ہیں وہاں تک عوام امت تو درکنار خواص کی رسائی بھی ممکن نہیں ہے، لہذا عامۂ خلائق کی رعایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو دیر نہ کرتا، یہ رسول اللہ ﷺ کا کمال نزول ہے۔ اور اسی پر دین کی عمومی اشاعت موقوف ہے۔

"تعجبه ﷺ من حال یوسف علیه السلام وقوله ﷺ لا

سرعت الاجابة، مبنی علیٰ کمال نزوله ﷺ الذی هو مدار سیوع دینه وقوة تأثیره فی الناس و تکمیله". (مظہری ج۵ص۱۶۹)

واقعہ کی تحقیق میں امرأۃ عزیز کا ذکر نہ کرنا:- "قال فما بال النسوة التی" اس جگہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر چہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اگر چہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہونچی تھی، مگر قید کے اس معاملہ میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف کی عاشق اور ان کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزو مند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے ملک کر عزیز کی بیوی کو اس کے قید والے فیصلہ میں شہ دی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا یہی وجہ ہے کہ زنداں کا معاملہ ان عورتوں کے قضیہ کے بعد پیش آیا، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ ہر ممکن حسن سلوک برتا ہے، میری عزت اور میرا احترام کیا ہے، اس لئے موزوں نہیں ہے کہ میں اس کی بیوی کا نام لے کر اس کی رسوائی کا باعث بنوں۔ (قصص القرآن ج۱ص۳۰۸)

علم دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا زینہ ہے:- حضرت یوسف علیہ السلام کی بیان کردہ تعبیر بادشاہ کو پسند آئی، چنانچہ اس نے ان کو قید خانہ سے دربار شاہی میں طلب کیا۔ اور یہی تعبیر ان کے آزاد ہونے کا سبب بنی۔ خداوند قدوس نے جب علم کو دنیا کے رنج ومحن سے نجات کا ذریعہ بنا دیا تو وہ اخروی رنج ومحن سے آزادی کا ذریعہ نہ بنے یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

"التعبير الذى ذكره يوسف استحسنه الملك وقال: ائتونى به، وهذا يدل على فضيلة العلم، فان سبحانه جعل علمه سببا لخلاصه من المحنة الدنيوية فكيف لا يكون العلم سببا للخلاص من المحن الاخروية". (کبیر ج۹ ص۱۲۱)

فائدہ:- دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی وکامرانی عطا کرنے والا علم صرف وہی ہے جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وساطت سے ہم تک پہونچا ہے، کیوں کہ حقیقی علم صرف وہی ہے، اور علی الاطلاق علم کا مصداق وہی ہے، اور رہے دنیوی علوم وفنون تو ان کی حیثیت علی الاطلاق علم کی نہیں بلکہ صنعت وحرفت کی ہے، اور ان کی افادیت کا تعلق صرف دنیوی فلاح وبہبود سے ہے نہ کہ آخرت کی کامیابی وکامرانی سے۔

لوگوں کو بدگمانی سے بچانا اور اپنی ذات سے تہمت کا دور کرنا ضروری ہے:-

قید خانہ کی صعوبت کو ترک کرنے سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی تحقیق کروائی، اور جب صاحب معاملہ عورتوں کے اقرار سے ہی ان کی عفت ونزاہت ثابت ہوگئی، تب باہر آئے، تاکہ آئندہ کسی کیلئے بدگمانی اور تہمت کا کوئی موقع باقی نہ رہ جائے، اور یہ بات خود رسول اللہ ﷺ سے بھی ثابت ہے، ارشاد ہے کہ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ ایسی جگہ نہ جائے کہ لوگوں کو الزام لگانے کا موقع ملے، من كان يومن بالله واليوم الآخر فلا يقفن مواقف التهم، اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کے ساتھ تھے ایک شخص آپ کے پاس سے گزرا تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر بتایا کہ یہ میری بیوی ہیں، اس شخص نے کہا کہ اللہ کے رسول بھلا آپ کے ساتھ میں بدگمانی کرسکتا ہوں؟ تو اس پر آپ ﷺ نے

فرمایا کہ جسم میں خون کے دوڑنے کی طرح شیطان بنی آدم کے ساتھ لگا رہتا ہے۔

واخرج مسلم من رواية انسؓ ان رسول الله ﷺ كان مع احدى نسائه فمر به رجل فدعاه وقال هذه زوجتي، فلانة فقال : يا رسول الله من كنت اظن به فلم اكن اظن بك ؟ فقال رسول الله ﷺ : ان الشيطان يجرى من الانسان مجرى الدم". (بخاری۲۰۳۵/مسلم۲۱۷۴/۲۱۷۵)

واقعہ ابوداؤد میں بھی مذکور ہے اس میں یہ وضاحت ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں معتکف تھے، ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے ملاقات کیلئے آئیں، کچھ بات چیت کے بعد جب واپس ہونے لگیں تو آپ ﷺ ان کو رخصت کرنے کیلئے مسجد کے دروازے تک تشریف لے گئے اسی دوران دو شخصوں کا وہاں سے گذر ہوا، (یہ دونوں غالباً حضرت عباد بن بشر اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما تھے، جو دونوں مشہور انصاری صحابی ہیں) انہوں نے آپ ﷺ کو ایک خاتون کے ساتھ دیکھ کر تیزی سے گزر جانا چاہا، (تیزی سے گذر جانے کا مقصد یہ تھا کہ حضور انور ﷺ کی بات چیت میں خلل واقع نہ ہو) تو آپ ﷺ نے ان کو روک کر وضاحت فرمائی کہ میرے ساتھ صفیہ بنت حی ہیں، یہ واقعہ حضرت صفیہ کی روایت سے ہی امام ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔

"عن صفيةؓ قالت: كان رسول الله ﷺ معتكفا فاتيته أزوره ليلا فحدثته فقمتُ، فانقلبتُ فقام معي ليقلبني وكان مسكنها في دار اسامة بن زيد فمر رجلان من الانصار فلما رأيا رسول الله ﷺ أسرعا، فقال النبي ﷺ: علىٰ رسلكما انها صفية بن حي: قالا: سبحان الله يا رسول الله (ﷺ) قال: إن الشيطان يجرى من الانسان

مجری الدم فخشیتُ ان یقذف فی قلوبکما شیئاً او قال شرا".

(ابوداؤد کتاب الادب ص ۶۸۲)

لطیفہ:- بعض علماء نے یہ بات لکھی ہے کہ قبل از نبوت شہوت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف عورتوں کا میلان ہوتا رہا مگر نبوت کے بعد ان کے حسن پر ہیبت نبوت کا پردہ پڑ جانے کی وجہ سے یہ بات ختم ہوگئی۔

ذکر بعض العلماء ان یوسف مازال النساء یملن الیه میل شهوة حتی نبأه الله فالقی علیه هیبة النبوة فشغلت هیبته کل من رآه عن حسنه. (صفوۃ ج ۲ ص ۵۵)

فائدہ:- اعطاء نبوت کے بعد ہیبت نبوت کے ذریعہ عورتوں کے میلان شہوت کو اس لئے ختم کر دیا گیا تا کہ کار نبوت کی ادائیگی میں خلل واقع نہ ہو، اور سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام حسن وخوبی کے ساتھ فریضۂ نبوت کو انجام دے سکیں۔

غرض حضرت یوسف علیہ السلام کے انکار اور معاملہ کی تحقیق کے مطالبہ پر بادشاہ نے واقعہ سے متعلق عورتوں کو طلب کر کے تحقیق شروع کی اگلی آیت میں اسی کا بیان ہے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ قَالَتِ امْرَأَةُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهٗ عَنْ نَفْسِهٖ وَإِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ.

کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس کی حفاظت سے بولیں حاشاللہ، ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ برائی، بولی عورت عزیز کی اب کھل گئی، سچی بات میں نے پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ سچا ہے۔

ترکیب:- جملہ قال.....مستانفہ، جملہ "ما خطبکن ....." محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ راودتن محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ قلن.....مستانفہ برائے بیان، جملہ حاش للہ، جملہ معترضہ دعائیہ، جملہ ما علمنا .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "قالت امرأة "مستانفہ، جملہ "حصحص الحق" محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "انا راودته "مستانفہ برائے بیان یا علت ہے ماسبق کی، جملہ راودته، محلاً مرفوع خبر ہے مبتدا انا کی، جملہ انه لمن الصّٰدقین معطوف ہے جملہ "انا راودته" پر۔

لفظ خطب کی تحقیق:- قال ما خطبکن : خطب بمعنی حال، معاملہ، حقیقت، وہ عظیم الشان معاملہ کی عظمت کی بنا پر جس میں کثرت سے تخاطب ہو۔ اور

جس کیلئے خطاب کیا جائے۔

الامر العظیم الذی یحق لعظمته ان یکثر فیه التخاطب و یخطب له . (روح ج۶ ص۴۴۸)

قال امرء القیس :

وما المرء ما دامت حشاشة نفسه

بمدرک اطراف الخطوب ولا آل

مصدر ہے خطب یخطب (نصر) کا۔ (الدرالمصون ج۶ ص۵۱۲)

اذ راودتن ظرف ہے اور "خطبکن" کی بنا پر منصوب ہے فعل کے معنی میں ہونے کی وجہ سے، اس لئے کہ اس کا معنی "ما فعلتن وما أردتن به فی ذلک الوقت" ہے۔ (الدرص۵۱۳)

قلن حاش لله :کلمہ تعجب حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال پاکبازی اور عفت ونزاہت کو بیان کرنے کیلئے ہے۔

تعجبا من عفته و ذهابه بنفسه عن شئی من الریبةومن نزاهته عنها. (کشاف ج۲ ص۲۶۱)

معارف و حقائق

واقعہ کی تحقیق:- "قال ما خطبکن" الآیۃ، واقعہ کی تحقیق کیلئے بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ سے متعلق عورتوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے جبکہ تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تاکہ تم اس کو اپنی طرف مائل کرلو؟ بادشاہ نے عنوان ایسا اختیار کیا جس سے پتہ چلے کہ اس کو واقعہ کا علم ہے۔ تاکہ وہ جھوٹ نہ بول سکیں۔ بہرحال تمام عورتیں ایک

زبان ہوکر بولیں کہ حاشا للہ ہم نے اس میں کوئی برائی کی بات نہیں دیکھی۔ ہماری شہادت ہے کہ وہ بالکل پاک وصاف ہیں، ہم نے تو ان میں برائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا۔ اس مجلس تحقیق میں زلیخا بھی موجود تھی اس نے دیکھا کہ ابتداء سے لیکر اب تک تمام گواہیاں اس کے خلاف ہیں تو اس نے صاف لفظوں میں اقرار کرلیا کہ قصور سرتاسر میرا ہی ہے، یوسف بالکل سچے ہیں۔

بے شک میں نے ہی ان کو اپنی جانب مائل کرنا چاہا تھا لیکن وہ ایسے کاہے کو تھے کہ میرے داؤ میں آجاتے، بالآخر باطل کو حق کے سامنے اور نفسیانیت کو روحانیت کے آگے سرنگوں ہونا ہی پڑا، صاحب قصص القرآن نے زلیخا کے اقرار کی وجہ اس کے عشق ومحبت کی پختگی کو قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی اور اب وہ عشق ومحبت کی بھٹی میں خام نہ تھی، کندن تھی، اور ذلت ورسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی، اس نے جب یہ دیکھا کہ یوسف کی خواہش ہے کہ حقیقت حال سامنے آجائے تو بے اختیار بول اٹھی، الٰئن حصحص الحق الایة جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہوگئی۔ ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے بلاشبہہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے۔ (قصص القرآن ج۱ص۹/۳۰۸)

الٰئن حصحص الحق: الٰئن اپنے مابعد کی بناپر منصوب ہے، حصحص خفا کے بعد ظاہر ہوگیا، کھل گیا، اور بعض نے اسے حصہ سے ماخوذ قرار دیکر یہ معنیٰ بیان کیا ہے کہ حق کا حصہ باطل سے جدا اور ممتاز ہوگیا، جیسا کہ زمین وغیرہ کا حصہ جدا ہوجاتا ہے، اور ایک قول کے مطابق یہ ثبت اور استقر کے معنی میں ہے۔

الآن منصوب بما بعده و حصحص معناه تبين و ظهر بعد خفاء قاله الخليل، قال بعضهم :هو ماخوذ من الحصة والمعنىٰ بانت

حصة الحق من حصة الباطل كما تتميز حصص الاراضی وغيرها، و قيل بمعنى ثبت واستقر۔ (الدرالمصون ج۶ ص۵۱۳، روح ج۶ ص۴۴۸)

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَائِنِیْنَ وَمَا اُبَرِّیُٔ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ .

یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کرلیوے کہ میں نے اس کی چوری نہیں کی چھپ کر اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغابازوں کا اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو، بے شک جی تو سکھلاتا ہے برائی مگر جو رحم کردیا میرے رب نے بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔

ترکیب ولغات:- جملہ قلت ذلک.....مستانفہ (امرأۃ عزیز کے قول سابق کے قائم مقام ہے لیکن راجح یہ ہے کہ قلت کی تقدیر کے بغیر ذلک مستانفہ ہے، اور یہ قول ہے حضرت یوسف کا) جملہ "یعلم" صلہ ہے موصول حرفی ان مضمرۃ کا، جملہ "لم اخنه" محلا مرفوع خبر ہے پہلے ان کی، جملہ "لا یهدی" خبر ہے ان ثانی کی، جملہ ما أبرئ محلا منصوب معطوف ہے قول کے مقولہ پر، جملہ ان النفس لامارة بالسوء جملہ تعلیلیہ، جملہ رحم ربی صلہ ہے ما اسم موصول کا، جملہ ان ربی غفور رحیم مستانفہ برائے بیان ہے۔

اخنہ: اصل میں اخونہ تھا حالت جزم میں اجتماع ساکنین کی بنا پر واو کو حذف کردیا تو اخنہ ہوگیا، خائنین خیانت کرنیوالے، دغاباز، مشتق ہے خیانة سے صیغہ اسم فاعل جمع مذکر۔

معنیٔ نفس کی تحقیق:- نفسی میرا جی، نفس کے اصل معنی ہیں جان، لیکن

اس سے مراد کبھی متنفس یعنی شخص، کبھی جی یعنی دل، کبھی نفس امارۃ، کبھی نفس لوامہ، کبھی نفس مطمئنہ، اور کبھی قوت ممیّزہ ہوتی ہے، مگر نفس کا عموی و بیشتر استعمال شخص کے لئے ہی کیا گیا ہے، ان معانی کے علاوہ بھی قرآن نے دوسرے معانی کیلئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے، مثلاً من انفسکم ازواجاً (نحل ۷۲) میں "انفس" سے مراد جنس اور نوع اور "فسلموا علی انفسکم" (نور:۶۱) میں مراد ہیں بھائی بند اور "لا املک الا نفسی" (سورہ مائدہ ۲۵) میں نفس سے مراد ہے ذات اور شخصیت اور ویحذرکم اللہ نفسہ (آل عمران ۳۰) میں نفس سے مراد اللہ کی ذات یعنی اس کا عذاب ہے۔ (لغات القرآن ج ۶ ص ۸۴)

"امارۃ" بڑا حکم دینے والا، مبالغہ کا صیغہ بروزن فعالۃ مشتق سے امر سے، تاء اگر تانیث کیلئے ہے تو اس کا مذکر اَمَّار ہوگا۔

معارف و حقائق

ذلک لیعلم الآیۃ کا مفہوم:- ذلک لیعلم انی لم اخنہ بالغیب..... الی ان ربی غفور رحیم.

بالغیب : بظھر الغیب کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے پس پشت اس کی غیر موجودگی میں، بالغیب حال ہے، یا تو فاعل سے یعنی اس حال میں کہ میں اس کی نظروں سے غائب اور پوشیدہ تھا، یا حال ہے، مفعول سے یعنی اس حال میں کہ وہ میری نظروں سے غائب تھا، یا یہ کہ باء ظرفیت کیلئے ہے، یعنی پوشیدہ مقام بند کمروں کے اندر، وان اللہ لا یھدی کید الخائنین، یعنی اللہ خائنین کے مکر کو نافذ نہیں کرتا اور اسے درست نہیں ہونے دیتا بلکہ وہ حق کو ظاہر کر دیتا ہے، چاہے ایک مدت کے بعد ہی کیوں نہ ہو، یا مطلب یہ ہے کہ خیانت کرنیوالوں کو اللہ ان کے مکر کی بنا پر ہدایت عطا

نہیں کرتا، یھدی کا مفعول اصل میں الخائنین تھا مگر کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے اس کی جگہ کیدکو مفعول بنا دیا گیا، اس میں زلیخا کی خیانت پر تعریض اور قوت کے ساتھ اپنی امانت کا اظہار ہے، آیت کریمہ کی مذکورہ تشریح جمہور کی تفسیر کے مطابق کی گئی ہے، اس میں ذالک کو حضرت یوسف کا مقولہ اور اخنہ میں ھا ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا گیا ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ بادشاہ کی دعوت پر فورا میرا قید خانہ سے باہر نہ آنا بلکہ عورتوں کے معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ کرنا اس لئے ہوا تا کہ پوری وضاحت کے ساتھ عزیز کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی نظروں سے غائب ہونے یا اس کے میری نظروں سے غائب ہونے کی حالت میں یا بند کمروں کے اندر میں نے اس کے ناموس میں کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں کی۔

خائن کو کبھی کامیابی نہیں ملتی:- اور تا کہ لوگ یہ جان لیں کہ چاہے مدت دراز کے بعد ہی کیوں نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ خائنین کے مکر و کید کو ضرور ظاہر کر دیتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو کبھی کامیابی نہیں ملا کرتی، بلکہ وہ مآل اور انجام کے اعتبار سے ذلیل و رسوا ہو کر رہتے ہیں، چنانچہ اگر میں نے کوئی خیانت وغیرہ کی ہوتی تو مجھے یہ کامیابی ہر گز نہ ملتی، کامیابی کا ملنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ میں ان الزامات سے بری تھا، جو مجھ پر عائد کئے گئے تھے اور پھر ان کو بنیاد بنا کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا تھا۔

پیغمبرانہ شرافت:- حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ انہیں قرائن وغیرہ سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ ضرور ان کا اعزاز و اکرام کرے گا، اور کسی معزز عہدہ کی پیشکش بھی کچھ بعید نہیں، تو ایسی صورت میں اگر عزیز کا دل صاف نہ ہوا تو یہ انتہائی بری بات ہوگی، کہ ایک زمانہ تک آقا کی

حیثیت سے رہنے کے بعد اب وہ میرے شاہی اعزاز کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے، اور دل ہی دل میں کڑھتا رہے، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ضروری سمجھا کہ عزیز کا دل پوری طرح صاف ہوجائے اور خود صاحب معاملہ عورتوں اور اس کی بیوی کی شہادت واقرار سے معاملہ محقق ہوکر سامنے آجائے تاکہ آئندہ کبھی کسی قسم کی کھٹک پیدا نہ ہو۔

عصمت وپاکبازی رب العزت کی رحمت وعنایت سے حاصل ہوتی ہے:-

"وما أبرئ نفسي أن النفس لامارة بالسوء إلا ما رحم ربي"

اور "ذلک لیعلم أني لم أخنه بالغیب" کہہ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی عصمت نفس کا زبردست مظاہرہ کیا تھا جس سے ایک سطحی آدمی فخر وغرور کا شبہہ کر سکتا تھا، جو نبی کے شایان شان ہرگز نہیں۔ لہذا ایک جلیل القدر نبی اور مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کردینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں کیونکہ نفس انسانی تو اکثر برائی پر ہی ابھارتا ہے۔ بلکہ یہ محض خدا کی رحمت وعنایت کا صدقہ ہے اور یہی رحمت عصمت انبیاء کی کفیل ہے۔

"ان النفس" میں نفس سے مراد نفس حیوانی ہے جو عناصر اربعہ (مادیہ) سے پیدا ہوتا ہے اور وہ نفس قلب وروح وغیرہ کی سواری ہے جو عالم امر کے لطائف میں سے ہیں، جن کا مستقر عرش کے اوپر ہے۔

یعنی ان النفس الحیوانی المنبعث من العناصر الاربعة التی هی مرکب للقلب والروح وغیرهما من لطائف عالم الامر، التی مقرهافوق العرش "(مظہری ج:۵ص:۱۷۱)

نفس انسانی کی ترکیب:- "لامارة بالسوء: نفس انسانی عناصر اربعہ

سے مرکب ہے اور عناصر اربعہ کی خاصیت بالطبع رذائل وشہوات کی جانب مائل ہونا ہے، لہذا نفس انسانی بالطبع شہوات اور رذائل کی جانب مائل ہوتا ہے، اسی بنا پر اسے ''امارۃ بالسوء'' کہا گیا ہے، آگ کا مقتضی غصہ اور کبر وتکبر ہے، دناءت و خست مٹی کے مقتضیات میں سے ہے، تلون مزاجی اور صبر کی کمی پانی کا خاصہ ہے، لہولعب اور ہزل وتمسخر ہوا کی خصوصیات میں سے ہے۔

من حیث انها بالطبع مائلة الی الشهوات والرذائل التی هن من خصائص العناصر الاربعة . کالغضب والکبر الذین هما مقتضی عنصر النار، والدناء ة والخسة مقتضی الارض، والتلون و قلة الصبر مقتضی الماء ، والهزل واللهو، مقتضی الهواء. (بحوالہ سابق)

" الا ما رحم ربی یہاں "ما" من کے معنی میں ہے ای الامن رحم ربی، جیسا کہ قول باری تعالیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء (سورہ نساء ۳) میں ما بمعنی من ہے، یعنی جس کو میرا رب بچالے اور اس پر رحم کرے تو وہ نفس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اس کا مقابلہ کرتا ہے، اور اسی مقابلہ اور جہاد نفس کی وجہ سے اسے ملائکہ پر برتری اور فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

یا یہ کہ ''ما رحم ربی ''الا وقت رحمة ربی کے معنی میں ہے۔ لہذا اس صورت میں ما مصدر یہ ہوگا۔ یعنی انسان جب رحمت خداوندی کو حاصل کر لیتا اور پالیتا ہے خواہ یہ پالینا براہ راست انتخاب خداوندی کی بنا پر ہو یا انبیاء علیہم السلام کی اطاعت وفرمانبرداری کی بنا پر ہو تو اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاکیزگی عطا کردینے کی بنا پر نفس انسانی مزکیٰ اور پاک ہو جاتا ہے، ارشاد خداوندی ہے: فلا تزکوا انفسکم (نجم ۳۲) تم اپنے نفوس کو پاک قرار نہ دو، وقال اللہ تعالیٰ: الم تر

الی الذین یزکون انفسھم بل اللہ یزکی من یشاء (نساء،۴۹) کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو اپنے نفوس کو پاکیزہ قرار دیتے ہیں بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ جس نفس کو پاکیزہ بنا دیتا ہے تو وہ اللہ کی مرضیات پر چلنے لگتا ہے۔ اور جب وہ مکمل طور پر مرضیات خداوندی کو اختیار کر لیتا ہے تو ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔ ''ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (فجر ۲۹،۲۹،۳۰) اے نفس مطمئنہ تو لوٹ اپنے رب کی طرف کہ تو رب سے خوش اور رب تجھ سے خوش پس تو میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا، اور نفس انسانی جب اس مقام پر پہونچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سیئات کو مبدل بحسنات کر دیتا ہے، اور اچھے کاموں میں اسے تمام لطائف امر کا مقتدیٰ اور امام بنا دیتا ہے، اور جن صفات کی تجلی کو عالم امر کے لطائف برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یہ نفس ان صفات کی تجلی کا حامل بنا دیا جاتا ہے، اور بقول بعض ''الا ما رحم ربی'' میں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے، لہذا الا، لکن کے معنی میں ہوگا، یعنی نفس تو بدی ہی کا راستہ بتاتا ہے، مگر میرے رب کی رحمت اسے بدی اور برائی سے پھیر دیتی ہے، اور اسے اچھائی اور راہ راست سے بدل دیتی ہے۔

وقیل الاستثناء منقطع ای لکن رحمۃ ربی ھی التی تصرف الاساءۃ و یبدلھا بالاصابۃ. (بحوالہ سابق)

ان ربی غفور رحیم، بیشک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی ارادۂ نفس اور اس میں پیدا ہونے والے خطرات و وسوسات کو معاف کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے برائیوں سے محفوظ کر کے اس پر اپنا رحم نازل کرتا ہے۔ یا مطلب یہ ہے

کہ جو اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اس سے سچی توبہ کر لیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کر دیتا ہے۔ اور اس پر اپنا فضل و رحم نازل کرتا ہے۔ جب تک بندہ استغفار کرتا اور رحم طلب کرتا رہے۔

یغفر النفس وخطراتها و یرحم من یشاء بالعصمة او یغفر المستغفر لذنبه المعترف علی نفسه و یرحمه ما استغفره و استرحمه.

(مظہری ج ۵ ص ۱۷۲)

ذالک لیعلم الآیة کے بارے میں مفسرین کے اقوال:-

"ذلک لیعلم" حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں "ذلک" سے لیکر "ان ربی غفور رحیم" تک کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دیکر لم اخنه کی ضمیر کا مرجع عزیز کو قرار دیا ہے، چنانچہ بقول ان کے زلیخا یہ کہہ رہی ہے، الآن حصحص الحق کے ذریعہ میرا یہ اعتراف اس لئے ہے کہ میرے شوہر (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اسے معلوم ہے) اور بلاشبہہ اللہ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا، (سو اگر میں نے اس سے زیادہ کوئی اور خیانت کی ہوتی جس کا حال اسے معلوم ہے تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بے شک نفس البتہ برائی کیلئے بڑا ہی ابھارنے والا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کر دے، بے شک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے۔

تقول: انما اعترفت بهذا علی نفسی لیعلم زوجی انی لم اخنه بالغیب فی نفس الامر ولا وقع المحذور الاکبر وانما راودت هذا الشاب مرودة فامتنع فلهذا اعترفت لیعلم، انی برئیة ولست أبری

نفسی فان النفس تتحدث و تتمنیٰ الا من عصمه الله تعالیٰ.

(ابن کثیر ج ۲ ص ۴۴۷)

اور مشہور محدث ابن حیان اندلسی نے "ذلک لیعلم الآیۃ" کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دیکر "لم اخنه" کی ضمیر کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ عزیز کی بیوی کہہ رہی ہے کہ میں نے برسر عام اپنے جرم کا اعتراف اس لئے کرلیا تا کہ (یوسف کو) معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں کوئی خیانت نہیں کی اور اللہ خیانت کرنیوالوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ آدمی کا نفس تو برائی کے لئے بڑا ہی ابھارنے والا ہے مگر ہاں اس حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے، بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحم کرنیوالا ہے۔

الظاهر هذا من كلام امرأة العزيز والمعنیٰ ذلک الاقرار والاعتراف بالحق ليعلم يوسف انی لم اخنه فی غيبته والذب عنه و ارميه بذنب هو منه برئ والنفوس مائلة الی الشهوات امارة بالسوء الا نفسا رحمها الله بالعصمة ان ربی غفور رحيم. (البحر المحیط ج ۵ ص ۳۱۷)

اور بقول بعض "یعلم" اور "لم اخنه" کی ضمیر راجع ہے اللہ تعالیٰ کی طرف، اور "ذلک" مقولہ ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا یعنی میں نے یہ تحقیق وغیرہ اس لئے کروائی تا کہ اللہ جان لے کہ میں نے اس کی کوئی نافرمانی نہیں کی اور اللہ کے جان لینے کا مطلب یہ ہے کہ تا کہ یہ بات ظاہر ہوجائے کہ میں نافرمان اور عاصی نہیں ہوں اور تا کہ یہ میرے اعزاز واکرام اور مقام ومرتبہ کی بلندی کا سبب بنے، اور تا کہ یہ بات بھی واضح اور ظاہر ہوجائے کہ خائن کا کید ومکر نافذ نہیں ہوا کرتا، اور انجام کار کامیابی مطیع وفرمانبردار کو ہی

ملا کرتی ہے نہ کہ عاصی اور نافرمان کو، اس صورت میں "لیعلم أنی لم أخنه بالغیب" قول باری تعالیٰ لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب (البقرۃ ۱۴۳) کے مانند ہو جائے گا، یعنی علم بمعنی ظہور ہوگا۔ وقیل ان ضمیر "یعلم" و لم "اخنه" لله تعالیٰ ای ذلک لیعلم الله تعالیٰ انی لم اعصه ای لیظهر انی غیر عاص و یکرمنی و یصیر سبب رفع منزلتی و لیظهر ان کید الخائن لا ینفذ وان العاقبة للمطیع لا للعاصی فهو نظیر قوله تعالیٰ لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب. (بقرۃ ۱۴۳، روح ج ۶ ص ۴۵۱)

ان الله لا یهدی کید الخائنین: میں اس حقیقت کا ایک بار پھر اثبات و اعلان ہے کہ اس دنیا کی تکوینیات پر وہی اخلاقی قانون ربانی نافذ و حاکم ہے اور مادیت خود مختار و شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑی گئی ہے، ایسا برابر ہوتا رہنا قانون حکمت و مصلحت کے تحت ایک الگ بات ہے، لیکن بہر حال ہر فعل بد کی جزاء کا ظہور حاکم مطلق کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہوتا ہے۔ (ماجدی ج ۲ ص ۶۱۶)

مذکورہ بالا تفاسیر میں سے پہلی تفسیر راجح ہے یعنی "ذلک" اور "ما ابرئ" کو حضرت یوسف کا مقولہ قرار دینا اور "لم اخنه" میں ضمیر کو عزیز کی طرف راجع کرنا اس لئے کہ "ان الله لا یهدی کید الخائنین" میں اور اسی طرح "الا ما رحم ربی ان ربی لغفور رحیم" میں صراحتاً اللہ کی ہدایت اور اس کے رحم و مغفرت کا تذکرہ موجود ہے، اور اہل مصر اگرچہ خدا کے وجود کے قائل ضرور تھے مگر ان کے یہاں جزا و سزا اور رحمت و مغفرت اور رشد و ہدایت کا تمام تر تعلق اپنے معبودان باطلہ سے تھا وہ انہیں کی عبادت و بندگی کرتے تھے، اور انہیں کو حاجت روا اور عطاء و بخشش کا مظہر قرار دیکر اپنی تمام ضروریات کو انہیں سے طلب کیا کرتے تھے، ان کے یہاں اللہ

تبارک وتعالیٰ سے مانگنے اور اس سے رحمت ومغفرت اور رشد وہدایت کے طلب کرنے کا سرے سے کوئی تصور تھا ہی نہیں۔ لہذا قرین قیاس اور راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''ذلک لیعلم انی لم اخنه ''اور''وما ابرئ نفسی ''کو حضرت یوسف علیہ السلام کا مقولہ قرار دیکر''لم اخنه '' کی ضمیر کو عزیز کی طرف راجع کیا جائے اور اکثر مفسرین نے اسی کو اختیار بھی کیا ہے۔

نفس انسانی کی تین حالتیں:- وما ابرئ نفسی ان النفس لامارة بالسوء میں جنس نفس انسانی کو''امارة بالسوء''یعنی ہر نفس انسانی کو برے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا گیا ہے، اور ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے بھی منقول ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے۔ جو تمہیں برے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار بھی کرتا ہے۔ اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔ لیکن سورہ قیامہ میں اسی نفس انسانی کو''لوامة''(بہت زیادہ ملامت کرنے والا) کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے۔

'' لا اقسم بیوم القیٰمة ولا اقسم بالنفس اللوامة'' اور سورہ والفجر میں اسی نفس انسانی کو نفس مطمئنہ کا لقب دیکر جنت کی بشارت دی گئی ہے،'' یٰایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی'' تو اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں تو''امارة بالسوء''یعنی برائیوں کا حکم دینے والا اور اس کی طرف مائل کرنے والا ہے۔ لیکن انسان اگر خوف خدا وآخرت کی بنا پر نفس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو پھر وہ''لوامة'' یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور توبہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ جیسے عام صلحاء امت کے نفوس ہیں۔ اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اس کو

اس حالت پر پہونچا دیتا ہے کہ اس میں برے کاموں کا تقاضہ ہی باقی نہ رہ جائے تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ صلحاء امت کو یہ چیز مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ مگر ان کیلئے اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا۔ اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطاء خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ (ماخوذ از معارف القرآن ج ۵ ص ۷۴، ۷۵)

بہر حال وقت آ پہونچا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و پاکبازی اور صداقت و طہارت کا معاملہ تہمت لگانیوالوں کی زبان سے ہی واضح ہو جائے، چنانچہ وہ واضح اور ظاہر ہو گیا اور شاہی دربار میں مجرموں نے اعتراف کر کے یہ بتا دیا کہ یوسف کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لطیفہ:- امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یوسف خدا کے سچے پیغمبر اور نبی معصوم تھے، اس لئے ان کا دامن ہر قسم کی آلائش سے پاک وصاف تھا اور ان کی مقدس زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی آلودگی سے ملوث نہیں ہوا تھا۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ یوسف کے واقعہ سے متعلق جس قدر بھی شخصیتیں تھیں ان سب کی زبانی ان کی طہارت نفس اور عصمت کا اعتراف کرایا، ''الفضل ما شهدت به الاعداء'' اچھا یوسف علیہ السلام کے علاوہ اس واقعہ کی شخصیتیں کون ہیں: عزیز مصر کی بیوی شہری عورتیں اور عزیز کی بیوی کا رشتہ دار یہی افراد ہیں جو کسی نہ کسی طرح تحقیق طلب معاملہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سب سے پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے، اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسف کی پاکی کا اظہار کرتا ہے، اور عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے، اس کے بعد حقیقت حال واضح ہو جانے پر عزیز بھی اقرار

کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ، بے خطا اور معصوم ہے اور "یوسف اعرض عن هذا" کہہ کر یوسف سے معذرت کرتا اور اپنی ناموس کی حفاظت کی خاطر معاملہ کو ختم کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ تیسرا نمبر شہری عورتوں کا ہے۔ جب بادشاہ نے بھرے دربار میں یوسف کے معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بے تامل کہہ دیا" حاش لله ما علمنا عليه من سوء" اور اس طرح یوسف کی پاکدامنی پر مہر لگادی۔ یہ سب شہادتیں اگر چہ یوسف علیہ السلام کے عزیزوں، رشتہ داروں اور حامیوں کی جانب سے نہ تھیں بلکہ ایک اجنبی ملک، عزیز کی بیوی کے ہم قوم اور اہل خاندان کی شہادتیں تھیں۔ تاہم وہم وگمان ہوسکتا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ اس معاملہ میں کسی حد تک "اگر چہ بہت تھوڑا ہی سہی" یوسف علیہ السلام کا بھی ضرور قصور ہوگا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان فضل وکرم تھا کہ اس نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان اور اس کے بارے میں شائبہ سوء ظن کے انہدام کیلئے علی رؤوس الاشہاد خود مجرم سے اقرار جرم کرایا۔ اور اس کی ہی زبان سے یوسف علیہ السلام کی عصمت وصداقت کی شہادت دلا کر حقیقت حال آشکارا کردی۔ اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا کہ "الآن حصحص الحق انا راودته عن نفسه وانه لمن الصادقين".

ذلک فضل الله یوتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم. (ج۴)

(قصص القرآن ج۱ص۳۱۱)

بلاغت:- لم يقل آمرة مبالغة فی وصف النفس بكثرة الدفع فی المهاوی والقود الی المهاوی لأن (فعال) من ابنية المبالغة.

(صفوۃ ج۲ص۵۴)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ .

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں پھر جب بات چیت کی اس سے، کہا واقعی تو نے آج ہمارے پاس جگہ پائی معتبر ہو کر۔

ترکیب:- جملہ وقال الملک.....مستانفہ، جملہ ائتونی بی محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ استخلصہ جواب ہے شرط مقدر کا اور غیر مقترن بالفاء ہے، جملہ ''کلمہ'' محلا مجرور مضاف الیہ، جملہ قال..... جواب ہے شرط غیر جازم ''لما'' کا، جملہ ''انک ..... مکین'' محلا منصوب مقولہ ہے قول کا۔

معارف و حقائق

حضرت یوسف علیہ السلام شاہِ مصر کے دربار میں:- وقال الملک ائتونی به استخلصه لنفسی استخلاص بمعنی پسند کرنا، خالص کرنا، فرعون پر حقیقت حال منکشف ہوگئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت اور جلالت قدر کا سکہ بیٹھ گیا، ساقی کا حسن عقیدت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا ذکر، اپنے خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر، اور عصمت نفس کا یہ انکشاف، یہ سب امور تھے جنہوں نے مل کر بادشاہ کو اس بزرگ اور پُر عظمت ہستی کی دید اور اس سے استفادہ کا عاشق بنا دیا، وہ بے قرار ہو کر کہنے لگا ''ائتونی به استخلصه لنفسی'' اس کو جلد

میرے پاس لاؤ کہ میں اس کو خاص اپنے کاموں کیلئے مقرر کروں۔ تفسیر مظہری، روح المعانی اور تفسیر کبیر وغیرہ میں یہ تفصیل مذکور ہے کہ حکم شاہی کے بعد قاصد دوبارہ قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہونچا اور ان سے بادشاہ کی خدمت میں چلنے کی درخواست کی، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے غسل کیا نئے کپڑے پہنے قیدیوں کے لئے خیر وعافیت کی دعا کی جب قید خانہ سے باہر نکلے تو اس کے دروازہ پر یہ الفاظ لکھے، ''هذى منازل البلوى، قبور الاحياء و شماتة الاعداء، و تجربة الاصدقاء'' یہ قید خانہ رنج ومحن کی جگہ اور زندوں کا قبرستان ہے، دشمنوں کی خوشی اور دوستوں کے امتحان کی جگہ ہے، اور جب دربار شاہی میں پہونچے تو ان الفاظ میں دعاء کی'' اللهم انى اسئلك بخيرك من خيره و اعوذ بعزتك و قدرتك من شره ''(اے اللہ میں اس کے خیر کے بجائے تیرے خیر کا طالب ہوں اور میں تیری عزت وقدرت کی پناہ چاہتا ہوں اس کے شر سے) پھر جب بادشاہ کے رو برو ہوئے تو اسے عربی زبان میں سلام کیا، بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کونسی زبان ہے، تو آپ نے فرمایا کہ میرے چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زبان ہے، پھر آپ نے اسے عبرانی زبان میں دعاء دی۔ تو اس نے پوچھا کہ یہ کونسی زبان ہے تو آپ نے جواب دیا کہ یہ میرے باپ دادا کی زبان ہے۔ شاہ مصر بہت سی زبانوں سے واقف تھا، اس نے جس زبان میں آپ سے بات کی آپ نے اسی زبان میں اسے جواب دیا۔ مگر وہ عبرانی اور عربی سے ناواقف تھا، گویا زبان دانی کے اعتبار سے بھی آپ کو اس پر فضیلت حاصل تھی، حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ سے آزاد ہوکر جس وقت شاہی دربار میں پہونچے ہیں، اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی اس نوجوانی میں آپ کے کمالات کو دیکھ کر بادشاہ متحیر ہوگیا، اور اپنے قریب بلا کر اپنے پاس تخت شاہی پر بٹھلالیا۔

فجاء الرسول يوسف فقال له اجب الملک الآن، اخرج عبدالحکیم فی فتوح مصر من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضی الله عنهما فاتاه الرسول فقال له: الق عنک ثیاب السجن، والبس ثیابا جددا، وقم الی الملک، واخرج ابن ابی شیبة وابن المنذر عن فرید العمی قال: ملا رأی یوسف عزیز مصر قال: اللهم انی اسئلک بخیرک من خیره و اعوذبعزتک من شره، قال البغوی: روی انه قام و دعا لاهل السجن وقال: اعطف علیهم قلوب الاخیار ولا تعم علیهم الاخبار، فهم اعلم الناس بالاخبار فی کل بلد، فلما خرج من السجن کتب علیٰ باب السجن هذا قبور الاحیاء، وبیت الاحزان، و تجربة الاصدقاء، وشماتة الاعداء، و تنظّف من درن السجن و لبس ثیاباحسنا و قصد الملک، قال وهب: فلما وقف بباب الملک قال: حسبی ربی من دنیای وحسبی ربی من خلقه، عزجاره وجل ثناؤه ولا الهٰ غیره، ثم دخل الدار، فلما دخل علی الملک قال: اللهم انی اسئلک بخیرک من خیره و اعوذبک من شره و شر غیره، فلما نظر الیه الملک سلم علیه یوسف بالعربیة فقال الملک: ما هذا اللسان، قال: لسان عمی اسماعیل علیه السلام، ثم دعا له بالعبرانیة فقال: ماهذا اللسان قال: لسان آبائی، ولم یعرف الملک هذین اللسانین، وقال وهب: وکان الملک یتکلم بسبعین لسانا، فکلما کلم بلسان اجابه یوسف بذالک اللسان، وزاد لسان العبرانیة والعربیة، فاعجب الملک ما رأی منه

مع حداثة سنة و كان و كان يوسف حينئذ ابن ثلاثين سنة فاجلسه .

(کبیر ج۹ ص ۱۲۷، مظہری ج۵ ص ۱۷۲، روح ج ۷ ص ۴، مطبع دار احیاء التراث الاسلامی، نسفی ج ۳ ص ۲۲۷)

فلما كلمه قال انک اليوم لدينا مكين امين :''فلما كلمه''میں ایک قول تو یہ ہے کہ ضمیر فاعل راجع ہے بادشاہ کی جانب اور ضمیر مفعول حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب، یعنی جب بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے بات چیت کی اور دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر فاعل حضرت یوسف علیہ السلام اور ضمیر مفعول بادشاہ کی طرف راجع ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے جب بادشاہ سے بات کی۔

''يجوز ان يكون الفاعل ضمير الملک والمفعول ضمير يوسف ويجوز العكس''. (الدر المصون ج ۶ ص ۱۵۱۵، کبیر ج ۹ ص ۱۲۷)

مكين: صفت مشبہ ہے فعیل کے وزن پر باب کرم سے ''امین'' امانت دار، امن والا، معتبر، مشتق ہے امانة اور امن سے، اسم فاعل کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور اسم مفعول کا بھی کیونکہ فعیل کا وزن دونوں میں مشترک ہے۔ فراء نے اس کو بمعنی فاعل بتایا ہے، اور بعض دوسرے علماء نے بمعنی مفعول۔ (لغات القرآن ج ۱ ص ۲۵۸)

''مکین امین'' فضائل ومناقب کی تمام اقسام کو شامل ہے:-

''مكين امين'' یہ کلمہ فضائل ومناقب کی تمام اقسام کو جامع اور شامل ہے، یعنی آپ ہمارے نزدیک بڑے ہی معزز ومعتبر ہیں، اس لئے کہ اعزاز واکرام اور اعتماد واعتبار کی تمام چیزیں آپ کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، بغوی کی روایت میں مذکور ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے منہ در منہ اپنے خواب کی تعبیر کو سننے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے تمام تفصیلات کے ساتھ اس کے خواب کی تعبیر کو دوبارہ اس کے سامنے بیان فرمایا، وہ اپنے خواب کی تفصیلات کو سن کر بہت ہی متعجب

ہوا، اور کہا کہ" انک الیوم لدینا مکین امین". (مظہری ج۵ ص۱۷۳)

شاہ مصر کی طلب پر حضرت یوسف علیہ السلام کا مشورہ:- اس کے بعد بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ مشورہ دیا کہ آپ اہل مصر کو ہدایت کردیں کہ پہلے سات سالوں میں وہ زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا کرنے کی کوشش کریں اور اس میں سے بچا کر حفاظت کے ساتھ رکھیں تا کہ قحط کے سالوں میں وہ ذخیرہ ان کے کام آئے، اور سرکاری محاصل کے طور پر جو غلہ آپ کو حاصل ہوا سے آپ باہر کے لوگوں کیلئے محفوظ رکھیں، کیوں کہ یہ قحط ملک مصر تک محدود نہیں بلکہ دور دراز کے علاقوں تک پھیلے گا، اور لوگ غلہ لینے کے لئے آپ کے پاس آئیں گے، اس پر بادشاہ نے کہا کہ اس کا انتظام کیسے ہوگا؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا کہ:" اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم".

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ.

یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزائن پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا۔

ترکیب ولغات:- جملہ قال.....مستانفہ برائے بیان، جملہ "اجعلنی" محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "انی حفیظ" جملہ تعلیلیہ ہے۔

خزائن بمعنی خزانے جمع ہے خزانة اور خزینة کی، الارض زمین، جمع ارضون، حفیظ بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے، حفاظت کرنے والا، نگہبان، یاد رکھنے والا، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے اس لئے کہ وہ ہر ایک کا نگہبان ہے۔

معارف وحقائق

قال اجعلنی الآیة کا مفہوم:- "اجعلنی علی خزائن الارض" لفظ ارض جس طرح پوری زمین کیلئے بولا جاتا ہے اسی طرح اس کا اطلاق زمین کے ہر خطے اور ہر ملک کی زمین پر بھی ہوتا ہے، یہاں ارض سے مراد ارض مصر ہے، اور بقول بعض ارض سے مراد جنس ارض، اور خزائن ارض سے مراد اس کی پیداوار ہے، یعنی آپ مجھ کو اپنی مملکت کے خزانوں کا مختار کر دیجئے۔ (وزیر محاصل و مالگزاری اور وزیر مالیات وخزانہ بنا دیجئے) یا مطلب یہ ہے کہ زمین کی پیداوار کا مختار کر دیجئے، (وزیر غذا بنا دیجئے)۔

ای ارض مصر و فی معناہ قول بعضهم ارضک التی تحت نصرتک، و قیل اراد بالارض الجنس و بخزائنها الطعام الذی یخرج منها. (روح ج ۷ ص ۵)

"انی حفیظ علیم" مجھے اپنی مملکت کے خزانوں کا مختار اس لئے کر دیجئے کہ ایسے بڑے اور ذمہ دار عہدہ کیلئے دو ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دیانت وامانت اور دوسرے اس کام سے واقفیت، اور یہ دونوں وصف مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی تمام مملکت کا امین وکفیل بنا دیا۔ اور شاہی خزانوں کی کنجیاں ان کے حوالہ کر کے مختار عام کر دیا۔

اپنی تعریف اور طلب ولایت کا جواز:- حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی امانت ودیانت اور کارگذاری کا اظہار خود کیا۔ اور خود سے عہدہ کو طلب کیا تا کہ وہ اس کے ذریعہ احکام خداوندی کو مخلوق کے اندر جاری کر سکیں۔ عدل وانصاف کو پھیلائیں اور حق کو قائم کریں اور انبیاء علیہم السلام اسی کام کیلئے دنیا میں تشریف لاتے ہیں، اور ان کی بعثت کا مقصد یہی ہوتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کو چونکہ یہ بات معلوم تھی کہ میرے علاوہ کوئی اور اس کام کو انجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتا، تو آپ نے رضاء الٰہی کے واسطے حکومت کے عہدہ کو طلب کیا، جاہ واقتدار کا حاصل کرنا مقصود نہیں تھا، اور خلفاء راشدین کا مقصد بھی امور خلافت میں مشغول ہونے سے یہی تھا:

وصف یوسف نفسه بالامانة والكفاية و طلب الولاية ليتوصل بها الى امضاء احكام الله واقامة الحق و بسط العدل مما يبعث لاجله الانبياء الى العباد ، لعلمه ان احدا غيره لا يقوم مقامه فى ذلك . فما كان طلبه الولاية الا لا بتغاء وجه الله لا لحب الجاه والدنيا ، ومن هذا القبيل اشتغال الخلفاء الراشدين بامر الخلافة. (مظہری ج۵ ص۱۷۳)

علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب مقصود خلق کی نفع رسانی ہو نفس پروری نہ ہو اور خدمت خلق کی کوئی صورت اس کے علاوہ باقی نہ رہ جائے تو اپنے کو عہدہ

ومنصب کیلئے پیش کر دینا جائز اور درست ہے۔

بوقت ضرورت فاسق اور کافر حکمرانوں کے عہدہ کو قبول کر لینا بھی درست ہے:-

یہاں تک کہ فاسق بلکہ کافرانہ نظام حکومت کے ماتحت بھی عہدہ و منصب قبول کر لینا حرام نہیں رہ جاتا، چنانچہ اسلاف نے ظالم حکمرانوں کی طرف سے عہدہ قضا کو قبول فرمایا، اور جب نبی یا عالم دین کو یہ معلوم ہو جائے کہ حکم خداوندی کا نفاذ اور رفع ظلم، فاسق یا کافر بادشاہ کے عہدہ کو قبول کئے بغیر نہیں ہو سکتا تو اس کیلئے اپنے کو پیش کر دینا اور اسے قبول کر لینا نہ صرف یہ کہ درست بلکہ مستحسن ہے۔

وفیه دلیل علی جواز طلب التولیة واظهار انه مستعد لها والتولی من ید الکافر اذا علم انه لا سبیل الی اقامة الحق و سیاسة الخلق الا باالاستظهار به. (بیضاوی) و فیه دلیل علی انه یجوز ان یتولی الانسان عمالة من ید سلطان جائز و قد کان السلف یتولون القضاء من جهة الظلمة، واذا علم النبی او العالم انه لا سبیل الی الحکم بامر الله تعالیٰ و رفع الظلم الا بتمکین الملک الکافر او الفاسق فله ان یستظهر به. (مدارک ج۲ص۲۲۷)

"فان کان الملک کافراً او لا سبیل الی الحکم بامر الله و رفع الظلم الا بتمکینه فللمتولی ان یستظهر به. (بحرج ج۵ص۳۱۹)

بیضاوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو شاید قرائن سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ بادشاہ کوئی عہدہ میرے حوالہ کرنا چاہتا ہے، لہذا آپ نے عہدہ کی تعیین فرما دی اور ایسے کام اور عہدہ کو طلب کیا جس کا فائدہ عمومی تھا، اور اس سے تمام لوگ مستفید ہو سکتے تھے۔

قال البیضاوی لعل یوسف لما رای ان یستعمله الملک فی امر لا محالة اثر ما یعم فوائده و یجل عوائده. (مظہری ج۵ص۱۷۳)

بہر حال جب اپنے اوپر مکمل اعتماد و بھروسہ ہوا اور عدل و انصاف اور خلق کی نفع رسانی کا فرو فاسق اور جابر حکمرانوں کے عہدہ کو قبول کرنے ہی میں ہو تو پھر اسے قبول کر لینے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں بلکہ بسا اوقات اس کا قبول کر لینا لازم وضروری ہو جاتا ہے، اور قبول نہ کرنے کی صورت میں مواخذہ خداوندی کا خطرہ واندیشہ موجود ہوتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام حاکم نہیں بلکہ مشیر تھے، اور بادشاہ ان کے مشورہ سے خود حکم جاری کرتا تھا، اور آپ کی رائے میں دخل نہیں دیتا تھا، گویا احکام کے اجراء میں وہ آپ کے تابع تھا۔

"وقیل کان الملک یصدر عن رأیه ولا یعترض فی کل ما رأی فکان فی حکم التابع له. (مظہری ج۵ص۱۷۴)

کبھی فاسق اور کافر حکمراں کے عہدہ کو طلب کرنا ضروری ہو جاتا ہے:-

اور بسا اوقات کافر و فاسق حکمراں کے عہدہ کو طلب کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے تاکہ خداوند قدوس کے واجب کردہ احکام کا اجراء ہو سکے۔ اور اس اجراء احکام کیلئے وہی طالب متعین ہو، اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کام کو انجام نہ دے سکتا ہو۔ اور رہی حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اے عبدالرحمٰن تم حکومت و امارت کا سوال نہ کرنا کیونکہ سوال کی بنا پر اگر وہ تم کو دیدی گئی تو تم اس کے حوالہ کر دیئے جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری کوئی امداد و اعانت نہ ہوگی، اور اگر بغیر سوال کے وہ تمہارے حوالہ کر دی گئی تو خدا کی طرف سے تمہاری امداد و اعانت ہوگی، اس روایت کا مذکورہ مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ کسی عہدہ

وغیرہ کے سوال کی ممانعت اس صورت میں ہے جبکہ اپنے اوپر اعتماد نہ ہو یا کوئی دوسرا بہتر طریقہ سے اس کو انجام دینے والا موجود ہو۔

و ربما يجب عليه الطلب اذا توقف على ولايته اقامة واجب مثلا و كان متعينا لذالک، وما في الصحيحين من حديث عبدالرحمن بن سمرة قال : قال رسول الله ﷺ : يا عبدالرحمن لا تسأل الامارة فانک ان اوتيتها عن مسألة و كلت اليها وان اعطيتها من غير مسألة اعنت عليها. (وارد في غير ماذكر) (بخاری۶۶۲۲/مسلم۱۶۵۲)

اور مجاہد سے منقول ہے کہ بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔

و عن مجاهد انه اسلم الملک على يده. (روح ج۷ص۵)

" انی حفیظ علیم" سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ضرورت کے مواقع پر اپنے فضل وکمال کا اظہار اس تزکیہ نفس اور پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں ہے، جس کی ممانعت آیت کریمہ" فلا تزکوا انفسکم "میں وارد ہے۔ بشرطیکہ اظہار کمال وفضل غرور اور تکبر کی بنا پر نہ ہو۔

عطاء خداوندی کی بوالعجبی:- خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عطاو کرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی، جو بدوی تھا اور غلام بھی اس کو پہلے ایک سردار کے گھر کا مختار، اس کی نگاہوں میں محترم ومعزز اور امین وفطین بنا دیا، اور پھر قید خانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکت مصر اور قوم مصر کا مالک ومختار بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہونچا دیا کہ اسباب دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا، یہ قادر مطلق کی کارفرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے، کہ کل جو

کنعان میں گلہ بانی کررہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مالک ومختار بن کر جہاں بانی کررہا ہے، سچ ہے جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہوگیا اس کے لئے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں، اور حالات کی نامساعدت پرکاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتیں۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۱۳)

حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح:- تفسیری روایات میں مذکور ہے کہ جس زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام ملک مصر کے مختار وحکمراں بنے اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر عزیز مصر کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ نے زلیخا کا عقد آپ سے کردیا، عقد کے بعد جب زلیخا سے آپ کی ملاقات ہوئی تو آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جس کو اختیار کرنے کی تم نے کوشش کی تھی، اس پر اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ مجھے ملامت نہ کریں، آپ کو میرا حسن وجمال تو معلوم ہی ہے اور دنیا کی تمام نعمتیں بھی مجھے حاصل تھیں، مگر میرا شوہر عورتوں کے قابل نہ تھا، اور آپ کے حسن وجمال کا تو پوچھنا ہی کیا کہ وہ خداداد تھا، لہذا مجھ سے صبر نہ ہوسکا، بقول اہل روایت حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کو دوشیزہ پایا، اور زلیخا کے بطن سے آپ کے دولڑکے افرائیم اور میشا نامی پیدا ہوئے۔

"واخرج ابن جرير وابن ابی حاتم عن ابن اسحاق قال: ذكروا ان قطفير هلك فی تلك الليالی، فزوج الملك يوسف زليخا امرأة قطفير فلما دخل عليها قال: اليس هذا خيرا مما كنت تريدين؟ فقالت: ايها الصديق! لا تلمنی فانی كنتُ امرأة كما ترى حسنا وجمالا، ناعمة كما ترى فی ملك و دنيا، وكان صاحبی لا يأتی النساء، وكنتَ كما جعلك الله فی حسنك و هيئتك، فغلبتنی

نفسی علیٰ مارایتُ، فزعموا الله وجدها یوسف عذراء، فاصابها فولدت له رجلین افرائیم و میشا".

(مظہری ج ۵ ص ۱۷۴، روح ج ۷ ص ۵، مدارک ج ۲ ص ۲۲۸، کبیر ج ۵ ص ۳۳۰)

نکاح والی روایت کو ابن کثیر نے بھی بغیر کسی نکیر کے ذکر کیا ہے۔

(ابن کثیر ج ۲ ص ۴۶۷)

مگر علامہ عثمانی لکھتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک یہ روایت قابل اعتماد نہیں ہے۔ (فوائد عثمانی ص ۳۲۱)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ، وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ .

اور پوری قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا تھا، پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں اور ضائع نہیں کرتے ہم بدلہ بھلائی والوں کا اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے اور رہے پرہیزگاری میں۔

ترکیب:- جملہ "مکنا" مستانفہ، جملہ "یتبوأ" محلا منصوب حال ہے یوسف سے، جملہ "یشاء" محلا مجرور مضاف الیہ، جملہ "نصیب" تعلیلیہ، جملہ "نشاء" صلہ ہے اسم موصول من کا، جملہ "لا نضیع" معطوف ہے جملہ "نصیب" پر، جملہ اجر الآخرۃ خیر محلا منصوب حال واقع ہے، جملہ آمنوا صلہ ہے موصول الذین کا، جملہ "کانوا" معطوف ہے جملہ "آمنوا" پر، جملہ "یتقون" محلا منصوب خبر ہے کان کی۔

وکذالک مکنا لیوسف فی الارض اگر "مکنا" کا مفعول محذوف مانا جائے تو "لیوسف" میں لام متعلق ہوگا "مکنا" کے، تقدیر عبارت "مکنا لیوسف الامور ہوگی، (ہم نے یوسف کو تمام امور پر قدرت عطا کردی) یا لام "مکنا" کے متعلق ہوگا، جب کہ مفعول بہ حیث کو قرار دیا جائے۔

یتبوأ منها حیث یشاء" یتبوأ یوسف سے حال واقع ہورہا ہے۔اور منها "یتبوأ" کے متعلق ہے۔اور حیث ظرف ہے یتبوأ کا، یا اس کا مفعول بہ ہے۔ "یشاء" میں ضمیر راجع ہے۔"یوسف" کی جانب۔

یجوز فی هذه اللام ان تکون متعلقة ب "مکنا" علی ان یکون مفعول "مکنا" محذوفا تقدیره مکنا لیوسف الامور او علی ان یکون المفعول به "حیث".

"یتبوأ" جملة حالیة من "یوسف" و "منها" یجوزان تتعلق ب "یتبوأ" و "حیث" یجوز ان یکون ظرفاً ل یتبوأ و یجوز ان یکون مفعولا به "یشاء" بالیاء علی انه ضمیر یوسف. (الدرالمصون ج:۶ص:۱۶/۵۱۵)

معارف وحقائق

وکذلک مکنا الآیة کا مفہوم:- "وکذلک مکنا "الآیۃ، یعنی جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ مصر کے دربار میں ہم نے عزت ومنزلت عطا کی اسی طرح ہم نے ان کو پورے ملک مصر کا حاکم وفرمانروا بنا دیا، اور مکمل طور پر امور مملکت کو ان کے قبضہ وتصرف میں دے دیا، اور احکامات کے جاری ونافذ کرنے میں ان کو مختار بنا دیا، کہ جہاں چاہتے اترتے اور جو چاہتے تصرف کرتے، گویا بادشاہ کا صرف نام رہ گیا تھا، حقیقت میں بادشاہی یوسف کررہے تھے۔

"نصیب برحمتنا" جولوگ نیکوکار اور نیک کردار ہیں ان کیلئے تو اجر کا وعدہ ہے ہی یعنی ان کو تو ہم اپنی رحمت سے نوازتے ہی ہیں، اور ہم جسے چاہتے ہیں بلا استحقاق بھی اپنی رحمت وفضل سے نواز دیتے ہیں۔اور نیکوکاروں کے اجر کو ہم کبھی ضائع نہیں کرتے بلکہ ہم ان کو ان کا اجر پورا پورا عطا کرتے ہیں۔خواہ اسی دنیا میں نقد یا

آخرت میں۔

سلطنت وحکومت عطاء خداوندی ہے:- " نصیب برحمتنا من نشاء " سے معلوم ہوا کہ سلطنت وحکومت افضال الٰہی اور اس کے فضل وکرم میں داخل ہے اور اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ (کبیر ج۹ ص۱۳۱)

" ولا نضیع اجر المحسنین " اجر کا ضائع کرنا یا تو عجز یا بخل یا جہل کی بنا پر ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ تمام چیزیں ممتنع ہیں، اس لئے خدا کسی کے اجر وثواب کو ضائع کردے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

وذلک لان اضاعة الاجر اما ان یکون للعجز او للجهل او للبخل والکل ممتنع فی حق الله تعالیٰ فکانت الاضاعة ممتنعة. (کبیر ج۹ ص۱۳۱)

آخرت کا اجر وثواب سب سے بہتر ہے:- "ولأجر الآخرة خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون: یعنی تقویٰ اور طہارت کی بنا پر اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دنیا میں بڑا مقام ومرتبہ حاصل ہوا (کہ ملک مصر جیسے متمدن ملک کے مطلق العنان فرمانروا بنے) لیکن وہ اجر وثواب جسے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کیلئے خاص کر رکھا ہے وہ انتہائی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ (کہ اس کے حسن وفضل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا) آخرت کے اجر وثواب کی بہتری کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ قال الله اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر. (بخاری ۳۲۴۴/مسلم ۲۸۲۴)

میں نے اپنے صالح بندوں کیلئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں کہ نہ تو کسی آنکھ نے اسے

دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور آیا)۔

ارشاد باری تعالیٰ: "ما اخفی لهم من قرة عین" (سجدہ ۱۷) اس کی واضح دلیل ہے۔

آخرت کے اجر وثواب کو اعلیٰ درجہ کا قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ خیر مطلق وہ چیز کہلاتی ہے جس کا نفع خالص، دائمی، اور مقرون بالتعظیم ہو اور یہ تمام چیزیں خیرات آخرت میں موجود اور خیرات دنیا میں مفقود ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام ہمہ وقت صفت تقویٰ سے متصف تھے:۔

"ولأجر الآخرة خير للذين آمنوا وكانوا يتقون": آیت کریمہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حال کی شرح ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ وہ مومن ومتقی ہیں اور "كانوا يتقون" میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمانہ ماضی میں ان کے تقویٰ کی صراحت موجود ہے۔ گویا اس بات کو بیان کر دیا گیا کہ قول باری تعالیٰ "ولقد همت به وهم بها" کے وقت بھی وہ صفت تقویٰ کے ساتھ موصوف تھے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو متقی، محسن اور مخلص قرار دیا ہے تو پھر کسی کو ہرگز یہ حق نہیں پہونچتا کہ ان کی جانب کسی ایسی بات کو منسوب کرے جو ان کے مقام اتقاء، احسان اور اخلاص کے مناسب نہ ہو۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر ج ۹ ص ۱۳۱)

"وكانوا يتقون" سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ مومن کو اس کے حسنات پر دنیا وآخرت دونوں میں اجر ملتا ہے اور فاسق وفاجر کو اسکے اچھے کاموں کا اجر دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

"قال سفيان بن عيينه المومن يثاب على حسناته فى الدنيا والآخرة، والفاجر يعجل له الخير فى الدنيا وما له فى الآخره من خلاق". (مدارک ج ۲ ص ۲۲)

ولا نضیع اجر المحسنین الآیة عام ضابطۂ خداوندی ہے:-

ولا نضیع اجر المحسنین و لاجر الآخرہ: الآیہ، یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہ آیات اگر چہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں مگران میں عام خداوندی ضابطہ کو بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ اجر دنیا وآخرت حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو بھی حسن عمل اور تقویٰ وطہارت کی صفت سے متصف ہوگا، ہم اسے دنیا وآخرت دونوں کی بھلائیوں سے بھرپور حصہ عطا کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے تمکین فی الارض:- سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے دوجگہ ''تمکین فی الارض'' کی بشارت سنائی گئی ہے، اور دونوں مقاموں پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس کے متعلق مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب لکھا ہے: ''حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نکتے تھے، ایک وہ جب وہ غلام ہوکر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہوگئے، دوسرا یہ کہ قید خانہ سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسند اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے، پس جب پہلے انقلاب تک سرگذشت پہونچی تھی تو آیت: ۲۱ میں حکمت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ ''کذالک مکنا لیوسف فی الارض'' اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت: ۵۶ میں فرمایا: ''کذالک مکنا لیوسف فی الارض'' وہاں چونکہ معاملۂ مصر کی ابتدا ہوئی تھی اور ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی، اس لئے فرمایا تھا: ''وعلمه من تاویل الاحادیث واللہ غالب علی امرہ'' یہاں چونکہ تکمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہوگیا تھا، اس لئے فرمایا: لا نضیع اجر المحسنین'' یہ اس لئے ہوا کہ ہمارا قانون ہے، نیک

عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا، ضروری ہے کہ پھل لائے۔ (ترجمان القرآن ج۲ص۲۳۵)

نوٹ: شروع واقعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ سورہ یوسف کا نزول یہودیوں کے اس سوال پر ہوا جو انہوں نے مشرکین مکہ کے ذریعہ نبی اکرم ﷺ سے کیا تھا وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل مصر میں کیسے آئی؟ اس لئے آیت زیر بحث کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں: یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ "اولاد ابراہیم اس طرح شام سے آئی مصر میں، اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا تا کہ ذلیل ہو اور اللہ نے زیادہ عزت دی، اور ملک پر اختیار دیا، ویسا ہی ہوا ہمارے حضرت (ﷺ) کو (موضح القرآن سورہ یوسف)۔

قحط سالی سے محفوظ رہنے کی تدبیر یوسفی:- غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت مصر کے مختار کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکیں، اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے، چونکہ یہ تفصیل خواب اور اس کی تعبیر کے ضمن میں خود بخود ذہن میں آجاتی ہے اس لئے قرآن عزیز نے واقعہ کے ان غیر ضروری حصوں کو بیان نہیں کیا۔

غلہ حاصل کرنے کی غرض سے برادران یوسف علیہ السلام کی مصر روانگی:-

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں بھی سخت کال پڑا اور کنعان میں خاندان یعقوب علیہ السلام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب حالت نزاکت اختیار کر گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں عزیز مصر نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس غلہ محفوظ ہے تم سب جاؤ اور غلہ خرید کر لاؤ، چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز مصر سے غلہ لینے کیلئے

مصر روانہ ہوا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ برادران یوسف کا یہ قافلہ اسی بھائی سے غلہ لینے چلا ہے جس کو اپنے خیال میں وہ کسی مصری گھرانے کا معمولی گمنام غلام بنا چکے تھے، مگر اس یوسف فروش قافلہ کو کیا معلوم کہ وہ کل کا غلام آج مصر کے تاج وتخت کا مالک ومختار ہے، اور اس کو اسی کے سامنے عرض حال کرنا ہے۔ بہر حال کنعان سے چلے اور مصر جا پہونچے، اور جب دربار یوسفی میں پیش ہوئے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا، اور کیوں نہ پہچانتے، رنگ ڈھنگ، بول چال، لب ولہجہ، نقش ونگار، شکل وصورت اور ساری ادائیں یوسف علیہ السلام کی جانی پہچانی تھیں، البتہ وہ یوسف کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے، کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج وہ تقریباً چالیس سال کا تجربہ کار انسان ہے، نقشہ وصورت ورنگ اور بول چال سے کچھ شبہہ بھی کرتے تو کس طرح؟ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یوسف اور تخت شاہی؟ مگر یہ واقعہ تھا، حقیقت تھی، اور اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ رب العالمین کا وہ معاملہ تھا جو صفحۂ دنیا پر ثبت ہوکر رہا، ملاحظہ کیجئے۔ آیت: ۵۸ (قصص القرآن ج۱ص۳۱۶)

(ساتویں رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُوْنَ.

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ نہیں پہچانتے۔

ترکیب:- جملہ جاء اخوة .....مستانفہ، جملہ دخلوا.....معطوف ہے، جاء اخوة یوسف پر، جملہ عرفهم معطوف ہے جملہ دخلوا پر، جملہ هم له منكرون محلا منصوب حال ہے عرفهم کے مفعول سے۔

معارف و حقائق

برادران یوسف علیہ السلام دربارِ یوسفی میں:- "وجاءت اخوة یوسف فدخلوا علیه فعرفهم وهم له منكرون" برادران یوسف علیہ السلام کا مصر آنا اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا ان کو پہچان لینا، اور ان کا حضرت یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکنا، یہ تمام تفصیلات ماقبل میں بیان کی جا چکی ہیں۔ آیت کریمہ کا واضح مفہوم یہ ہے کہ قحط جب عام ہوا اور ملک مصر سے تجاوز کر کے علاقۂ فلسطین وغیرہ میں بھی پہونچا تو چونکہ وہاں اس کے دفعیہ کا کوئی انتظام نہ تھا، اور مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن تدبیر سے اس کے دفعیہ کا انتظام تھا، وہ بھی ایسا کہ نہ صرف مصر والوں کو غلہ ملے بلکہ باہر والوں کے ہاتھ بھی نرخ مقرر اور مقدار معین کے ساتھ فروخت ہوتا رہا، چنانچہ قحط سے مجبور ہو کر والد نامدار کے حکم سے برادران یوسف علیہ السلام غلہ لینے کیلئے مصر میں داخل ہوئے، حضرت یوسف علیہ السلام انہیں دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ ان کے اندر

کوئی خاص تغیر نہیں ہوا تھا، پھر تن وتوش، شکل وصورت، چال ڈھال، زبان اور لب لہجہ ہر ایک کی شہادت موجود تھی، مزید برآں ان پر جاسوسی وغیرہ کا شبہہ ظاہر کر کے پوری تحقیق بھی کر لی کہ یہ اللہ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزند ہیں، اور حضرت یوسف علیہ السلام بچپن سے گزر کر جوانی، اور اب جوانی کی سرحد کو بھی پار کر رہے تھے، پھر یہ کہ ان بھائیوں کو اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ جسے قافلہ والوں کے ہاتھوں فروخت کر کے غلامی کا طوق گلے میں ڈال دیا ہے وہ مصر کی سلطنت کا مختار کل بھی بن سکتا ہے، اس لئے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکے کہ یہ ان کا وہی غریب اور بے یار ومددگار بھائی ہے۔

بلاغت:- فعرفهم و هم لهم منكرون ۔عرف اور انکر کے درمیان صنعت طباق پائی جاتی ہے۔ (صفوہ)

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ.

اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب کہا کے لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو تمہارا ہے باپ کی طرف سے تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا ہوں اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو، پھر اس کو اگر نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لئے بھرتی نہیں میرے نزدیک اور میرے پاس نہ آئیو، بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے۔

ترکیب ولغات:- ولما جهزهم الآية، جملہ جهزهم، محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ قال جواب شرط غیر جازم، جملہ ائتونی محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "الاترون" مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ "اوفی" محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ "انا خیر" محلاً مرفوع معطوف ہے جملہ اوفی پر، فان لم تاتونی محلاً منصوب معطوف ہے جملہ ائتونی پر، جملہ لا کیل لکم محلاً مجزوم جواب شرط مقترن بالفاء، جملہ لا تقربون محلاً مجزوم معطوف ہے جملہ جواب شرط پر، جملہ قالوا مستانفہ برائے بیان، جملہ "سنراود" محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ "انا لفاعلون" برائے تاکید معطوف ہے جملہ سنراود پر۔

ولما جهزهم بجهازهم، بفتح الجيم وهو المشهور وبكسرها۔ کھانے پینے اور دوسری ضرورت کی چیزیں جن کا انسان حاجت مند ہوتا

ہے اسے جہاز کہتے ہیں۔

" قال ائتونی باخ لکم من ابیکم : حضرت یوسف علیہ السلام نے اضافت کے ساتھ " باخیکم " کہنے کے بجائے بغیر اضافت " باخ لکم " کہا، بطور مبالغہ اس بات کو ظاہر کرنے کیلئے کہ میں تم کو بالکل نہیں پہچانتا کہ تم کون ہو۔

" لم یقل باخیکم مبالغة فی اظهار عدم معرفته لهم.

(ابوسعود ج ۴ ص ۲۸۸، روح ج ۷ ص ۸)

أوفی الکیل: کیل غلہ وغیرہ ناپنے کا پیمانہ، ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ غلہ نہ ملتا تھا، جس کی مقدار قرطبی نے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے، جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دوسو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

(معارف ج ۵ ص ۸۴، بحوالہ قرطبی)

" المنزلین " اسم فاعل جمع مذکر مجرور معرفہ، انزال مصدر، اتارنے والے یعنی مہمان کو ٹھہرانے والے، چونکہ عموماً دور کا مسافر سواری میں آتا ہے، اور میزبان اس کو اتارتا ہے، اس لئے منزل (اتارنے والا) میزبان ہوگیا۔

معارف و حقائق

ولما جهزهم بجهازهم :الآیہ بھائیوں کو پہچان لینے کے بعد مزید اطمینان کے واسطے حضرت یوسف علیہ السلام نے والد، اپنے حقیقی بھائی اور گھر کے حالات کو خوب کرید کرید کر پوچھا، اور آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم کرلیا، اور پھر مکمل اطمینان ہوجانے کے بعد ایک ایک اونٹ بوجھ کے بقدر ان کو غلہ دیا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ قحط اس قدر سخت ہے کہ تم کو پھر دوبارہ یہاں آنا پڑے گا، اور تم یہ بتا چکے ہو کہ تمہارا ایک علاتی بھائی تو جنگل میں گم ہوگیا، اور اس کا ایک حقیقی بھائی ہے جسے والد نے تسلی

خاطر کے واسطے اپنے پاس روک رکھا ہے تو یہ یاد رکھو کہ جب تم دوبارہ آنا تو اپنے اس علاتی بھائی کو ضرور لے آنا تا کہ تمہاری صداقت واضح ہو جائے، اور ایک اونٹ غلہ اس کے حصہ کا بھی مل جائے، اور اس کو نہ لانے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے، جبکہ تم یہ دیکھ رہے ہو کہ میں غلہ پورا دینے کے ساتھ ساتھ مہمانوں یعنی باہر سے آنے والوں کا کافی اعزاز و اکرام کرتا ہوں، ''ألا ترون'' ''بعد التجهيز'' یعنی غلہ دینے کے بعد صیغۂ استقبال کا لانا اس بات کو بتانے کیلئے ہے کہ یہ میری عادت مستمرہ ہے۔ وایثار صيغة الاستقبال مع كون هذ الكلام بعد التجهيز للدلالة على ان ذلك عادة له مستمرة اور ''انا خير المنزلين'' جملہ حالیہ ہے، یعنی کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں نے تم کو غلہ بھی پورا دیدیا اس حال میں کہ میں نے تمہاری بہترین ضیافت بھی کی، ''جملة حالية اى الا ترون انى أوفى الكيل لكم ايفاء مستمرا والحال انى فى غاية الاحسان فى نزالكم و ضيافتكم.

(ابوسعود ج ۴ ص ۲۸۸، روح ج ۷ ص ۹)

الاترون الآية بطور احسان نہیں بلکہ بنیامین کو لانے کی ترکیب کے طور پر ہے:-

''الا ترون'' حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ احسان جتلانے کیلئے نہیں بلکہ بھائیوں کو اس بات پر ابھارنے اور آمادہ کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ جس کا میں تم کو حکم دے رہا ہوں، یعنی اپنے علاتی بھائی کو لانے کا اس پر تم ضرور عمل کرنا۔

''ولم يقله عليه السلام بطريق الامتنان بل لحثهم على ما امرهم به''. (بحوالہ سابق)

''فان لم تاتونى به فلا كيل لكم عندى'' یعنی دوبارہ آتے وقت اگر تم اپنے علاتی بھائی کو نہ لائے تو میں تم کو کاذب سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ تم دھوکہ

دیکر ایک اونٹ غلہ زائد لینا چاہتے تھے۔ لہذا اسے ضرور لانا ورنہ پورا غلہ ملنا تو دور کی بات ہے سرے سے تم کو کچھ ملے گا ہی نہیں۔

" الا تـرون " میں ترغیب تھی اور اس میں ترہیب ہے۔ اور مقصد دونوں کا ایک ہے یعنی دوبارہ آتے وقت علاتی بھائی کو ساتھ لانے پر ابھارنا۔

" ولا تقربون " یعنی اس علاتی بھائی کو ساتھ نہ لانے کی صورت میں مہمانی اور حسن سلوک تو الگ رہے تم کو میری مملکت میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

" ولا تقربون " لا کے لاء نہی ہونے کا بھی احتمال ہے۔ بایں صورت " تقربون " مجزوم ہوگا اور اس کے لائے نفی ہونے کا بھی احتمال ہے۔ نفی کیلئے ہونے کی ایک صورت تو یہ ہوگی کہ وہ داخل ہو جزاء کے حیز میں اور اس پر معطوف ہو تو اس وقت بھی۔ " تقربون " مجزوم ہوگا، اور دوسری صورت یہ ہے کہ " لا " بالاستقلال نفی کیلئے ہو شرط کی جزا پر معطوف نہ ہو تو " لا تـقـربـون " خبر ہوگا نہی کے معنی میں۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ " فلا رفث " خبر بمعنی نہی ہے۔

" ولا تقربون " یحتمل ان تکون " لا " ناهية فيكون " تقربون " مجزوما و يحتمل ان تكون " لا " نافية و فيه وجهان : احدهما ان يكون داخلا فی حيز الجزاء معطوفاً عليه فيكون ايضا مجزوما علىٰ ما تقدم ، والثانی: انه نفی مستقل غير معطوف على جزاء الشرط وهو خبر فی معنى النهی كقوله " فلا رفث " (الدر المصون ج ۶ ص ۵۱۷)

مواقع ضرورت پر حکام کی طرف سے راتب بندی کا حکم :-

فقہاء نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس طریق عمل نے ثابت کر دیا کہ خشک سالی کے زمانہ میں جب ہلاکت نفوس کا اندیشہ ہونے لگے تو حکام کیلئے

جائز ہے کہ ہر فرد کیلئے اس کی ضرورت کے مطابق راتب بندی کر دیں۔

" وفی ما قص اللہ تعالیٰ علینا من قصہ یوسف و حفظ للاطعمۃ فی سنی الجدب ، قسمتہ علی الناس بقدر الحاجۃ دلالۃ علی ان الائمۃ فی کل عصر ان یفعلوا مثل ذالک اذا خافوا ھلاک الناس من القحط. (تفسیر ماجدی ج۲ص۶۲۳، بحوالہ جصاص رازی)

" قالوا سنراود اباہ وانا لفاعلون" یعنی رفق ونرمی سے اور سمجھا بجھا کر ہم والد کو آمادہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے کہ وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہو جائیں۔ برادران یوسف کو چونکہ اس بات کا یقین تھا کہ وہ والد کو ضرور راضی کر لیں گے۔ اور والد ضرور تیار ہو جائیں گے۔ کیونکہ بنیامین کے ساتھ آنے میں ایک اونٹ کے بقدر غلہ زیادہ ملے گا اس لئے انہوں نے کہا "انا لفاعلون".

بھائیوں کے ساتھ مدارات اور والد محترم کی خبر گیری نہ کرنے کی وجہ:-

برادران یوسف غلہ لینے کیلئے جب ملک مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی اور شاہی مہمان بنا کر رکھا، تمام حالات وغیرہ کی معلومات بھی حاصل کی، اور اس علم کے باوجود کہ والد محترم کو ان سے بے پناہ محبت ہے۔ اور جدائی کی بنا پر وہ بے انتہاء غمزدہ اور پریشان ہوں گے، مگر پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی کوئی خبر والد کو نہ دی جبکہ وہ اس پر نہ صرف یہ کہ قادر تھے بلکہ بلا توقف خدمت اقدس میں حاضر ہونے کی قدرت موجود تھی، تو اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلا و امتحان اور اجر کی تکمیل کے واسطے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو اس سے روک دیا گیا تھا۔

''والظاهر ان ما فعله معهم كان بوحي والا فالبر يقتضي ان يبادر الى ابيه ويستدعيه لكن الله سبحانه اراد تكميل اجر يعقوب في محنته وهو الفعال لما يريد في خليقته''. (روح ج ۷ ص ۹)

" وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَا إِذَا انْقَلَبُوْا إِلٰى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ فَلَمَّا رَجَعُوْا إِلٰى أَبِيْهِمْ قَالُوْا يَاأَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنْتُكُمْ عَلٰى أَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ .

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ.

اور کہہ دیا اپنے خدمت گاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں شاید اس کو پہچانیں جب پھر پہونچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں، پھر جب پہونچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی ہم سے بھرتی سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں، کہا میں اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی پر اس سے پہلے، سو اللہ بہتر ہے نگہبان اور وہی سب مہربانوں سے مہربان۔

ترکیب ولغات:- جملہ قال..... مستانفہ، جملہ اجعلوا..... محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ لعلهم يعرفونها..... جملہ تعلیلیہ، جملہ يعرفونها..... محلا مرفوع خبر ہے لعل کی، جملہ انقلبوا..... محلا مجرور مضاف الیہ اور جواب شرط محذوف ہے، جس پر ماقبل دلالت کررہا ہے، ای اذا انقلبوا، فلعلهم يعرفونها، جملہ لعلهم يرجعون..... مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ يرجعون..... محلا مرفوع خبر ہے، لعل ثانی کی، جملہ رجعوا..... محلا مجرور مضاف الیہ، جملہ قالوا جواب شرط غیر جازم، جملہ يا ابانا..... محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ منع منا الكيل .....،

جواب ہے ندا کا، جملہ ارسل..... محلاً مجزوم جواب ہے شرط مقدر کا ای ان رغبت فی الکیل فارسل ، جملہ نکتل..... جواب ہے شرط مقدر کا اور مقترن بالفاء ہے، ای ان ترسل معنا اخانا نکتل ، جملہ انا له لحافظون.....، محلاً منصوب حال ہے، نکتل کے فاعل سے، جملہ قال.....مستانفہ، جملہ هل آمنکم.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ اَمنتکم..... صلہ ہے موصول حرفی (ما) کا، جملہ واللہ خیر حافظاً ..... مستانفہ یا شرط مقدر کا جواب ہے، ای : ان ارسلته معکم فاللہ خیر حافظاً، جملہ هو ارحم.....، معطوف ہے جملہ، اللہ خیر پر۔

" وقال لفتیٰنه " حمزہ، کسائی اور حفص نے الف اور نون کے ساتھ "لفتیانه" پڑھا ہے۔ اور باقی قراء سبعہ نے تاء کے ساتھ بغیر الف کے " لفتیته " پڑھا ہے، الفتیان جمع کثرت اور الفتیة جمع قلت ہے، دونوں جمع ہیں، فتیٰ کی اور یہ دونوں لغتیں مستعمل ہیں، جیسا کہ صبی کی جمع صبیان اور صبیۃ دونوں آتی ہیں، بقول صاحب روح المعانی پہلی قرأت راجح ہے، کیونکہ آگے رحالهم بھی جمع کثرت ہے۔ (مظہری ج ۵ ص ۱۷۷، روح ج ۷ ص ۱۰، الدر المصون ج ۶ ص ۵۱۷)

معارف و حقائق

حضرت یوسف علیہ السلام نے غلہ ناپنے والے غلاموں اور خادموں کو حکم دیتے ہوئے کہا "اجعلوا بضاعتهم " بضاعة پونجی، سامان تجارت بضع سے ماخوذ ہے، گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے جو کاٹ کر علیحدہ کئے جائیں انہیں "بضع" کہتے ہیں، اور اس اعتبار سے مال کی اس وافر مقدار کو جو تجارت کے لئے رکھی جائے، بضاعت کہا جاتا ہے، بضاعتهم میں بضاعة مضاف هم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ہے، فی رحالهم، رحال، رحل کی جمع کثرت ہے بمعنی کجاوہ یعنی لکڑی وغیرہ

کی وہ کاٹھی جو جانور کی پشت پر سامان وغیرہ رکھنے کیلئے رکھی جاتی ہے۔ اور علی الاطلاق سوار کے اس سامان کو بھی رحل کہا جاتا ہے، جسے وہ جانور کی پشت پر لادتا ہے۔

والرحل ما على ظهر المركوب من متاع الراكب وغيره ، كما في البحر، وقال الراغب : هو ما يوضع على البعير للركوب ثم يعبر به تارة عن البعير واخرىٰ عما يجلس عليه في المنزل. (روح ج ۷ ص ۱۰)

یعنی ان کی پونجی ان کی خرجیوں اور کجاؤں میں رکھ دو، ایک قول یہ ہے کہ وہ دراہم تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جوتے اور چمڑے تھے، اور بقول بعض آٹھ بورے ستو تھے، بغوی نے قول اول (یعنی برادران یوسف جو پونجی لے کر آئے تھے وہ دراہم تھے) کو اصح قرار دیا ہے۔

يعني ثمن طعامهم وكانت دراهم ، وقال الضحاك عن ابن عباس كانت النعال والادم وقيل كانت ثمانية جرب من سويق المقل ، قال البغوي والاول اصح. (مظہری ج ۵ ص ۱۷۷)

تنبیہ:- آٹھ بورے ستو والا قول عقلاً محل نظر ہے کیوں کہ برادران یوسف ایک طویل مسافت طے کر کے غلہ لینے کے لئے مصر جا رہے ہیں اور اس کے وہ حاجت مند ہیں، پھر غلہ ہی کے قبیل کی چیز عوض میں دیں یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

پونجی واپس کر دینے کی وجہ:- لعلهم يعرفونها اذا انقلبوا الى اهلهم لعلهم يرجعون: یعنی ان کی پونجی خفیہ ان کے سامانوں میں اس لئے رکھوادی کہ گھر پہنچ کر جب وہ سامان کھولیں اور اپنی پونجی کو واپس پالیں تو اس اعزاز و اکرام سے متاثر ہو کر دوبارہ پھر آئیں، اور اس طرح چھوٹے حقیقی بھائی سے بھی ملاقات ہو جائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی پونجی خفیہ واپس کر دی اس کے بارے

میں علماء کے معتمد اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ احسان کی تکمیل اور اتمام نوازش کے جذبہ سے ان کی پونجی ان کے سامانوں میں رکھوادی، تاکہ اس عنایت سے متاثر ہوکر دوبارہ غلہ لینے کے لئے پھر آئیں، اور بقول بعض بھائیوں سے قیمت وصول کرنا مروت کے خلاف سمجھا، اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اندیشہ ہوا کہ کہیں والد کے پاس اور پونجی نہ ہوئی تو پھر یہ دوبارہ نہ آسکیں گے، اور بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ امانت دار لوگ ہیں، ان کی امانت و دیانت ان کو اس کے لوٹانے پر ضرور آمادہ کرے گی، اور اس طرح یہ ضرور پھر واپس آئیں گے۔

"قیل رد بضاعتهم کرامة وتقدما فی البر والاحسان لیکون ادعی لهم الی العود ای لعلهم یعرفونها ای کرامتهم علینا، وقیل لما رای من اللوم فی اخذ الثمن من ابیه واخوته مع حاجتهم الیه رد علیهم من حیث لا یعلمون تکرماً، وقال الکلبی: بخوف ان لا یکون عند ابیه من الورق ما یرجعون به مرة اخریٰ، وقیل جعل ذالک لانه علم ان دیانتهم تحملهم علیٰ رد البضاعة نفیا للغلط ولا یستحلون امساکها". (ابوسعود، مظہری ج ۵ ص ۱۷۷، ابن کثیر ج ۲ ص ۴۹۷، روح ج ۱۳ ص: ۱۰)

قرآن کریم کے طرز سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی پونجی اس لئے واپس کردی تاکہ احسان کی بنا پر ان کو دوبارہ آنے کی ترغیب ہو کہ ایسے کریم اور حسن سلوک کرنیوالے کہاں ملا کرتے ہیں۔

"فلما رجعوا الی ابیهم" الآیه: نکتل اصل میں نکتیل تھا، تاء کے فتحہ اور یاء ماقبل کسرہ کے ساتھ، کسرہ یاء پر ثقیل ہونے کی وجہ سے اسے ساکن کردیا پھر یاء ماقبل مفتوح کی بنا پر اسے الف سے بدل دیا، بعدۂ اجتماع ساکنین کی بنا پر الف کو

حذف کردیا تو نکتل ہوگیا۔ (اعراب القرآن ج ۷ ص ۲۱)

اس میں ایک قرأت یکتل ہے، ای یکتل اخونا اور مشہور قرأت نکتل ہے۔

ای نکتل نحن: نون والی قرأت کی صورت میں جواب امر ہونے کی بنا پر یہ مجزوم ہوگا۔ (الدر المصون ج ۶ ص ۵۱۷)

"ھل آمنکم علیه" الآیه، حافظاً اور ایک قرءت میں حفظاً ہے، اس صورت میں یہ تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہوگا، اور حافظاً والی صورت میں حال اور تمیز دونوں کا احتمال ہے، جیسا کہ "لله دره فارساً" میں۔

وانتصاب حفظا علی التمیز کذا اقرأ الاکثرون بلفظ المصدر و قرأ حفص و حمزه والکسائی حافظا علی وزن الفاعل وهو یحتمل الحال والتمیز کقولهم لله دره فارسا. (مظہری ج ۵ ص ۱۷۸)

وقال لفتینه الآیة کا مفہوم:- آیات مذکورہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام جب واپس ہونے لگے تو رخصتی سلام کیلئے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے اس وقت انھوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاؤں میں ان کی وہ پونجی بھی رکھ دو جو انہوں نے غلہ کی قیمت کے نام سے دی ہے ۔تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو عجب نہیں کہ اس احسان سے متاثر ہو کر پھر دوبارہ واپس آئیں۔ بہر حال یہ قافلہ مصر سے چلا اور کنعان اپنے وطن واپس آ گیا۔ اور باپ کے پاس حاضر ہوا تو اپنی پوری سرگذشت سنائی۔ عزیز مصر کے اعزاز و اکرام کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا کہ سب کچھ کے باوجود والی مصر نے ہم سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس وقت تک یہاں نہ آنا اور غلہ کی خرید کا دھیان نہ کرنا جب تک کہ اپنے

سوتیلے بھائی بن یمین کو ساتھ نہ لاؤ۔ لہذا ہم آپ سے دست بستہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ بن یمین کو ساتھ لیجانے کی ضرور اجازت دیدیں تا کہ دوبارہ غلہ مل سکے، اور اس کو ہمارے ساتھ کرنے میں کسی قسم کا پس وپیش نہ کریں۔ ہم بحفاظت اس کی واپسی کا ذمہ لیتے ہیں۔

والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا: کیا تم پر اسی طرح اعتماد کرلوں جس طرح اس کے بھائی یوسف کے معاملہ میں کر چکا ہوں کہ ان کو ضمانتوں اور وعدوں کے ساتھ لے گئے تھے۔ اور آج تک واپس لا کر نہ دیا۔ اگر غلہ کا ملنا بنیامین کے بھیجنے پر ہی موقوف ہے اور اگر اس کو بھیجنا ناگزیر ہی ہو گیا تو تمہاری حفاظت وذمہ داری کیا چیز ہے۔ میں اسے خدا کی حفاظت وذمہ داری میں روانہ کروں گا کیونکہ خدا ہی سب سے بہتر اور بڑھ کر حفاظت ورحم کرنیوالا ہے تو مجھے امید ہے کہ وہ اپنی حفاظت کے ذریعہ رحم کرے گا اور مجھ پر دو مصیبتیں جمع نہیں کرے گا کہ یوسف کی گمشدگی سے تو میں مصیبت میں پڑا ہی ہوں مزید برآں بنیامین کی گم شدگی کی مصیبت میں بھی مبتلا کردے۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ، قَالُوْا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا. وَنَمِيْرُ أَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ أَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ. ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ .

اور جب کھولی اپنی چیز بست، پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی ان کی طرف، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہئے، یہ پونجی ہماری پھیر دی گئی ہم کو اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور خبر داری کریں گے اپنے بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی وہ بھرتی آسان ہے۔

ترکیب ولغات:- جملہ فتحوا.....محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ وجدوا..... جواب ہے شرط مقدر کا، جملہ ردت الیھم.....محلاً منصوب حال ہے۔(قد) کی تقدیر کے ساتھ، جملہ قالوا..... مستانفہ برائے بیان، جملہ یا ابانا.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ ما نبغی..... ، جواب ہے ندا کا، جملہ "ھذہ بضاعتنا....." مستانفہ برائے بیان جملہ ردت الینا.....محلاً مرفوع خبر ہے، (ھذہ) مبتدا کی، جملہ نمیر اھلنا.....معطوف ہے، جملہ ھذہ بضاعتنا..... پر، جملہ نحفظ اخانا..... معطوف ہے جملہ ھذہ بضاعتنا پر، جملہ نزداد..... معطوف ہے جملہ ھذہ بضاعتنا پر، جملہ ذلک کیل.....مستانفہ قائم مقام قول کے۔

" ولما فتحوا متاعھم "جس چیز سے کسی بھی طریقہ سے فائدہ حاصل کیا جا سکے وہ متاع کہلاتی ہے۔ یہاں آیت کریمہ میں مراد کھانے کی چیز ہے، اور

بقول بعض برتن اور سامان مراد ہے۔ اور اگر لزوم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں کو متاع کہنا درست ہے، کیونکہ کھانا اور غلہ برتن ہی میں تھا۔ معنی یہ ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے جب ان سامانوں اور برتنوں کو کھولا جس میں وہ غلہ رکھ کر لے آئے تھے۔

قال الراغب : المتاع ما ینتفع به علی وجه وهو فی الآیة الطعام، و قیل الوعاء، وکلاهما متاع، وهما متلازمان، فان الطعام کان فی الوعاء، والمعنی أنهم لما فتحوا اوعیة طعامهم. (روح ج ۷ ص ۱۱)

وجدوا بضاعتهم ردت الیهم توانہوں نے اپنا وہ سرمایہ جو بطور غلہ کی قیمت کے شاہ مصر کو دے آئے تھے اسے اپنے سامانوں کے اندر موجود پایا جو انہیں واپس کر دیا گیا تھا، برادران یوسف علیہ السلام نے قیمت کی اس واپسی کو بادشاہ کی طرف سے اپنے اعزاز واکرام پر محمول کیا، اس لئے کہ دلالت حال اسی کی جانب مشیر تھی۔

معارف وحقائق

پونجی واپس مل جانے پر برادران یوسف علیہ السلام کا تاثر:- قالوا: جملہ مستانفہ برائے بیان ہے، یعنی یہ سوال پیدا ہوا کہ انہوں نے اپنی پونجی کو واپس پالیا تو اس وقت ان کا تاثر کیا رہا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے والد نامدار سے جو غالبا سامان کھولنے کے وقت وہاں موجود تھے یہ کہا کہ ابا جان اب ہم کو اور کیا چاہئے: یا أبانا ما نبغی یعنی اس سے بڑھ کر احسان کیا ہوگا کہ شاہ مصر نے ہماری بہترین مہمان نوازی کی اور اعزاز واکرام کے ساتھ رکھا، اور پھر ہمارے ہاتھ غلہ فروخت کر کے ادا کردہ قیمت کو بھی واپس کر دیا، یا معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے زیادہ کسی اور بھلائی کے طالب نہیں، یا یہ کہ بادشاہ کے احسان کے متعلق کلام کرنے

میں ہم اور کیا چیز طلب کریں، یا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بیان میں کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتے، ہماری سچائی کی دلیل آپ کے سامنے موجود ہے، (کہ بادشاہ نے ادا کردہ قیمت کو بھی واپس کر دیا) یا یہ مطلب ہے کہ ہم آپ سے کوئی پونجی طلب نہیں کرتے۔

ای هل من مزید علی ذلک، اکرمنا و احسن مثوانا، وباع منا، ورد علینا متاعنا، اولا نطلب ذلک احسانا، او ای شئی نطلب بالکلام فی احسانه، او لا ینبغی فی القول و نزید فیما حکینا لک فان من الدلیل علی صدقنا ما تریٰ فی العیان، او ما نطلب منک بضاعة.

(مظہری ج ۵ ص ۱۷۸)

"هذه بضاعتنا ردت الینا" جملہ مستانفہ ما نبغی کی وضاحت کے واسطے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے باپ! اس سے زیادہ ہم کو اور کیا چاہئے، کہ غلہ بھی ملا اور ہماری پونجی بھی جوں کی توں لوٹا دی گئی۔

ونمیر اهلنا ونحفظ اخانا و نزداد کیل بعیر: اب ہمیں اجازت دیجئے کہ دوبارہ ہم بادشاہ مصر کے پاس جائیں اور گھر والوں کیلئے رسد لائیں۔ اور آپ بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے، ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لائیں گے۔

نمیر اهلنا: میم کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ اس غلہ اور رسد کو کہتے ہیں جسے انسان ایک شہر سے دوسرے شہر لے آئے، نمیر معطوف ہے فعل محذوف پر تقدیر عبارت "فنستظهر بها و نمیر اهلنا" یعنی ہماری پونجی اس لئے واپس کر دی گئی تاکہ ہم اس کے ذریعہ قوت حاصل کریں، اور دوبارہ بادشاہ کے پاس جا کر پھر اپنے گھر والوں کیلئے غلہ لے آئیں۔

ای نجلب لهم المیرة و هی بکسر المیم و سکون الیاء طعام یمتاره الانسان ای یجلبه من بلد الی بلد، وحاصله نجلب لهم الطعام من عند الملک معطوف علی مقدر ینسحب علیه رد البضاعة ای فنستظهربها و نمیر اهلنا.

مذکورہ بالاتفسیر کے مطابق ما نبغی هذه بضاعتنا میں ما استفہامیہ ہوگا اور مفعول ہوگا جس کی تقدیم لازم ہے، کیوں کی ما استفہامیہ صدارت کلام کو چاہتا ہے، ''انها استفهامية فهی مفعول مقدم واجب التقديم لان لها صدر الكلام. (مظہری ج۵ص۱۷۸، الدرالمصون ج۶ص۵۱۹)

'' ذلک کیل یسیر'' یعنی دوبارہ غلہ کا مل جانا بہت ہی آسان ہے، اس لئے کہ بادشاہ انتہائی سخی ہے، یا مطلب یہ ہے کہ بنیامین کے ساتھ ہونے کی صورت میں ایک اونٹ غلہ بڑی آسانی سے مل جائے گا، کیونکہ بادشاہ کا ضابطہ یہ ہے کہ وہ ہر متنفس کو ایک اونٹ کے بوجھ کے بقدر غلہ دیتا ہے، یا یہ کہ بنیامین کو تو اس نے خود طلب کیا ہے، لہذا اس کے حصہ کا غلہ ملنے میں کیا دقت ہوسکتی ہے، یا مطلب یہ ہے کہ جو غلہ ہم لائے ہیں، وہ کوئی بڑی مقدار میں نہیں ہے بلکہ بہت جلد ختم ہوجانیوالا ہے، اس لئے آپ ہمیں دوبارہ جانے کی اجازت دیجئے، اور دوبارہ غلہ کا ملنا چونکہ بنیامین کے جانے پر موقوف ہے، اس لئے بنیامین کو ہمارے ساتھ ضرور کردیجئے، تاکہ ہمیں کسی قسم کی کوئی دقت ودشواری پیش نہ آئے، اور رہا اس کی حفاظت کا معاملہ تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

و نزداد کیل بعیر : لغت میں لفظ بعیر مذکر کیلئے بولا جاتا ہے۔ اور بعضوں نے لفظ انسان کی طرح اسم جنس قرار دے کر مذکر اور مونث دونوں کیلئے

استعمال کیا ہے اور عین کی مناسبت سے بعیر کی باء میں کسرہ بھی درست ہے، اس کی جمع قلت ابعرة اور جمع کثرت بُعران آتی ہے۔

والبعير لغة يقع على الذكر خاصة واطلقه بعضهم على الناقة ايضا و جعله نظير " انسان" و يجوز كسر بائه اتباعا لعينه ويجمع فى القلة على ابعرة و فى الكثرة بعران. (الدرالمصون ج۶ ص۵۲۰)

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ.

کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہونچادو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ گھیرے جاؤ (گھر جاؤ) تم سب پھیر دیا اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے۔

ترکیب:- جملہ قال.....مستانفہ ہے۔ جملہ لن ارسلہ.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ تؤتون.....صلہ ہے موصول حرفی (ان) مضمر کا، جملہ تأتننی بہ ..... جواب قسم، جملہ آتوہ.....محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ" قال..... (ثانیہ) جواب شرط غیر جازم، جملہ اللہ.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ نقول..... صلہ ہے موصول حرفی (ما) کا۔

معارف و حقائق

"قال لن ارسلہ معکم حتی تؤتون موثقا: مضبوط عہد، پختہ عہد و پیمان، مصدر میمی بمعنی مفعول، باب (حسب) سے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کو میں ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام کی قسم کھا کر پختہ عہد و پیمان اور وعدہ نہ کرو کہ تم ضرور اسے واپس میرے پاس لیکر آؤ گے۔

بنیامین کے معاملہ میں عہد و پیمان کے بعد بیٹوں پر اعتماد کر لینے کی وجہ:-

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے یہ پختہ عہد و پیمان تو اس لئے لیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں وہ ان سے دھوکہ کھا چکے تھے، مگر اس پر یہ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس عہد و پیمان کے باوجود بھی تو دھوکہ دے سکتے تھے تو پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے قول و قرار اور عہد و پیمان پر کیسے اعتماد کر لیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فرزندان یعقوب علیہ السلام کے اندر پہلے کے مقابلہ میں کئی ایک تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، ایک تو یہ کہ وہ خیر و صلاح کی جانب مائل ہو چکے تھے۔ اور عمر کے اس مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے جس میں آدمی کے اندر عموماً حلم و بردباری پیدا ہو چکی ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے جو بغض و کینہ ان کے دلوں میں تھا وہ بنیامین سے نہیں تھا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام اسے بچشم بصیرت دیکھ رہے تھے، تیسرے یہ کہ قحط کی ضرورت نے اس پر مجبور کر دیا تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بذریعہ وحی اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ بتا دیا ہو کہ بنیامین بحفاظت ان تک پہنچ جائیں گے، بہر حال ان ہی وجوہات کی بنا پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں دھوکا کھانے کے باوجود بنیامین کے معاملہ میں بیٹوں کے قول و قرار پر اعتماد کر کے ان کیساتھ مصر بھیجنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

" فان قيل : لم بعثه معهم وقد شاهد ما شاهد ؟

" قلنا لوجوه ، احدها: انهم كبروا ومالوا الى الخير والصلاح وثانيها: انه كان يشاهد انه ليس بينهم و بين بنيامين من الحسد والحقد مثل ما كان بينهم و بين يوسف، وثالثها: ان ضرورة القحط احوجته الى ذلك، ورابعها: لعله تعالىٰ اوحى اليه و ضمن حفظه وايصاله اليه. (کبیر ج۹ ص۱۳۵)

لتاننى به : جواب ہے قسم مضمر کا، معنی یہ ہیں کہ میں بنیامین کو اس وقت تک تمہارے ساتھ نہیں بھیج سکتا، جب تک کہ تم اللہ کی قسم کھا کر یہ نہ کہو کہ قسم اللہ کی ہم اس کو

ضرور تیرے پاس واپس لائیں گے۔ جواب قسم مضمر اذا المعنیٰ حتی تحلفوا باللہ و تقولوا واللہ لتاتینک بہ ہے۔ (روح ج ۷ ص ۱۴، ابوسعود ج ۴ ص ۲۹۱)

اسباب ظاہری کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں:- حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عہد و پیمان اور قول قرار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بتقاضائے بشریت ممکن اور جائز حد تک احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا ہرگز توکل کے منافی نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کی تعلیم بھی یہی ہے، چنانچہ غزوات کے موقع پر آپ ﷺ نے تمام احتیاطی تدابیر کو اختیار فرمایا اور پھر اعتماد اور بھروسہ اللہ کی ذات پر کیا کہ اگر وہ چاہے گا تو فتح نصیب ہوگی ورنہ نہیں، چنانچہ اسلام اور کفر کے سب سے اولین معرکہ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تین سو تیرہ کی جماعت کو مشرکین مکہ کے بالمقابل صف آرا فرمایا اور پھر یہ دعاء فرمائی: بارالہا! تو نے مجھ سے (امداد و نصرت کا) جو وعدہ فرمایا ہے اسے پورا کردے، خداوندا! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو روئے زمین پر کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہیں رہ جائے گا۔

"اللھم انجزما وعدتنی اللھم انی تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض". (مسلم ج ۲ ص ۹۳)

الا ان یحاط بکم الآیۃ کا مفہوم:- بقول مجاہد اس کے معنی یہ ہیں کہ، مگر یہ کہ تم مغلوب ہو جاؤ اور واپس لانے پر قادر نہ ہوسکو، یا یہ کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ، لفظ یحاط مشتق ہے "احاطۃ العدو" سے، اور اس کا استعمال ہلاکت کے معنیٰ میں ہوتا ہے، اس لئے کہ جو دشمن کے گھیرے میں آجاتا ہے وہ عموماً ہلاک ہو جاتا ہے، "الا ان یحاط بکم" میں استثناء مفرغ ہے، یعنی ہر حال میں تم اس کی حفاظت کرو گے اور میرے پاس واپس لے آؤ گے، الا یہ کہ تم سب بے بس ہو جاؤ (اور ہلاک کر

دئے جاؤ) یا یہ کہ اس کو واپس لانے سے تم کسی وجہ سے باز نہ رہو گے، مگر یہ کہ تم مغلوب ہو جاؤ۔

ای الا ان تغلبوا فلا تطیقوا ذلک او الا ان تهلکوا جمیعا وکلاهما مروی عن مجاهد واصله احاطة العدو واستعماله فی الهلاک لان من احاط به العدو فقد هلک غالباً. (روح ج۷ص۱۴۷، کبیر ج۹ص۱۳۷) **وهو استثناء مفرغ من اعم الاحوال ای لتاتننی به علی کل حال الا حال الاحاطة بکم . او من اعم العلل علی قوله لتاتننی به فی تاویل النفی ای لا تمنعون من الاتیان به لشئی الا للاحاطة بکم کقوله اقسمت بالله الا فعلت ای ما اطلب الا فعلک.** (مظہری ج۵ص۱۷۹)

مظہری اور تفسیر کبیر میں ہلاکت والے معنی کی نسبت مجاہد کی طرف اور مغلوب ہو جانے والے معنیٰ کی نسبت قتادہ کی طرف کی گئی ہے۔

قال مجاهد الا ان تهلکوا جمیعاًوقال قتادة الا ان تغلبوا حتی لا تطیقوا ذلک.

کمال نبوت:- یہ نبوت کا کمال ہے کہ نبی کی نظر کسی چیز کے صرف ایک پہلو پر نہیں بلکہ ہر پہلو پر ہوا کرتی ہے، چنانچہ جہاں بنیامین کیساتھ شفقت پدری کی بنا پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دوسرے بیٹوں سے ان کی مکمل حفاظت کا قول وقرار لیا وہیں بیٹوں کی مجبوریوں کا بھی پوری طرح خیال رکھا اور یہ فرمایا کہ بنیامین کے واپس نہ لانے کی صورت میں تم مجرم ہو گے۔ مگر یہ کہ تمہارے ساتھ خود ہلاکت یا مغلوبیت کا حادثہ پیش آجائے تو تم جرم سے بری ہو گے۔

"**فلما آتوهم موثقهم**" یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی خواہش اور منشا

کے مطابق جب بیٹوں نے اللہ کی قسم کھا کر پختہ قول وقرار کرلیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کیلئے بنیامین کو دوسرے بیٹوں کے ساتھ غلہ لانے کیلئے بادشاہ مصر کے پاس بھیجنے سے کوئی چارہ نہ رہ گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اسباب ظاہری کی بنا پر ہے، ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت، اور کیا ہم اور کیا ہمارا وعدہ، ہم سب کو اپنے اس معاملہ کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہئے، ''قال اللہ علی ما نقول وکیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا ہم نے جو قول وقرار کیا ہے اس پر اللہ نگہبان ہے۔

بھروسہ صرف اللہ ہی پر رکھنا چاہئے:- تمام احتیاطی تدابیر کو اختیار کر لینے کے باوجود اعتماد اور بھروسہ اللہ ہی کی ذات پر ہونا چاہئے، کیونکہ وہی مسبب الاسباب ہے، تدابیر کی پختگی پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ بسا اوقات بہتر سے بہتر تدبیریں بھی ناکام ہوجاتی ہیں، نبی اور غیر نبی ہر ایک کیلئے حکم یہی ہے، چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں: حضرت یعقوب علیہ السلام نے ظاہری اسباب بھی پختہ کر لئے اور بروسہ اللہ پر رکھا یہی حکم ہے ہر کسی کو''۔ (فوائد عثمانی)

قرآن کریم کا اعجاز:- ''واللہ علی ما نقول وکیل'' یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس ذرا سے فقرہ میں اس کے شرعاً مؤکد ہونے اور دوسری طرف اللہ پر اعتماد وتوکل دونوں کو جمع کر دیا۔ (ماجدی ج۲ ص۶۲۷)

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ .

اور کہا اے بیٹو نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے اور داخل ہونا کئی دروازوں سے جدا جدا اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے، حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے بھروسہ کرنے والوں کو۔

ترکیب:- جملہ قال..... معطوف ہے سابق آیت کے جملہ قال پر، جملہ یٰبنی..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ لا تدخلوا..... جواب ہے نداء کا، جملہ ادخلوا..... معطوف ہے جملہ جواب ندا پر، جملہ ما اغنی..... معطوف ہے جملہ جواب ندا پر، ان الحکم إلا للہ..... جملہ تعلیلیہ، جملہ توکلت..... مستانفہ قائم مقام قول، جملہ یتوکل المتوکلون..... محلاً مجزوم جواب ہے شرط مقدر کا، ای ان کان الحکم للہ فلیتوکل المتوکلون علیہ، اور جملہ شرط مقدر معطوف ہے جملہ مستانفہ یعنی جملہ توکلت..... پر یا یہ کہ بذات خود جملہ مستانفہ ہے۔

معارف و حقائق

"وقال یٰبنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ".

برادران یوسف علیہ السلام کے قافلہ دوبارہ مصر کے لئے روانگی اور

حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدبیر:- قول وقرار اور عہد و پیمان کے بعد برادران یوسف کا قافلہ غلہ لینے کیلئے دوبارہ کنعان سے ملک مصر روانہ ہو رہا ہے اور اس مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حقیقی بھائی بنیامین بھی ساتھ ہے، جو حضرت یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے بعد سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا نور نظر، سب سے زیادہ لاڈلا اور یوسف کی ایک نشانی ہے، پھر یہ گیارہ وجیہ وشکیل اور تندرست وتوانا خوبصورت جوان بھائیوں کا ایک قافلہ ہے، پہلی مرتبہ جب یہ قافلہ مصر میں داخل ہوا تھا تو اجنبی تھا اور کسی نہ کسی درجہ میں ان پر جاسوسی کا شبہ کیا جا چکا تھا، خواہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے نہ سہی مگر اوروں کی نظر میں کھٹک بہر حال پیدا ہو چکی تھی، اور ان کے ساتھ ایک دوسرا معاملہ یہ ہوا تھا کہ عزیز مصر نے ان کو شاہی مہمان بنا کر بڑا اعزاز واکرام کیا تھا، جس کی بنا پر اب کی مرتبہ دو خطرے سامنے موجود تھے۔ ایک تو یہ کہ ان کے سابقہ اعزاز واکرام کی بنا پر بغض وحسد کرتے ہوئے کوئی جاسوسی کا الزام لگا کر عزیز مصر تک پہونچنے سے پہلے ہی گرفتار نہ کروادے، دوسرے یہ کہ ان کے حسن و جمال کی بنا پر نظر بد کے لگ جانے کا بھی پورا پورا امکان موجود تھا، بہر حال ان خطرات کی بنا پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے رخصت کرتے وقت ان کو خصوصی نصیحت فرمائی۔ فرمایا کہ اے بیٹو! تم سب کے سب مصر میں ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا تا کہ تم پر کوئی افتاد نہ پڑ جائے اور تم کسی ناگہانی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ اس نصیحت کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو، بلکہ یہ اپنی طرف سے بچاؤ اور حفاظت کی ایک صورت ہے، باقی خداوند قدوس کی طرف سے جو چیزیں متعین اور فیصل ہو چکی ہیں اس کو دنیا کی کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تدبیر بھی ختم نہیں کر سکتی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

" وما اغنی من الله من شئی ان الحکم الا لله علیه توکلت و علیه فلیتوکل المتوکلون، (اور میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونیوالی ہے۔ فرماں روائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے) اس لئے میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ صرف احتیاطی تدبیر کے طور پر ہے۔ اور خدا پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسباب ظاہری کو احتیاطی تدبیر کیلئے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۱۹)

نظر بد کا لگ جانا حق ہے:- حضرت یعقوب علیہ السلام نے "یا بنی لا تدخلوا" الخ کے ذریعہ بیٹوں کو نصیحت اس لئے فرمائی کہ نظر بد کا لگ جانا حق اور ثابت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "نظر آدمی کو قبر میں داخل کر دیتی ہے اور اونٹ کو ہنڈیا میں۔

عن جابر مرفوعاً ان العین لتدخل الرجل القبر والجمل القدر (اخرجہ ابن عدی فی الکامل ج ۶ ص ۲۴۰۳) اور ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے "العین حق" کا جملہ وارد ہے، عن ابی هریرة مرفوعاً " العین حق " (بخاری ۵۷۴۰، مسلم ۲۱۸۷) اور رسول اللہ ﷺ حضرات حسنین کیلئے ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے۔

اعوذ بکلمات الله التامة من کل شیطان و هامة ومن کل عین لامة. (بخاری ۳۳۷۱)

نظر بد کا علاج:- نظر بد کا لگ جانا حق اور ثابت ہے۔ اور اس کیلئے "رقیہ" یعنی دعاء، تعویذ اور پانی وغیرہ پر دم اور وضو کے غسالہ سے اس کا علاج صحیح اور رسول

اللہ ﷻ سے ثابت ہے، چنانچہ حضرات حسنین کیلئے "ومن کل عین لامة" کے لفظ سے رسول اللہ ﷺ کا پناہ طلب کرنا ابھی گذر چکا۔

اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ آپ "عائن" یعنی جس کی نظر لگ گئی ہے اسے وضو کرنے اور پھر وضو کے غسالہ کو "معین" یعنی جس پر نظر لگ گئی ہے اس کے اوپر چھڑکنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

"قالت عائشة رضی الله عنها : کان یامر العائن فیتوضأ ثم یغتسل منه المعین الذی اصیب بالعین". (موطا ۱۶۸۵/ابن ماجہ ۳۵۰۹)

نظر بد نہ لگنے کی تدبیر:- نظر بد نہ لگنے کی صورت یہ ہے کہ کسی کو کسی کا جسم یا اس کی کوئی چیز اچھی اور خوبصورت لگے تو اس کو چاہئے کہ اس کے واسطے یہ دعا کرے: اللہ تو اس میں برکت عطا کر، چنانچہ حضرت عامر بن ربیعہ ﷺ جن کی نظر حضرت سہیل بن حنیف ﷺ کو لگ گئی اور ان کو تیز بخار آ گیا، تو ان کو تنبیہ فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "علام یقتل احدکم اخاه ألا برکت ان العین حق" (مؤطا مالک ۱۶۸۵/ابن ماجہ ۳۵۰۹) کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے، تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب ان کا بدن تمہیں خوب نظر آیا تو برکت کی دعا کر لیتے، نظر کا اثر ہو جانا حق ہے، ایسے ہی ایک روایت میں ہے کہ "ماشاء الله لا حول ولا قوة الا بالله" (مسند بزار ۳۵،۵۵) پڑھ لینے سے بھی نظر کا اثر نہیں ہوتا، نظر بد اور اس کیلئے رقیہ کا استعمال کیلئے دیکھئے۔ (روح المعانی ج ۷ ص ۱۶، ۱۷، ۱۸)

تدبیر سے تقدیر نہیں بدلتی:- وما اغنی عنکم الآیہ، سے معلوم ہوا کہ تدبیر سے تقدیر الٰہی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا بلکہ تمام تر تدبیرات کے باوجود ہوتا وہی ہے جو اللہ نے مقدر کر دیا ہے، لہذا تدابیر کو اختیار کرنے کے باوجود اعتماد اور

بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہئے کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا، ایک حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تدبیر و احتیاط تقدیر الٰہی سے نہیں بچاتی۔

عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ" لا يغني حذر عن قدر" رواه الحاكم ، و رواه احمد من حديث معاذ بن جبل و رواه البزار من حديث ابى هريرة (رضی اللہ عنہ) . (مجمع الزوائد ۷ ص ۲۰۹، البزار ۱/۲۱۶۴)

توکل کی تعریف:- عليه توكلت وعليه فليتوكل المتوكلون :

"توکل" بمعنی اعتماد و بھروسہ، اس کا تعدیہ بذریعہ علیٰ ہوتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ "توكل على الله" کی تعریف ان لفاظ میں فرماتے ہیں۔

التوكل وهو ان يغلب عليه اليقين حتى يفتر سعيه فى جلب المنافع و دفع المضار من قبل الاسباب و لكن يمشى على ما سنه الله تعالىٰ فى عبادة من الاكساب من غير اعتماد عليها. (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۶۹، طبع خیریہ مصر ۱۳۲۲ھ)

توکل یہ ہے کہ بندہ پر یقین اتنا غالب ہو کہ جلب منفعت اور دفع مضرت میں اسباب کے متعلق اس کی کوششیں سرد پڑ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں جو کسب کے طریقے مقرر فرما دیئے ہیں بغیر اس کے کہ اس پر اعتماد ہو، ان طریقوں پر گامزن رہے۔

توکل کی قسمیں:- امام حافظ الدین ابن البزار کردری حنفی صاحب فتاویٰ بزازیہ رقم طراز ہیں: توکل کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ کہ جس کو حضور علیہ السلام نے

سابقین کی صفت بتلایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **هم الذين لا يرقون لا يسترقون ولا يكوون ولا يكتوون وعلىٰ ربهم يتوكلون.**

(یہ وہ لوگ ہیں جو نہ منتر کرتے ہیں اور نہ منتر کراتے ہیں، نہ داغتے ہیں اور نہ داغ لگواتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں) یہ توکل جو کچھ قضاء الٰہی ہو چکی اس پر دل کے مطمئن ہو جانے کا نام ہے۔ بغیر اس کے کہ نفع کے فوت ہونے یا مضرت کے پہنچ جانے کی پروا یا اضطراب ہو، بندہ کے نزدیک وصول (ملنا) اور حرمان (نہ ملنا) میں برابری نہ ہونا توکل کی اس قسم کے منافی ہے۔ اسی طرح اسباب پر متوجہ ہونا اور ان میں مشغول ہونا اس توکل کو ختم کر دیتا ہے۔ اور اسی کی طرف حضور علیہ السلام نے "**لو توكلتم على الله حق توكله لرزقتم كما ترزق الطير تغدو خماصا و تروح بطانا**". (ترمذی ۲۳۴۴)

(کہ اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرو جس طرح کہ توکل کا حق ہے تو تمہیں اسی طرح رزق ملے گا، جس طرح کہ پرندوں کو ملتا ہے، کہ صبح کو خالی پیٹ اٹھتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس ہوتے ہیں) میں ارشاد فرمایا ہے۔

کیوں کہ معلوم ہوا کہ پرندے حصول منفعت یا دفع مضرت کی طرف ملتفت نہیں ہوتے اور ملنے نہ ملنے کی پروا نہیں کرتے، پس حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اگر تم اس صفت پر ہو کہ ملنے نہ ملنے کی پروا نہ کرو اور جیسا توکل کا حق ہے اسی طرح توکل کرو تو بغیر بوئے جوتے جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے تمہیں ضرور مل جائے گا، یہ وہ توکل ہے جس کی تحریص کی گئی ہے، اور دعوت دی گئی ہے، توکل کی دوسری قسم وہ ہے جس کی اجازت دی گئی ہے، دعوت نہیں دی گئی ہے، جو مضرت اور مکروہات کے دفعیہ اور حدود کی نگرانی اور آفات سے بچاؤ کے لئے ہوتا ہے، کیوں کہ یہ بھی توکل ہے، اگر

چہ ناقص ہے۔

چنانچہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری ؓ نے جب حضور ﷺ سے عرض کیا کہ "أرسل ناقتی و اتوکل ام اقید و اتوکل"۔

(کیا میں ناقہ کو چھوڑ دوں اور توکل کروں یا باندھ دوں اور توکل کروں) تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "بل قید و توکل" (بلکہ باندھ اور توکل کر) عمرو توکل کے ذریعہ گمشدگی کی حفاظت چاہتے تھے نہ کہ جو کچھ قضاء الٰہی میں ہو چکا ہے اس پر مطمئن ہونا، پس حضور ﷺ نے ان کو اسی نوع کا حکم دیا جس کے متعلق مشورہ تھا کیونکہ جس سے مشورہ کیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے۔ اسی کے مثل وہ واقعہ ہے جو حضور ﷺ نے کعب بن مالک ؓ سے فرمایا تھا جو کہ غزوہ تبوک سے رہ جانے والے تین اشخاص میں سے ایک تھے، تم اپنا مال رہنے دو جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنے مال سے الگ ہو جاؤں، اور آپ ﷺ نے حضرت بلال ؓ کو ہدایت کی تھی کہ "انفق یابلال ولا تخش من ذی العرش اقلالاً" (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰۹۸) (بلال خرچ کر اور عرش والے سے کم دینے کا خوف نہ کر) نیز حضرت بلال ؓ نے جب حضور ﷺ کیلئے کچھ کھجوریں چھپا کر رکھدی تھیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا، "اما تخشیٰ ان یخسف اللہ بہ فی نار جھنم" (تو ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے جہنم کی آگ میں دھنسا دے) وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کا توکل کامل تھا جو پروردگار کی طرف سے آپ کیلئے مقدر تھا، آپ ﷺ اس پر مطمئن تھے، حظ نفس کی طرف التفات نہ تھا، اور دوسروں کا مقصد مکروہات سے احتراز اور دفع مضرت کی تدبیر تھی۔ (لغات القرآن ج ۲ ص ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳ بحوالہ مناقب امام اعظم ج ۱ ص ۷ طبع دائرۃ المعارف ۱۳۲۱ھ)

"وعلیہ فلیتوکل المتوکلون" صلہ کے مقدم ہونے کے ساتھ حرف

عطف واواور فاء دونوں کوعطف جملہ علی الجملہ میں جمع کر دیا اختصاص کے معنی کو بتانے کیلئے (یعنی توکل واعتماد صرف اللہ ہی پر ہونا چاہئے نہ کہ کسی اور شخص یا تدبیر وغیرہ پر) گویا آیت میں واو برائے عطف اور فاء معنیٰ سببیت کا فائدہ دینے کیلئے ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے افعال دوسروں کیلئے اقتداء کا سبب ہوا کرتے ہیں۔

"جمع بین حرفی العطف فی عطف الجملة علی الجملة لتقدم الصلة للاختصاص کان الواو للعطف والفاء لافادة السببية فان فعل الانبياء سبب لان يقتدیٰ بهم غيرهم". (مظہری ج۵ص۱۷۹)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ واو برائے عطف اور فاء فقط تاکید کے معنیٰ کا فائدہ دینے کے لئے ہے۔

"واختار بعضهم انه جئی بالفاء افادة للتاكيد فقط".

(روح ج۷ص۱۹)

(**البلاغة**:- لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة فيه اطناب وهو زياده اللفظ على المعنیٰ و فائدته تمكين المعنیٰ من النفس و فيه ايضا من المحسنات البديعة ما يسمیٰ (طباق السلب). (صفوۃ ج۲ص۵۴)

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوْهُمْ ، مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِنَ اللهِ مِنْ شَيْئٍ إِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰهَا وَإِنَّهُ لَذُوْعِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ .

اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے ، کچھ نہ بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے، مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے اس کو سکھایا، لیکن بہت لوگوں کو خبر نہیں۔

ترکیب ولغات:- جملہ دخلوا..... محلاً مجرور مضاف الیہ، جواب شرط یہاں محذوف ہے، جس پر جملہ منفیہ "ما کان یغنی عنهم" دلالت کر رہا ہے، تقدیر عبارت "اصابهم ما اصابهم" ہے، جملہ ما کان یغنی..... محلاً منصوب "دخلوا" کے فاعل سے حال واقع ہے، تقدیر عبارت "غیر مفیدهم الهرب من قدر الله" ہوگی، جملہ یغنی..... محلاً منصوب خبر ہے کان کی، جملہ قضاها..... محلاً منصوب صفت ہے، حاجة کی، جملہ "انه لذو علم....." مستانفہ، جملہ علمناه..... "صلہ ہے موصول حرفی ما کا، جملہ لکن اکثر معطوف ہے جملہ انه لذو علم پر، جملہ "لایعلمون....." محلاً مرفوع ہے خبر ہے لکن کی۔

"حیث" جہاں، جس جگہ، ظرف مکان مبنی بر ضمہ ہے، مکان مبہم کیلئے آتا ہے، جس کی جملہ مابعد سے تشریح ہوتی ہے، حاجة، حاجت ضرورت، خواہش، خطرہ، کام، غرض جمع حوائج، حاجات، حوج اصل میں حوجة تھا واو فتحہ کے بعد

واقع ہوا تو اسے الف سے بدل دیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا ارمان تو پورا ہو گیا مگر تقدیر تدبیر پر غالب کر رہی:۔

ولما دخلوا الآیہ: یعنی برادران یوسف باپ کی نصیحت کے مطابق ایک ساتھ ایک دروازہ سے مصر میں داخل ہونے کے بجائے جب متفرق دروازوں سے داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا، حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ نصیحت اس لئے نہیں تھی کہ اس سے تقدیر الٰہی پلٹ جاتی بلکہ وہ چونکہ صاحب علم و بصیرت تھے، اور یہ دولت علم ہم نے ہی ان کو بخشی تھی، اس لئے انہوں نے بیٹوں سے نصیحت کی بات کہہ دی، جو ان کے خیال میں آ گئی تھی، ورنہ تو تعمیل حکم کے باوجود ہوا وہی جو کچھ خدا نے مقدر کر دیا تھا کہ اگرچہ وہ نظر بد وغیرہ سے محفوظ رہے، مگر بنیامین کو واپس لانے کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں، اور وہ بمشیت خداوندی روک لئے گئے جس کا نتیجہ خاندان یعقوب کے حق میں انتہائی بہتر ثابت ہوا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام تقدیر کے بالمقابل تدبیر کے مؤثر ہونے کے ہرگز قائل نہیں تھے:۔ "اِلَّا حَاجَةً" استثناء منقطع ولکن حاجة کے معنی میں ہے، یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں ایک ارمان تھا اور ان کی پدرانہ شفقت تھی جسے انھوں نے خطرہ کو دفع کرنے کے واسطے ظاہر کر دیا، اور بیٹوں کو اس کی وصیت کر دی ورنہ وہ تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کے موثر ہونے کے قائل ہرگز نہ تھے۔

"استثناء منقطع ای ولکن حاجة (فی نفس یعقوب قضٰها) ای اظهرها ووصاهم بها دفعا للخطرة غیر معتقد ان للتدبیر تاثیرا فی تغییر التقدیر. (روح ج ۷ ص ۲۱)

حضرت یعقوب علیہ السلام بڑے ہی صاحب علم تھے:۔ وانه لذو

علم لما علمناه " لما علمناه میں ایک احتمال یہ ہے کہ (ما) مصدر یہ ہو اور ضمیر (ها) راجع ہو حضرت یعقوب علیہ السلام کی جانب، اس صورت میں تقدیر عبارت، "وانه لذو علم من اجل تعليمنا اياه" ہوگی، یعنی بذریعہ وحی ہمارے تعلیم دینے کی وجہ سے وہ (حضرت یعقوب علیہ السلام) بڑے صاحب علم اور خبردار تھے، اور اس کا بھی امکان ہے کہ (ما) بمعنی الذی ہو اور ضمیر (ها) اسی ما کی جانب راجع ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ اس چیز سے خبردار اور اس کا بڑا علم رکھنے والے تھے جس کی ہم نے ان کو تعلیم دی، یعنی ہم نے جب بھی ان کو کسی چیز کی تعلیم دی تو ان کو اس کا علم حاصل ہو گیا، اور ایک قول یہ ہے کہ علم سے مراد حفاظت ہے، یعنی جس چیز کی ہم نے ان کو تعلیم دی، وہ اس کی بہت ہی حفاظت و نگہداشت رکھنے والے تھے، اور بقول بعض معنی یہ ہیں کہ وہ ان چیزوں کے فوائد اور اس کے حسن آثار کا بڑا علم رکھنے والے تھے جن کی ہم نے ان کو تعلیم دی تھی، گویا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے علم کے مقتضا پر پورے طور سے عمل کرنے والے تھے۔

قال الواحدی یحتمل ان تکون "ما" مصدریة والهاء عائدة الی یعقوب (علیه السلام) والتقدیر : وانه لذو علم من اجل تعلیمنا ایاه، ویمکن ان تکون "ما" بمعنی الذی والهاء عائدة الیها . والتاویل وانه لذو علم للشئی الذی علمناه ، یعنی انا لما علمناه شیئا حصل له العلم بذلک الشئ، وفی الآیة قولان آخران ، الاول : ان المراد بالعلم الحفظ ای انه لذو حفظ لما علمناه و مراقبةله، والثانی لذو علم لفوائد ما علمناه و حسن آثاره وهو اشارة الی کونه عاملا بما علمناه. (کبیر ج ۹ ص ۱۴۱)

علم سے مراد کون سا علم ہے:- آیت کریمہ "وانہ لذو علم لما علمناہ" سے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ علم سے مراد سائنس، فلسفہ اور ریاضیات وغیرہ کا علم نہیں بلکہ مراد مرضیات باری تعالیٰ کا علم ہے، اور یہی علم علم حقیقی ہے، کیونکہ دنیا وآخرت دونوں کی فلاح وکامیابی اسی پر موقوف ہے، جن آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ ﷺ میں علم کی اہمیت وفضیلت بیان کی گئی ہے، اور جس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اور زیادتی کی دعا کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد یہی علم مرضیات الٰہی ہے نہ کہ کچھ اور۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جہاں کہیں علم اور علماء کی فضیلت کا بیان آیا ہے، یا حصول علم کی ترغیب دی گئی ہے تو وہاں مرضیات الٰہی کا ہی علم مراد ہے نہ کہ وہ دنیوی علوم وفنون جن کا تذکرہ کیا گیا۔

قرآن کریم کی ان آیات اور حضور انور ﷺ کی احادیث سے دنیوی علوم و فنون کے حصول پر استدلال ہرگز درست نہیں ہے کیوں کہ ان کا تعلق صنعت وحرفت سے ہے نہ کہ علم حقیقی سے۔

تقدیر کے محکم ومبرم ہونے سے اکثر لوگ غافل ہیں:- "ولکن اکثر الناس لا یعلمون" یعنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت اس بات سے غافل ہے کہ تقدیر الٰہی اٹل اور محکم ہے اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ تقدیر تدبیر سے پلٹ جاتی ہے۔

ای لا یعلمون سر القدر و یزعمون انہ یغنی عنہ الحذر.

(روح المعانی ج ۷ ص ۲۱)

اور بقول بعض مطلب یہ ہے کہ اکثر لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے مقام علم

وقرب سے ناواقف ہیں، اور اکثر الناس سے مراد کافرین ومشرکین ہیں جن کو اس کا علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں اور اولیاء کو ایسے علوم سے نوازتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جو ان کیلئے دین ودنیا دونوں کی کامیابی کا ضامن ہوتے ہیں۔

''ای لا یعلمون ان یعقوب بهذه الصفة والعلم، والمراد باکثر الناس المشرکون، فانهم لا یعلمون بان الله کیف ارشد اولیاءه الی العلوم التی تنفعهم فی الدنیا والآخرة. (کبیر ج۹ ص۱۴۱، روح مظہری)

(آٹھویں رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰى إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّىْ أَنَا أَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس، اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو، کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے جو انہوں نے کئے ہیں۔

ترکیب ولغات:- جملہ دخلوا.....محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ آوىٰ..... جواب شرط غیر جازم جملہ: قال....مستانفہ برائے بیان، جملہ، انی انا اخوک ....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ انا اخوک .....محلاً مرفوع خبر ہے انّ کی، جملہ لا تبتئس .....معطوف ہے جملہ مستانفہ مقدر پر ای تنبہ فلا تبتئس، جملہ کانوا یعملون .....صلہ ہے اسم موصول (ما) کا، جملہ یعملون.....محلاً منصوب خبر ہے کانوا کی۔

آوی: اس نے جگہ دی، اس نے اتارا، مشتق ہے ایواء سے، صیغہ واحد مذکر غائب آوىٰ میں الف یا سے بدلا ہوا ہے اس طور پر کہ یائے متحرکہ فتحہ کے بعد واقع ہوئی تو اسے الف سے بدل دیا۔

معارف و حقائق

حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی ملاقات:- ولما دخلوا علىٰ یوسف الآیہ: برادران یوسف علیہ السلام جب دوبارہ ملک مصر میں داخل ہوئے اور عزیز مصر (یوسف علیہ السلام) کے پاس پہونچے تو بقول مفسرین انھوں نے عزیز مصر سے

کہا: آپ نے جس بھائی کولانے کا حکم دیا تھا وہ آپ کے سامنے موجود ہے، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی تحسین فرمائی، پھر ان لوگوں نے والد نامدار کا سلام عزیزِ مصر کو پہونچایا، بہر حال سلام ودعا وغیرہ کے بعد جب کھانے کا وقت ہوا تو عزیز نے آمنے سامنے دو، دو بھائیوں کو ایک ساتھ بٹھلایا۔ بنیامین گیارہویں تھے، لہذا وہ اکیلے پڑ گئے اور اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کو یاد کر کے رونے لگے کہ آج اگر یوسف موجود ہوتے تو وہ دسترخوان پر ان کے ساتھ بیٹھتے، یہ منظر دیکھ کر عزیز مصر نے بنیامین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیا، پھر سونے کے وقت بھی یہی معاملہ پیش آیا کہ بنیامین کے تنہا رہ جانے کی وجہ سے عزیز نے ان کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں سلایا، پھر بات چیت کے ذریعہ جب پوری طرح تصدیق کرلی اور اطمینان ہوگیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کے سامنے اپنا راز ظاہر کردیا۔ اور بتا دیا کہ میں تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کا احسان ہے کہ اس نے بھائیوں کے علی الرغم مجھ کو ملک مصر جیسے متمدن ملک کی سلطنت وحکومت عطا فرمائی، اور پھر جدائیگی کے بعد ایک دوسرے کی ملاقات کا اس طرح سامان مہیا فرمادیا، ہماری جدائیگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امتحان تھا جواب تکمیل کے قریب پہنچ چکا۔

اب انشاء اللہ العزیز ہم سب کی زندگی انتہائی راحت وسکون کے ساتھ گذرے گی، لہذا بھائیوں نے جو کچھ ایذا دہی وغیرہ کا معاملہ کیا ہے تم اس پر کسی طرح کا رنج وملال نہ کرو، حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ ظاہر ہوجانے کے بعد بنیامین نے کہا کہ اب میں آپ سے ہرگز جدا نہ ہوں گا، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو باپ کے رنج وغم بڑھانے کا باعث ہوگا، اور پھر تم کو روکنے کیلئے بظاہر ایسا کام کرنا پڑے گا جو تمہارے لئے باعث بدنامی ہو، بنیامین نے کہا کہ آپ کو اس کی اجازت

ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا شاہی پیالہ ان کے سامان میں رکھ کر روکنے کی تدبیر کی، جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

"قال المفسرين: انهم لما دخلوا عليه السلام قالوا: ايها الملک هٰذا اخونا الذی أمرتنا أن نأتيک به قد جئناک به فقال لهم: أحسنتمْ و أصبتم و ستجدون ذالک عندی، وبلغوه رسالة أبيهم، فانهم عليه السلام لما ودعوه قال لهم: بلغوا ملک مصر سلامی و قولوا له: إن أبانا يصلي عليک ويدعولک و يشكر صنيعک معنا، وقال ابوالمنصور المهرانی: انه عليه السلام خاطبه بذالک فی كتاب، فلما قرأه يوسف عليه السلام بكی، ثم أنه أكرمهم و أنزلهم و احسن نزلهم ثم أضافهم و أجلس كل اثنين منهم على مائدة فبقی بنيامين وحيدا فبكی وقال: لوكان أخی يوسف حيالأجلسنی معه فقال يوسف عليه السلام: بقی اخوكم وحده فقالوا له: كان له أخ فهلک قال: فأنا أجلسه معی فأخذه و أجلسه معه علىٰ مائدة وجعل يؤاكله، فلما كان الليل أمرهم بمثل ذالک وقال: ينام كل اثنين منكم علىٰ فراش فبقی بنيامين وجده فقال: هذا ينام عندی على فراشی فنام مع يوسف عليه السلام علىٰ فراشه فجعل يوسف عليه السلام يضمه اليه و يشم ريحه حتى أصبح سأله عن ولده فقال: لی عشرة بنين استقفت أسماء هم من اسم أخ لی هلک فقال له: أتحب أن أكون أخاک بدل اخيک الهالک؟ قال: من يجد اخاک مثلک ايها الملک؟ ولكن لم يلدک يعقوب ولا راحيل فبكیٰ يوسف عليه السلام و قام اليه

وعانقه وتعرف عند ذالک ((قال انی أنا أخوک)) یوسف ((فلا تبتئس)) ای فلا تحزن ((بما کانوا یعملون)) بنا فیما مضیٰ فان الله تعالیٰ قد أحسن الینا و جمعنا علی خیر ولا تعلمهم بما اعلمتک ..... وروی عن ابن عباس و ابن اسحاق وغیرها الا أن ابن اسحاق قال: انه علیه السلام قال له بعد أن تعرف الیه، لا تبال بکل ماتراه من المکروه فی تحیلی فی اخذک منهم الخ"۔

(روح ج ۷ ص ۲۳، مظہری ج ۵ ص ۱۸۰، کبیر ج ۹ ص ۱۴۲)

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ أَخِيْهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيْرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ.

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا، رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو۔

ترکیب ولغات:- جملہ "جھزھم....." محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ جعل ..... جواب شرط غیر جازم، جملہ أذن موذن..... معطوف ہے، جملہ جواب شرط پر، جملہ ایتھا العیر.....، جملہ معترضہ، جملہ انکم لسارقون.....، تفسیر ہے اذن کی۔

جھزھم: اس نے ان کیلئے تیار کر دیا، باب تفعیل، واحد مذکر غائب، ھم ضمیر جمع مذکر غائب، جھازھم، ان کا سامان، اسباب، جس ساز وسامان کی تیاری کی جائے وہ جھاز کہلاتا ہے، جھاز کی جمع اجھزہ آتی ہے، جھاز مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔

لفظ سقایہ کی تحقیق:- السقایۃ: پانی پلانا، پانی پلانے کی جگہ، پینے کا برتن، "سقایہ" کے بارے میں مفسرین اور اہل لغت کے اقوال بے حد مضطرب ہیں، کوئی اس کو سقیٰ یسقیٰ کا مصدر بتاتا ہے، اور کوئی اسقیٰ کا، اور کوئی مصدر کو بمعنی اسم فاعل بیان کرتا ہے، اور کوئی کہتا ہے کہ اس مکان کا نام ہے جہاں حاجیوں کو پانی پینے کے لئے دیا جاتا ہے، علامہ سید محمد رشید رضا مصری تفسیر "المنار" میں لفظ سقایہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

سقایہ لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے، اسی معنیٰ

میں ہے: جعل السقاية فی رحل أخيه، (پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا) اسے سقایہ سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ اس سے پلایا جاتا تھا اور "صواع" اس لئے کہا گیا کہ "صاع" کی طرح اس سے ناپا جاتا تھا، یہ لفظ مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

یہاں سقایہ سے مراد وہ شاہی پیالہ یا برتن ہے جس میں بادشاہ پانی پیا کرتا تھا، اور غلہ کی عزت و توقیر کو ظاہر کرنے کیلئے قحط کے زمانے میں اسے غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا تھا۔

"ای للشربة التی کان الملک یشرب منها جعلها یوسف مکیا لا لعزة الطعام. (مظہری ج ۵ ص ۱۸۱)

اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہ پیالہ چاندی کا تھا، اور ابن زید کہتے ہیں کہ سونے کا تھا۔

وهی اناء من فضة فی قول الاکثرین وقیل من ذهب قاله ابن زید. (ابن کثیر ج ۲ ص ۷۵)

بقول ابن زید پیالہ اگر سونے کا تھا تو یہ کہا جائے گا کہ غالباً حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سونے چاندی کا استعمال مردوں کیلئے بھی حلال تھا۔

رحل: بمعنی کجاوہ، جمع رحال، اصل میں اونٹ پر سواری کیلئے جو چیز رکھی جاتی ہے یعنی پالان اس کو رحل کہتے ہیں، اور مجازاً منزل و مسکن اور سامان سفر وغیرہ کیلئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ (لغات القرآن ج ۳ ص ۶۰)

یہاں رحل سے مراد بنیامین کا وہ سامان ہے۔ جس میں غلہ رکھا گیا تھا۔

لفظ عیر کی تحقیق:- العیر: قافلہ، کارواں، یہ مونث ہے اور عار یعیر

سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ "چلنے کے ہیں" المغرب میں لکھا ہے کہ عیر وہ گدھے یا اونٹ ہیں جو غلہ کی بار برداری میں کام آتے ہیں، بعد میں ہر قافلہ کیلئے اس لفظ کا استعمال عام ہوگیا۔

امام راغب تحریر فرماتے ہیں: عیر وہ لوگ ہیں جو اپنے ساتھ غلہ لادے ہوں، یہ غلہ لادنے والے مردوں اور اونٹوں دونوں کا نام ہے، مگر کبھی اس کا استعمال صرف ایک کے لئے بھی ہوتا ہے، اس کی جمع عَیَرات اور عِیْرَات دونوں آتی ہے۔

(لغات القرآن ج۴ص۳۷۷)

عیر کی جمع عیرات بفتح الیاء کے شاذ ہونے پر اتفاق ہے۔

و تجمعه العرب قاطبة على عيرات بفتح الياء وهذا مما اتفق على شذوذه لان فعلة المعتلة بالعين حقها فى جمعها بالالف والتاء ان تسكن عينها نحو: قيمة و قيمات و ديمة و ديمات.

(الدرالمصون ج۶ص۲۶/۵۲۵)

قاضی ثناءاللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ عیر لدے ہوئے اونٹ کو کہتے ہیں، ان کے آمدورفت رکھنے کی وجہ سے، یہاں مجازاً اونٹوں والے مراد ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان: "یا خیل اللہ ارکبی" میں خیل سے گھوڑے نہیں بلکہ مجازاً گھوڑوں کے سوار مراد ہیں، (یعنی اے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والو، سوار ہو جاؤ)

العير هى الابل التى عليها الاحمال لانها تعير اى ترد و تذهب و تجئى فقيل لاصحاب العير مجازا كما قال رسول الله ﷺ يا خيل الله اركبى كذا روى ابوداؤد من حديث سمره بن جندب.

بقول بعض عیر جمع ہے عیر بفتح الفاء وسکون العین کی، اصل میں یہ جمع بضم

العین تھی، مانند سقف کے، مگر ہاء کی مناسبت سے اسے کسرہ سے بدل دیا، اور عہر جمع ہوگئی، جیسا کہ بیض میں واقع ہوا ہے۔

وقیل ھی جمع عہر واصلھا فعل بضم الفاء کسقف ثم فعل بہ ما فعل بیض۔ (مظہری ج۵ ص۱۸۱، کبیر ج۹ ص۱۴۳)

معارف و حقائق

فلما جھزھم الآیۃ کا مفہوم:۔ فلما جھزھم بجھازھم الآیہ، تفسیر کبیر، مظہری اور روح وغیرہ کے حوالہ سے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام جب دوبارہ ان کے پاس پہونچے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے ان کی خوب خاطر و مدارات کی اور شاہی مہمان بنا کر بڑے ہی اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے پاس ٹھہرایا، چنانچہ چند دنوں تک وہ شاہی مہمان رہے، پھر جب ان کی روانگی کا وقت قریب آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ ان کے اونٹوں کو جتنا وہ لے جا سکیں غلوں سے لاد دو، کارندوں نے حکم کی تعمیل کی، اور اونٹوں کو نام بنام غلوں سے لاد کر روانگی کیلئے تیار کر دیا، اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے خود کسی کو اطلاع کئے بغیر یا ان کے حکم سے کسی کارندے نے بنیامین کی اجازت سے یا بغیر اجازت وہ شاہی پیالہ جو خاصا قیمتی تھا، اور جسے بادشاہ مصر کے ساتھ کسی نہ کسی درجہ میں اختصاص حاصل تھا، اور جسے غلہ ناپنے کیلئے استعمال کیا جا رہا تھا چپکے سے بنیامین کے سامان میں چھپا کر رکھ دیا، اس لئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یا تو اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خود اپنے پاس روکنا چاہتے تھے، یا یہ کہ بنیامین خود رکنا چاہتے تھے، مگر دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک کے چاہنے کے باوجود مصری قانون میں کسی غیر مصری کو روکنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اور حضرت یوسف علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس وقت

لوگوں پر یا ان کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف نہ ہو، لہذا بنیامین کو روکنے کی صورت یہی تھی کہ بظاہر وہ کسی جرم میں ماخوذ ہوں اور اس کی پاداش میں روک لئے جائیں، اور قرین قیاس یہی ہے کہ روکنے کا یہ منصوبہ بنیامین کے مشورہ سے ہی تیار ہوا تھا، اس لئے وہ بے فکر اور مطمئن تھے اور ان کے کسی دھوکہ یا غلط فہمی میں پڑنے کا کوئی احتمال نہیں تھا۔

بنیامین کو روک لینے کی ترکیب:- بہر حال مذکورہ کارروائی کے مکمل ہو چکنے کے بعد برادران یوسف کا قافلہ مصر سے کنعان کی جانب روانہ ہوا، اور ابھی اس نے تھوڑی مسافت طے کی ہوگی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی تو شاہی پیالہ ندارد پایا، سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا اس لئے انہوں نے ہی یہ چوری کی ہے، فوراً دوڑے اور آواز لگائی، قافلہ والو ٹھہرو تم چور ہو، ظاہر ہے کہ یہ آواز لگانے والا کوئی شاہی افسر ہوگا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے قافلہ والوں کو چور بطور خود قرار دیا، یا حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے، قرآن کریم میں حکم یوسف سے اس نداء کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہذا قرین قیاس یہی ہے کہ افسر نے بطور خود یہ کہا ہوگا اور معاملہ چونکہ بالکل واضح تھا اس لئے اس بارے میں ان سے مشورہ کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی، اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ افسر شاہی نے "انکم لسارقون" کی نداء حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے لگائی تھی، تو اسے توریہ پر محمول کیا جائے گا (جس کا جواز سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آقائے مدنی ﷺ سے ثابت ہے) یعنی مراد وہ سرقہ ہے کہ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ سے چرا کر قافلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، لہذا حضرت یوسف علیہ السلام پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ ایک پیغمبر خدا کیلئے اس کی گنجائش

کہاں سے نکل آئی کہ وہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگائیں، مذکورہ توجیہ کی اگر چہ گنجائش موجود ہے مگر اس بارے میں بے غبار بات یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جس ابتلاء میں ڈالے گئے تھے، بنیامین کو ان سے جدا کر کے اس کی تکمیل مقصود تھی، لہذا حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ سب حکم خداوندی تھا، اور اللہ تعالیٰ کے کسی فعل وامر پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

قال القاضی فی التفسیر المظهری والصحیح عندی " انه قال ذالک بامر الله تعالیٰ وان الله تعالیٰ لا یسئل عما یفعل وهم یسئلون، والحکمة فی ذلک ابتلاء یعقوب. (مظہری ج۵ص۱۸۱)

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کیا اس کا بامر اللہ ہونا ارشاد خداوندی "وکذالک کدنا لیوسف" (اور اسی طرح ہم نے تدبیر کی یوسف کیلئے) سے پورے طور پر واضح اور ظاہر ہے۔ (روح ج۷ص۳۵)

ظن غالب کی بنا پر حکم لگانا درست ہے:- فقہاء نے لکھا ہے کہ ظن غالب کی بنا پر اگر کسی کو چور کہہ دیا جائے تو اس پر کذب کا اطلاق نہیں ہوگا۔

فلم یکن قول هذا القائل کذبا اذ کان مرجعه الی غالب ظنه.

(ماجدی ج:۲ص:۶۳۱ بحوالہ جصاص)

(**البلاغة**)" فلما جهزهم بجهازهم " فیه جناس الاشتقاق وکذالک فی "اذن موذن". (صفوۃ ج۲ص۶۰)

المجاز المرسل فی قوله تعالیٰ- ایتها العیر انکم لسارقون وعلامته المجاورة. (اعراب القرآن ج۷ص۳۲)

"قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ"

کہنے لگے منہ کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہوگئی۔

ترکیب ولغات:- جملہ "قالوا....." مستانفہ برائے بیان، جملہ "اقبلوا....." محلا منصوب حال ہے، قد کی تقدیر کے ساتھ، جملہ تفقدون محلا منصوب مقولہ ہے قول کا۔

اقبلوا انہوں نے رخ کیا وہ متوجہ ہوئے۔ باب افعال سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، تفقدون تم گم کر رہے ہو، تم کھو رہے ہو، مشتق ہے فقد سے جس کے معنی گم کرنے اور کھو دینے کے ہیں۔ صیغہ مضارع جمع مذکر حاضر باب (ض) اور ایک قرأت میں تفقدون بضم التاء آیا ہے باب افعال سے، مگر ابو حاتم نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

وقرأ السلمی "تفقدون" بضم التاء من افقدته اذا وجدته فقیداً نحو احمدته اذا وجدته محموداً وضعف ابو حاتم هذه القراءة.

(روح ج ۷ ص ۲۵، الدر المصون ج ۶ ص ۵۲۶)

معارف و حقائق

مفقود اور معدوم کے درمیان فرق:- "ماذا تفقدون" ای شئی تفقدون یا "ما الذی تفقدون" کے معنی میں ہے، بقول امام راغب شئی کے موجود ہونے کے بعد اس کے معدوم ہونے کو فقد کہا جاتا ہے، پس لفظ الفقد بمقابلہ العدم خاص ہے، اس لئے کہ لفظ العدم کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے، جو موجود ہونے

کے بعد معدوم ہو جائے، اور اس چیز پر بھی جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہوا ہو۔

والفقد كما قال الراغب ، عدم الشئى بعد وجوده فهو اخص من العدم فانه يقال له ولما لم يوجد اصلا.

اور بقول بعض جو شئی تمہارے کسی فعل کے بغیر گم ہو جائے وہ مفقود کہلائے گی۔

وقيل : هو عدم الشئى بان يضل عنك لا بفعلك ۔ یہاں صیغہ مستقبل تفقدون کا لانا استحضار صورت کے واسطے ہے۔

"وصيغة المستقبل للاستحضار الصورة". (روح ج ۷ ص ۳۵)

اور بقول بعض فقد کسی چیز کا اس طرح گم ہو جانا کہ پتہ ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہے،"

والقفد غيبة الشئى من الحس بحيث لا يعرف مكانه". (مظہری ج ۵ ص ۱۸۲)

قالوا واقبلوا عليهم ماذا تفقدون، ايتها العير انكم لسارقون کی نداء دینے والا ممکن ہے کہ فرد واحد ہو، مگر" واقبلوا عليهم "میں هم ضمیر جمع سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پیالے کی تلاش میں نکلنے والی پوری ایک جماعت تھی، بہرحال برادران یوسف کے کانوں تک جب" انكم لسارقون " کی دلدوز اور رسوا کن صدا پہونچی تو وہ رک گئے، اور صدا لگانیوالوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ خواہ مخواہ ہمیں کیوں بدنام کرتے ہو بھلا بتاؤ تو سہی کی تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟

"قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّأَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ".

بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک بوجھ اونٹ کا اور میں ہوں اس کا ضامن۔

ترکیب:- جملہ قالوا نفقد.....مستانفہ، جملہ نفقد.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ لمن جاء.....محلاً منصوب معطوف ہے۔ نفقد صواع الملک پر، جملہ جاء بہ.....صلہ ہے اسم موصول (من) کا، جملہ "انا بہ زعیم....." محلاً منصوب مقولہ ہے قول مقدر کا، تقدیر عبارت وقال الموذن وانا بہ زعیم ہوگی۔

لفظ صواع کی تحقیق:- صواع: پینے کا بڑا جام جس میں شراب پی جاتی ہے، نیز "صاع" کو صواع کہتے ہیں جو ایک مشہور پیمانہ ہے، جس کی جمع صیعان آتی ہے، امام راغب لکھتے ہیں کہ یہ ایک برتن تھا جس سے پیا بھی جاتا تھا اور ناپا بھی جاتا تھا، اسے صاع بھی کہا جاتا ہے، یہ مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے، چنانچہ نفقد صواع الملک کے بعد ارشاد ہے، "ثم استخرجها" (آخر کار وہ برتن نکالا) اس میں ھا کی ضمیر واحد مونث غائب صواع کی طرف راجع ہے، حمل بوجھ، احمال اور حمولۃ جمع، بعیر اونٹ، اسم جنس ہے، لفظ انسان کی طرح مذکر و مونث دونوں پر بولا جاتا ہے، زعیم ذمہ دار، ضامن، کہنے والا، قائل۔ اول معنیٰ کے اعتبار سے مشتق ہے، زعامۃ سے جس کے معنیٰ ضامن اور کفیل ہونے کے ہیں، اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مشتق ہے، زعیم، فعیل بمعنیٰ اسم فاعل ہے، امام راغب لکھتے ہیں:

بذریعہ قول یا اسوب ریاست ضمانت دینے کو زعامہ کہا جاتا ہے۔

چنانچہ مکتفل اور رلیس کو زعیم بولتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کے قول میں مظنہ کذب ہونے کا یقین موجود ہے۔

کلبی کا بیان ہے کہ زعیم اہل یمن کی زبان میں کفیل کو کہتے ہیں، مفسرین نے اس کے معنیٰ ضامن ہی کے بیان کئے ہیں۔ (اعانت القرآن ج ۳ ص ۱۳۴ بحوالہ لباب التاویل)

صواع: میں بضم الصاد کے علاوہ اور بھی کئی ایک قرأتیں منقول ہیں، مگر متواتر قرأت بضم الصاد ہی ہے، اس سے مراد وہی شاہی پیالہ ہے، جس سے فلہ ناپنے کا کام بھی لیا جاتا تھا، جسے آیت: ۷۰ میں لفظ السقایۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"قالوا نفقد صواع الملک" الآیہ: برادران یوسف نے جب یہ سوال کیا کہ بھلا بتاؤ تو سہی کہ تمہاری کیا چیز گم ہوگئی ہے، جس کی بنا پر تم ہم پر چوری کا الزام لگا رہے ہو تو قافلہ کے تعاقب میں نکلنے والے کارندوں نے جواب دیا کہ بادشاہ کا پیمانہ (پیالہ) گم ہوگیا ہے، پھر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور قرین قیاس یہ ہے کہ یہ وہی شاہی افسر تھا جس نے "ایتھا العیر انکم لسارقون" کی آواز لگائی تھی، اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو شخص اس چوری کا پتہ لگا دے گا اس کو ایک اونٹ فلہ انعام میں ملے گا اور میں اس بات کا ضامن ہوں۔

کسی کام پر مخصوص انعام کا اعلان کرنا اور حق مالی کا ضامن بننا درست ہے:-

"ولمن جاء به حمل بعیر" سے ثابت ہوا کہ کسی معین کام کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کر دینا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر انعام یا اجرت ملے گی۔ جیسے اشتہاری مجرموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح کے انعامی اعلانات کا عام طور پر رواج ہے، اگر

چہ اس صورت معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق نہیں آتی، مگر اس آیت کی رو سے اس کا بھی جواز ثابت ہو گیا، اور وانا به زعیم سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے، اور اس صورت کا حکم جمہور فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ صاحب حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون یا ضامن جس سے بھی چاہے وصول کر سکتا ہے، ہاں! اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہوگا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا ہے وہ اصل مدیون سے وصول کرے۔

(معارف القرآن ج ۵ ص ۱۰۶ بحوالہ قرطبی)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ.

بولے قسم اللہ کی تم کو معلوم ہے ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک میں اور ہم کبھی چور تھے۔

ترکیب:- جملہ قالوا..... مستانفہ برائے بیان، جملہ تاللہ..... منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ قد علمتم ..... جواب قسم، جملہ ما جئنا..... محلاً منصوب مفعول بہ ہے فعل علم کا، جملہ "لنفسد....." محلاً مجرور ہے لام کی بنا پر اور فعل جئنا کے متعلق ہے، جملہ "ما کنا سارقین....." محلاً منصوب معطوف ہے جملہ جئنا پر۔

تاء قسمیہ کی تحقیق:- تاللہ میں تاء قسم حرف جر ہے، اس کے معنی قسم کے ہیں، اور یہ تعجب کے ساتھ مخصوص ہے، نیز اللہ کے نام کے سوا اور کسی وصفی نام پر داخل نہیں ہوتی۔

حرف جر للقسم و تختص بالتعجب وباسم الله تعالیٰ علی الصحیح (قاموس تاج) قسم فیه معنی للتعجب. (مدارک ج۲ ص۲۳۲)

حروف قسم میں باء تو اصل ہے، اور واو اس کا بدل، اور واو کا بدل تاء ہے، لیکن تاء میں تعجب کے معنی زائد ہیں۔

(کشاف سورہ انبیاء آیت "تاللہ لاکیدن اصنامکم" بحوالہ لغات القرآن)

علامہ سہیلی نے تاء کو واو کا بدل نہیں بلکہ مستقل قسم قرار دیا ہے، وزعم السهیلی انها اصل بنفسها ویلازمها التعجب غالبا کقوله تعالیٰ "تالله تفتؤا".

مگر ابن عطیہ نے "تاللہ" میں تاء کو واو کا بدل قرار دیا ہے جیسا کہ "تراث" "التوراۃ اور" التخمة "میں مگر" التوراۃ "میں تاء کا واو کا بدل ہونا بصریین کے نزدیک ہے۔ اور بعض علماء کا خیال ہے کہ "التوراۃ" میں تاء زائد ہے۔

قال ابن عطية والتاء في "تالله" بدل من واو كما ابدلت في تراث وفي "التوراة" وفي التخمة ولا تدخل التاء في القسم الا في المكتوبة وهي لفظ الجلالة "الله" لا تقول تالرحمن وتالرحيم واما قوله "وفي التوراة" يريد عند البصريين، وزعم بعضهم ان التاء فيها زائدة. (الدر المصون ج۶ ص۵۲۸)

سارقین: چرانے والے، چوری کرنیوالے، یہ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب وجر ہے۔

معارف و حقائق

وما كنا سارقين: میں جواب قسم ہونے کا بھی احتمال موجود ہے۔ گویا برادران یوسف نے نفی فساد اور نفی سرقہ دونوں پر قسم کھائی اور یوں کہا کہ بخدا ہم نہ تو فساد کیلئے آئے ہیں۔ اور نہ چوری کیلئے اور نہ یہ ہماری عادت ہے۔

"يحتمل ان يكون جوابا للقسم فيكونون قد اقسموا على شيئين. نفي الفساد و نفي السرقة". (بحوالہ سابق)

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے حقیقتاً چوری نہیں کی تھی:- قالوا تالله الآیۃ: یعنی برادران یوسف نے سرکاری کارندوں کی زبانی جب اپنے اوپر چوری کا عجیب وغریب اور حیرتناک الزام لگتے ہوئے سنا تو کہنے لگے کہ ہم اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہیں، اور تم ہمارے طور طریق اور عادات واطوار سے بخوبی واقف ہو، نیز ہم

اپنے ملک وعلاقہ کے انتہائی معزز اور اللہ کے پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حقیقی بیٹے ہیں، ہم چوری جیسے جرم کا ارتکاب کریں یہ ہمارے تصور سے باہر ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ برادران یوسف نے اپنے اوپر لگنے والے الزام کا انتہائی شدومد کے ساتھ انکار کیا جس کیلئے انہوں نے تاء قسم، لام، اور قد کے تاکیدی الفاظ استعمال کئے، اور سرکاری کارندے چونکہ ان کی سیرت واخلاق اور امانت سے واقف تھے اس لئے انہوں نے ان کارندوں کے علم کو اپنی براءت کی شہادت کے طور پر پیش کیا۔

استشهدوا بعلمهم على براءة انفسهم لما عرفوا فى كرتى مجيئهم ما يدل على فرط امانتهم. (مظہری ج۵ص۱۸۲)

"ما كنا سارقين" سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تم بخوبی یہ بات جانتے ہو کہ ہم چور نہیں ہیں، اور ہم کبھی بھی صفت سرقہ کے ساتھ متصف نہیں رہے ہیں۔

اى ما كنا نوصف بالسرقة قط. (روح ج۷ص۲۷)

حقیقتاً وہ فعل سرقہ سے بری تھے، اس لئے انتہائی شدومد کے ساتھ مکررسہ کرر تاکیدی الفاظ کے ذریعہ اپنی برأت کا اظہار کیا۔

قَالُوْا فَمَا جَزَاءُهٗ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِيْنَ .

پھر بولے کیا سزا ہے اس کی، اگر تم نکلے جھوٹے۔

ترکیب:- جملہ قالوا..... مستانفہ، جملہ ما جزاء ہ.....محلاً مجزوم جواب ہے شرط مقدر کا، تقدیر عبارت" ان کان سارقا و کنتم کاذبین فما جزاء ہ" ہے اور جملہ شرط مقدر محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ کنتم کاذبین....." شرط مقدر اول کی تفسیر ہے اور جواب شرط محذوف ہے جس پر اس کا مقابل دلالت کر رہا ہے، تقدیر عبارت "ان کنتم کاذبین فما جزاء ہ " ہے۔

فما جزاء ہ : میں ضمیر ھا راجع ہے "الصواع" کی جانب اور مضاف محذوف ہے، تقدیر عبارت " فما جزاء سرقته" ہے۔

الهاء تعود على الصواع ، ولا بد من حذف مضاف اى : فما جزاء سرقته. (الدر المصون ج۶ ص۵۲۸)

اور بقول بعض ضمیر ھا چور، یا چوری کی طرف راجع ہے۔

وقيل : الضمير لسرق او للسارق. (روح ج۷ ص۲۷)

"قالوا فما جزاء ہ" الآية کا مفہوم:- برادران یوسف کے چوری سے مکرر سہ کر انکار کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے کہا کہ اگر تلاش کے بعد شاہی پیالہ تمہارے سامان میں ہی نکل آیا اور تمہارا جھوٹ ثابت ہو گیا تو تم خود ہی بتاؤ کہ تمہارے آئین وقانون اور شریعت کے مطابق اس کی سزا کیا ہو گی۔

قَالُوْا جَزَاءُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَاءُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ .

کہنے لگے اس کی سزا یہ کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے۔ ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔

ترکیب ولغات:- جملہ قالوا..... مستانفہ برائے بیان، جملہ جزاء ہ..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ من وجد..... ماسبق کی تفسیر ہے۔ جملہ "وجد....." خبر ہے (من) مبتدا کی، جملہ "ھو جزاء ہ....." محلاً مجزوم جواب شرط مقترن بالفاء ہے، جملہ "نجزی....." مستانفہ قائم مقام قول کے۔

'جزاء ہ" اس کی جزا، اس کی سزا، اس کا بدلہ، جزاء مضاف "ہ"، ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، خیر کے بدلے میں خیر اور شر کے بدلہ میں شر کو جزاء کہا جاتا ہے۔

معارف و حقائق

شریعت یعقوبی میں چوری کی سزا:- "قالوا جزاء ہ من وجد فی رحلہ فھو جزاء ہ" برادران یوسف نے جواب دیا کہ چوری کا مال جس کے سامان میں نکلے وہ خود ہی اس کی جزا ہے، یعنی چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کو پکڑ کر غلام بنالیا جائے، شریعت یعقوبی میں چور کی یہی سزا تھی، کہ اس نے جس کی چوری کی ہے وہ اسے پکڑ کر اپنا غلام بنالے، گویا مال مسروقہ جس کے سامان میں برآمد ہوا، اسے غلام بنالینا قطع ید کے قائم مقام تھا جو کہ ہماری شریعت میں مشروع ہے۔

قال ابن عباسؓ کانوا فی ذلک الزمان یستعبدون کل سارق

بسرقته و كان استعباد السارق في شرعهم يجري مجرى وجوب القطع في شرعنا. (کبیر ج۹ ص۱۴۴)

"فهو جزاء ه" میں "جزاء ه" کو دوبارہ ذکر کرنا حکم سابق کی تفسیر کے واسطے ہے۔ جیسا کہ "حق الضيف ان يكرم فهو حقه" میں "فهو حقه" کا اعادہ حکم سابق "حق الضيف ان يكرم" کی تقریر کیلئے ہے نہ کہ تاکید محض کے واسطے، گویا "جزائه من وجد في رحله" سے نفس حکم کا فائدہ اور "فهو جزاء ه" سے اس حکم کی حقیقت کا فائدہ دینا مقصود ہے، یعنی حقیقۃً سارق ہی سرقہ کا بدلہ ہے کوئی مجازی معنی مراد نہیں ہے۔

"وهو تقرير للحكم السابق باعادته كما في قولك: حق الضيف ان يكرم فهو حقه وليس مجرد تاكيد. فالغرض من الاول افادة الحكم ومن الثاني افادة حقيقة". (روح ج۷ ص۲۷)

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے برادران یوسف سے براہ راست ان کے والد کی شریعت کا حکم معلوم کر کے ان کو اس بات کا پابند بنا دیا کہ مسروقہ پیالہ جسکے سامان سے نکلے گا اسے وہ ان کے حوالہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

"كذالك نجزي الظالمين" کا مفہوم:- ہم ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی ہی رسوا کن سزا دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو فعل سرقہ کا ارتکاب کرے گا اسے بھی چرا لیا جائے گا (یعنی غلام بنا لیا جائے گا)۔

اى مثل هذا الجزاء جزاء الظالمين: يريد اذا سرق استرق.

(کبیر ج۹ ص۱۴۴)

ظاہر یہی ہے کہ یہ برادران یوسف کے کلام کا تتمہ ہے، اور بقول بعض

"کذالک نجزی الظالمین" حضرت یوسف علیہ السلام کے کارندوں کا کلام ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ بذات خود حضرت یوسف علیہ السلام کا کلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے جس سزا کا تذکرہ کیا ہے ہم بھی چوری کرنے والے کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

والظاهر هذا من تتمة كلام الاخوة وقيل : هو من كلام اصحاب يوسف وقيل: كلامه نفسه اى مثل الجزاء الذى ذكرتموه نجزى السارقين. (روح ج ۷ ص ۲۸)

فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاءِ أَخِيْهِ .
كَذَالِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاخُذَ أَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ إِلَّا
أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٍ.

پھر شروع کیں حضرت یوسف نے ان کی خرجیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے، آخر کو وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے، یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو، وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین قانون میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ، ہم درجے بلند کرتے ہیں جسکے چاہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر ایک جاننے والا ہے۔

ترکیب ولغات:- جملہ بدأ باوعیتھم..... معطوف ہے جملہ مستانفہ مقدرہ پر، تقدیر عبارت فارجعوا الی یوسف فبدأ باوعیتھم ہے۔ جملہ استخرجھا.....معطوف ہے جملہ "بدأ" پر، جملہ "کدنا لیوسف..... مستانفہ، جملہ "ماکان لیاخذ..... ، جملہ تعلیلیہ، جملہ یاخذ اخاہ..... صلہ ہے موصول حرفی (ان مضمر کا) جملہ یشاء اللہ صلہ ہے موصول حرفی (ان) کا، جملہ نرفع مستانفہ، جملہ نشاء.....صلہ ہے اسم موصول (من) کا اور عائد ضمیر مقدر (ھا) کا، جملہ فوق کل .....علیم معطوف ہے جملہ نرفع پر۔

اوعیتھم: ان کی خرجیں، اوعیة ، وعاء کی جمع ، وعاء اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز بحفاظت رکھی جائے، اوعیة مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔
(لغات القرآن ج۱ص۲۹۷)

وعاء بروزن فعال بکسر الفاء اس میں ھمزہ واو سے بدلا ہوا ہے، اصل میں وعای تھا، اس لئے کہ جمع اوعیة ہے، یاء واقع ہوتی طرف کلمہ میں الف کے بعد تو وہ ہمزہ سے بدل گئی، اس کی جمع الجمع اواع آئی ہے۔

(اوعیة) جمع وعاء، اسم لما یوعه فیه الشی ویحفظ، وزنه فعال بکسر الفاء، والهمزة منقلبة عن یاء، اصله وعای لان الجمع اوعیة. فلما تطرقت الیاء بعد الف ساکنة قلبت همزة فاصبح دعاء، وجمع الجمع اواع. (اعراب القرآن ج۷ص۳۸)

"کدنا" ہم نے خفیہ تدبیر کی جمع متکلم ماضی معروف، اس کا مصدر کید آتا ہے، لفظ کید عموماً مقام ذم میں استعمال کیا جاتا ہے، جس کا معنی ہوتا ہے، مکر وفریب، دھوکہ، مگر کبھی اس کا استعمال اچھی پوشیدہ تدبیر کیلئے بھی ہوتا ہے، جیسا کہ "ان کیدی متین" میں کید سے اچھی خفیہ تدبیر ہی مراد ہے۔ (لغات القرآن ج۵ص۱۴۴)

کدنا بروزن قلنا بکسر الفاء، اصل میں کیدنا تھا ضمیر جمع متکلم کے داخل ہوجانے سے فعل مبنی بر سکون ہوگیا، لہذا اجتماع ساکنین کو ختم کرنے کیلئے یاء کو حذف کر دیا۔

"اصله کیدنا فلما بنی الفعل علی السکون لدخول ضمیر جمع المتکلم حذفت الیاء للتخلص من التقاء الساکنین وزنه قلنا بکسر الفاء. (اعراب القرآن ج۷ص۳۹)

فبدأ باوعیتھم قبل وعاء اخیه، جمہور قراء سے وعاء بکسر الواو منقول ہے، اور حسن نے اسے بضم الواو پڑھا ہے۔ اور یہی نافع سے بھی منقول ہے، اور سعید بن جبیر نے واو کو ہمزہ سے بدل کر اعاء پڑھا ہے، اور یہ قبیلہ بنو ھذیل کی لغت ہے، وہ شروع کلمہ میں واقع ہونیوالے واو مکسور کو ہمزہ سے بدل دیتے ہیں، چنانچہ وہ وشاح، وسادۃ، اور وعاء کو اشاح، اسادۃ، اور اعاء پڑھتے ہیں۔

(الدر المصون ج۶ ص۵۳۲، روح ج۷ ص۲۹)

معارف و حقائق

حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب تلاشی کی نسبت مجازاً ہے:۔

فبدأ باوعیتھم: میں تلاشی لینے کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب مجازاً ہے، راجح یہی ہے کہ تلاشی لینے والے حقیقت میں وہ افسر اور کارندے ہیں جنہوں نے "ایتھا العیر انکم لسارقون" کی پکار لگائی تھی، مگر نائب کا فعل بھی اصل ہی کی جانب منسوب ہوتا ہے، اس لئے اس کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب کر دی گئی، مطلب یہ ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے جب چوری سے اپنی برأت کا اظہار کیا، اور پھر قیل وقال کے بعد یہ کہا کہ پیالہ جس کے سامان میں برآمد ہو وہی اس کی جزا ہے، یعنی آپ کیلئے درست ہوگا کہ اسے اپنا غلام بنا کر روک لیں، تو ضروری ہوگیا کہ ان کی تلاشی لی جائے، چنانچہ وہ لوٹا کر شاہی دربار میں لائے گئے، یا یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہاں بذات خود تشریف لے گئے، اور پھر تلاشی کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ بنیامین کے سامان سے پہلے دوسرے وسوں بھائیوں کے سامانوں کی تلاشی لی گئی، تاکہ کسی طرح کی ساز باز کا شبہہ نہ ہو سکے، پھر جب بنیامین باقی رہ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام یا ان کے نائب نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس نے نہیں لیا ہوگا۔

تو بھائیوں نے کہا: نہیں آپ اس کے سامان کی بھی ضرور تلاشی لیجئے تا کہ ہم سب کو اطمینان ہو جائے۔

(فبدأ) قیل الموذن و رجح بقرب سبق ذکرہ وقیل : یوسف فقد روی ان اخوتہ لما قالوا ما قالوا، قال لھم اصحابہ لا بد من تفتیش رحالکم، فردوھم بعد ان ساروا منزلا، او بعد ان خرجوا من العمارۃ الیہ علیہ السلام فبدأ (باوعیتھم)ای بتفتیش اوعیۃ الاخوۃ العشرۃ و رجح ذلک بمقاولۃ یوسف فانھا تقتضی ظاھرا وقوع ما ذکر بعد ردھم الیہ ولا یخفیٰ ان الظاھر ان اسناد التفتیش الیہ علیہ السلام مجازی والمفتش حقیقۃ اصحابہ بامرہ بذالک ((قبل))تفتیش ((وعاء اخیہ)) بنیامین لنفی التھمۃ ، روی انہ لما بلغت النوبۃ الی وعائہ قال: ما اظن ھذا اخذ شیئا فقالوا : واللہ لا نترکہ حتی تنظر فی رحلہ فانہ اطیب لنفسک وانفسنا. (روح ج ۷ ص ۲۸)

((ثم استخرجھا من وعاء اخیہ)) برادران یوسف کے اصرار پر جب بنیامین کا سامان کھولا گیا تو اس میں سے سقایہ یا صواع کو برآمد کر لیا، یہ دیکھ کر ان کی گردنیں شرم سے جھک گئیں اور وہ بنیامین کو سخت سست کہنے لگے. اور پھر شریعت یعقوبی کے مطابق خود بھائیوں کے اقرار سے حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنا غلام بنا کر روک لیا۔

"واخذ بنیامین رقیقاً". (مظہری ج ۵ ص ۱۸۳)

فائدہ:- "ولمن جاء بہ حمل بعیر" میں "صواع" کی جانب لوٹنے والی ضمیر کو مذکر لائے اور یہاں ضمیر مونث استعمال کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ "لمن

جاء به "میں ضمیر مذکر "صواع" کی جانب راجع ہے، اور یہاں "السقایه" کی جانب یا اس بنا پر کہ صواع کا استعمال مذکر اور مونث دونوں کیلئے ہوتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اس کا نام "سقایہ" رکھا ہو اور ان کے کارندوں اور غلاموں نے "صواع" نام رکھا ہو۔

قالوا: رجع ضمير المؤنث الى السقاية و ضمير المذكر الى الصواع ، او يقال : الصواع يونث ويذكر، فكان كل واحد منهما جائزاً او يقال : لعل يوسف كا ن يسميه سقاية و عبيده صواعا فقد وقع فيما يتصل به من الكلام سقاية وفيما يتصل بهم صواعا.

(کبیر ج ۹/۱۸ ص ۱۴۵، الدر المصون ج ۶ ص ۵۳۳)

"ثم استخرجها من وعاء اخيه" ثم استخرجها منه "یا" من وعائه " کہنے کے بجائے (ضمیر کو وعاء یا بنیامین کی طرف راجع کر کے) "ثم استخرجها من وعاء اخيه" فرمانا زیادتی کشف و بیان کے واسطے ہے۔

" لم يقل منه على رجع الضمير الى الوعاء او من وعائه على رجعه الى اخيه قصدا الى زيادة كشف و بيان. (روح ج ۱۳/۱۷ ص ۲۸)

"كذالك كدنا ليوسف "یعنی بھائیوں کی زبان سے ہی ان کی شریعت کے مطابق چور کی سزا کو متعین کروادیا تا کہ تحقیق کے بعد جرم ثابت ہو جانے پر حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کو اپنے پاس غلام بنا کر روک سکیں۔

اى مثل ذلك الكيد العجيب وهو ارشاد الاخوة الى الافتاء المذكور باجرائه على السنتهم و حملهم عليه بواسطة المستفتين من حيث لم يحتسبوا. (روح ۱۳/۱۷ ص ۲۹)

اور بقول بغوی لفظ کید یہاں جزاء الکید (بدلہ) کے معنی میں ہے۔ یعنی جیسا سلوک برادران یوسف نے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا ویسا ہی ہم نے ان کے ساتھ کیا، نیز وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ لفظ کید مخلوق کی جانب سے مکروفریب کے معنی میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدبیر صحیح کے معنی میں۔

"قال البغوی الکید ههنا جزاء الکید، یعنی کما فعلوا فی الابتداء بیوسف من الکید فعلنا بهم، و قال الکید من الخلق الحیلة ومن الله التدبیر بالحق. (مظہری ج۵ص۱۸۳)

لفظ "کید" کے بارے میں ایک ضابطہ:- امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ کید اور اس کے مثل الفاظ جب باری تعالیٰ کیلئے استعمال ہوتے ہیں تو وہ منتہائے مقصود اور حاصل غرض پر محمول ہوتے ہیں نہ کہ اغراض و مقاصد کی ابتداء پر، یعنی اعمال کے ابتدائی مدارج پر محمول نہیں ہوتے۔

انا ذکرنا قانونا معتبرا فی هذاالباب وهو ان امثال هذه الالفاظ تحمل علی نهایات الاغراض لا علی بدایات الاغراض. (کبیر ج۹/۱۸ص۱۴۵)

مصر کے قانون میں چور کی سزا:- "ماکان لیاخذ اخاه فی دین الملک: یعنی چوری کے جرم میں حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کو اپنے پاس روک لیں، مصری قانون کے اعتبار سے ان کے لئے اس کی گنجائش نہیں تھی، کیوں کہ مصری حکومت کا قانون تو یہ تھا کہ چور کو مارا جائے اور چوری کے سامان سے دوگنا قیمت لے کر چھوڑ دیا جائے۔

"ای لم یکن له اخذه فی حکم ملک مصر قاله ضحاک وغیره. (ابن کثیر ج۲ص۴۵۱)

"انه كان حكم الملك في السارق ان يضرب و يغرم ضعفي ما سرق ، فما كان يوسف قادرا على حبس اخيه عند نفسه بناء على دين الملك و حكمه". (کبیر ج۹/۱۸ ص۱۴۵)

" الا ان يشاء الله" میں استثناء عموم احوال سے ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کسی حال میں بھی بنیامین کو اپنے پاس روک نہیں سکتے تھے۔ مگر اللہ کے حکم اور اس کی اجازت سے، یعنی اللہ کے حکم اور اس کی اجازت سے چوری کی سزا میں چور کو غلام بنا لینے کے حکم کو بادشاہ مصر کا حکم قرار دے سکتے تھے۔

ایٔ استثناء مفرغ منا لاحوال العامة، والتقدير ما كان ليأخذه في كل حال الا في حال التباسه بمشية الله تعالىٰ اى اذنه في ذلك.

(الدر المصون ج۶ ص۵۳۳)

ان يجعل ذلك الحكم حكم الملك فالاستثناء منا عم الاحوال. (مظہری)

اور استثناء کو منقطع قرار دینا بھی درست ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بادشاہ مصر کے قانون میں تو حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کی گنجائش نہیں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت واذن سے اور اس کے لطف وکرم سے اس کی گنجائش پیدا ہوگئی کہ بھائیوں نے خود ہی اس بات کا اقرار کرلیا کہ چوری کرنیوالے کی سزا یہ ہے کہ اسے غلام بنا لیا جائے، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد حاصل ہوگیا۔

"ويجوز ان تكون منقطعاً اى لكن اخذ بمشية الله واذنه و لطفه حيث وجد السبيل الى ذلك بان رد يوسف الحكم الى اخوته ،

واجری اللہ علی السنتھم ان جزاء السارق الاسترقاق فحصل مراد یوسف بمشیۃ اللہ تعالیٰ (مظھری) انھا استثناء منقطع تقدیرہ : ولکن بمشیۃ اللہ اخذہ فی دین غیر الملک وھو دین آل یعقوب . ار الاسترقاق جزاء السارق. (الدرالمصون)

"نرفع درجات من نشاء" میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف اور جلالت علم کا بیان ہے:-

یعنی ہم جسے چاہتے ہیں علم کے بہت سے اعلیٰ مراتب پر فائز کر دیتے۔ اور اپنی تدبیر لطیف سے سربلند کر دیتے ہیں۔

ای رتبا کثیرۃ عالیۃ من العلم (روح ۱۳/۷ ص:۳۰) چنانچہ ارشاد خداوندی:" یرفع اللہ الذین آمنوا منکم" (مجادلہ:۱۱) اور "نرفع درجات" میں علم کے درجات کی جانب اشارہ ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کے مقابلہ میں ہر چیز میں فوقیت عطا فرمائی۔

"والمراد ھٰھنا ھو انہ تعالیٰ رفع درجات یوسف علی اخوتہ فی کل شئی". (کبیر ۹/۱۸/۱۴۶)

علم کی اشرفیت وافضلیت پر آیت کریمہ کی دلالت بالکل واضح اور ظاہر ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر پر حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح فرمائی ہے، جس کا اس نے ان کے دل میں القاء فرمایا اور جس کی ہدایت دی۔

الآیۃ تدل علی ان العلم اشرف المقامات واعلی الدرجات لانہ تعالیٰ لما ھدیٰ یوسف الی ھذہ الحیلۃ والفکرۃ مدحہ لاجل ذلک. (بحوالہ سابق)

ذات خداوندی پر علم کی انتہا ہو جاتی ہے:-

"وفوق کل ذی علم

علیم" اور ہر جاننے والے سے اوپر ایک جاننے والا ہے، علیم بروزن فعیل مبالغہ کا صیغہ ہے، بمعنی بہت زیادہ جاننے والا، اس کی جمع علماء آتی ہے، لہذا اس کے حقیقی معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ کا علم ہر ذی مخلوق کے علم سے بڑھا ہوا ہے۔

علیم" هو الله تعالیٰ اذ معنی العلیم لغة الذی له العلم البالغ".

مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر علم کی انتہاء ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے، اور یہ علمی تفوق کا سلسلہ اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، تو اللہ ہر عالم سے بڑھ کر علم رکھنے والا ہے۔

وقال ابن عباس فوق كل عالم عالم الى ان ينتهي العلم الى الله فالله فوق كل عالم.

یا معنی یہ ہے کہ ہر ذی علم مخلوق سے اوپر دوسری ذی علم مخلوق ہے، خواہ یہ فوقیت علمی بعض ہی لحاظ سے کیوں نہ ہو، جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ نے مجھے (تکوینیات کا) ایسا علم عطا کیا ہے جس سے آپ ناواقف ہیں، ور آپ کو منجاب اللہ (تشریعیات) کا وہ علم حاصل ہے جو مجھے حاصل نہیں اور ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "تم اپنے دنیاوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو"۔

او المعنیٰ فوق كل ذی علم من الخلق عليم منهم وان كان التفوق من وجه دون وجه، كما قال خضر لموسیٰ عليهما السلام يا موسیٰ انی على علم من علم الله علمنيه الله لا تعلمه، وانت على علم من الله لا اعلمه. (بخاری ۱۲۲، مسلم ۲۳۸۰)

وقال رسول الله ﷺ : انتم اعلم بامور دنیاکم .

(مظہری ج ۵ ص ۸۴/۱۸۳)

فائدہ:- یہاں آیت "فوق کل ذی علم علیم" جس واقعہ کے ضمن میں آئی ہے اس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام بھی صاحب علم و فضل تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو علمی اعتبار سے بھی ان پر فوقیت عطا فرمائی تھی۔

دل هذه الآية على ان اخوة يوسف كانوا علماء فضلاء إلا أن يوسف كان زائداً عليهم في العلم. (کبیر ۹/۱۸/۱۴۶)

فائدہ:- سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کا بمقابلہ اپنے بھائیوں کے اعلم ہونا علم شریعت میں تو بالکل واضح ہے کیوں کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، اور اللہ کا نبی علم شریعت کا سب سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں کی بہ نسبت دوسرے علوم میں بھی فضیلت اور برتری حاصل رہی ہو۔

کمال علم و فضل کا دعویٰ کسی کیلئے درست نہیں:- آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ علم کی کوئی انتہاء نہیں ہے، بڑے سے بڑا عالم بھی بہت سی چیزوں سے ناواقف ہوا کرتا ہے، اور نبی کریم ﷺ (باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب سے زیادہ علم عطا فرمایا تھا) جب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ۔" انتم اعلم بامور دنیاکم" تو پھر اب اس کے بعد کمال علم و فضل کا دعویٰ کس کیلئے درست ہوسکتا ہے؟

فائدہ:- واضح رہے کہ آیت ۷۳ سے لیکر یہاں تک واقعات کی جو تفصیل ذکر کی گئی اس پورے واقعہ میں حضرت یوسف علیہ السلام سے خلاف شرع کوئی کام سرزد نہیں ہوا ہے، بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا بحکم خداوندی کیا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ

"وکذالک کدنا لیوسف" سے یہ بات بالکل واضح ہے، دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء کی تکمیل بحکمت خداوندی اس پر موقوف تھی کہ بنیامین کو بھی چند دن کیلئے ان سے جدا کر دیا جائے جس کیلئے وہ تمام صورت حال پیدا کی گئی یا پیدا ہوئی جسے آیات ماقبل میں بیان کیا گیا ہے۔

قَالُوْا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ فَأَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَاناً وَّاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ.

کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے، تب آہستہ سے کہا یوسف نے اپنے جی میں اور ان کو نہ جتایا، کہا جی میں کہ تم بدتر ہو درجہ میں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔

ترکیب:- جملہ قالوا..... مستانفہ، جملہ ان یسرق..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ قد سرق ..... جواب شرط مقترن بالفاء، جملہ اسرھا یوسف..... معطوف ہے جملہ مستانفہ پر، جملہ لم یبدھا..... معطوف ہے جملہ أسرھا پر، جملہ قال..... مستانفہ برائے بیان، جملہ انتم شر..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ اللہ أعلم..... محلاً منصوب معطوف ہے أنتم شر..... پر ہے جملہ تصفون..... صلہ ہے موصول حرفی (ما) کا۔

معارف وحقائق

حضرت یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام اور اس کی تفصیل:-

''قالوا ان یسرق فقد سرق اخ له من قبل'' یعنی تلاشی کے بعد جب بادشاہ کا پیالہ بنیامین کے سامان سے نکل آیا تو برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام ہی سے کہا جن کو وہ ابھی تک پہچان نہ سکے تھے، اگر اس نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ ہمارا حقیقی نہیں بلکہ علاتی بھائی ہے، اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اس نے بھی اس جرم کا ارتکاب کیا تھا، برادران یوسف نے یہ بات محض بغض وحسد اور فساد کی

بنا پر کہی تھی ورنہ اس بات سے وہ بخوبی واقف تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چوری وغیرہ کا کبھی بھی ارتکاب نہیں کیا تھا، بلکہ خواہ مخواہ ایک بات ان کی جانب منسوب کردی گئی تھی، جس کے بارے میں مفسرین نے مختلف واقعات ذکر فرمائے ہیں۔

(۱) قتادہ سے منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے نانا کا بت چوری سے توڑ کر اسے راستہ پر پھینک دیا تھا تا کہ آئندہ وہ اس کی عبادت سے باز رہیں۔

قال قتادہ کان لجدہ الی امہ صنم یعبدہ فاخذہ سرا و کسرہ والقاہ فی الطریق لئلا یعبدہ (کذا اخرج ابن مردویہ عن ابن عباس عن النبی ﷺ). (مظہری ۱۸۴/۵، ابن کثیر ۷۵۱/۲، کبیر ۱۸/۹ ص ۱۴۷)

(۲) مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پھوپھی کی پرورش میں تھے، اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا پٹکا جس کی بڑی اہمیت تھی، وہ بڑی اولاد ہونے کی بنا پر وراثت میں ان کی پھوپھی کو ملا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام جب ہوشیار ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بہن سے کہا کہ یوسف کو اب میرے حوالے کردو، مگر وہ حوالہ کرنے پر تیار نہ ہوئیں کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کمالات ان پر واضح تھے۔ مگر واپس کرنے پر مجبور بھی تھیں، چنانچہ کچھ دنوں کیلئے اور اپنے پاس رکھنے کی بھائی سے اجازت لے لی، اور ایک دن وہ پٹکا ان کی کمر میں باندھ کر یہ شور مچایا کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا پٹکا گم ہو گیا ہے، چنانچہ جب گھر کے افراد کی تلاشی لی گئی تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سے برآمد ہوا تو خود اپنی اور اپنے باپ دادا اسحاق و ابراہیم علیہما السلام کی شریعت کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف کو بہن کے پاس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ بہن کی زندگی تک حضرت یوسف علیہ السلام ان کے پاس رہے، اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو باپ کے پاس واپس آئے، (ابن کثیر، کبیر، مظہری، روح وغیرہ) تفسیر کی

کتابوں میں اور بھی کئی ایک واقعات کا ذکر موجود ہے، مگر ان کے مطالعہ سے اول نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بچپن میں جو کچھ پیش آیا یا انھوں نے کیا (مثلاً کھانے وغیرہ کی چیزوں کو خفیہ طور سے فقراء وغیرہ کو دینا) اس پر چوری کا اطلاق ہرگز نہیں کیا جا سکتا، یہ تو محض بھائیوں کا عناد و حسد تھا جو ایک مرتبہ پھر بیدار ہو گیا تھا، اور حاسد کے دل میں کھوٹ نہ ہو اور موقع ملنے پر وہ ظاہر نہ ہو جائے یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

انهم كذبوا عليه و بهتوه و كانت قلوبهم مملوءة بالغضب على يوسف بعد تلك الوقائع ، و بعد انقضاء تلك المدة الطويلة وهذه الواقعة تدل على ان قلب الحاسد لا يطهر عن الغل البتة. (کبیر ۹/۱۸/۱۴۷)

شاہی پیالہ کے بنیامین کے سامان سے برآمد ہو جانے کے بعد بھی برادران یوسف نے حرف (ان) اس لئے استعمال کیا کہ محض پیالہ کے بنیامین کے سامان میں نکل آنے سے ان کو اس پر چوری کا یقین نہیں تھا، کیونکہ پہلے سفر میں وہ اپنی پونجی خود اپنے سامانوں میں پا چکے تھے، حالانکہ انھوں نے چوری نہیں کی تھی۔

واتوا بكلمة (ان) لعدم جزمهم بسرقته بمجرد خروج السقاية من رحله فقد وجدوا من قبل بضاعتهم فى رحالهم و لم يكوانوا سارقين.

مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کو بنیامین کے چوری کرنے کا یقین نہیں تھا، تو پھر باپ کے سامنے پورے جزم و یقین کے ساتھ انہوں نے "**ان ابنک سرق**" کیوں کہا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "**ان ابنک سرق**" سے انہوں نے اس صورت حال کو بیان کیا ہے جو بظاہر پیش آ چکی تھی۔ **واما قولهم (ان ابنک**

سرق) فبناء على الظاهر۔

فقد سرق أخ: میں اخ کونکرہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جولوگ وہاں موجود تھے وہ بنیامین کے بھائی کی چوری سے ناواقف تھے۔

و تنكير (اخ) لان الحاضرين لا علم لهم به. (روح:۷/۱۳/۳۲)

چوری کے الزام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا تاثر:-

فاسرها يوسف في نفسه ولم يبد ها لهم : فاسرها میں ھا ضمیر منصوب کی تفسیر سیاق کلام سے ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ بھائیوں کے" فقد سرق اخ له" کہنے کی بناپر حضرت یوسف علیہ السلام کوان پر بے حد غصہ آیا، (اور آنا بھی چاہئے تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایک بالکل جھوٹی اور بے بنیاد بات کہی تھی) مگر اس کو انہوں نے بھائیوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا، بلکہ اسے پی گئے۔

الضمير المنصوب مفسر بسياق الكلام اى : فاسرها الخرازة التى حصلت له من قولهم ((فقد سرق اخ له)). (الدرالمصون۶/۵۳۵)

اور بقول بعض حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے قول کو اپنے دل میں چھپالیا اور اس کو بھائیوں پر ظاہر نہ ہونے دیا، گویا سنی ان سنی کردی۔ یعنی انہوں نے جس سرقہ کی نسبت ان کی جانب کی تھی اس کی کیفیت کو مخفی رکھا، اور اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ اس کا وقوع کیسے ہوا تھا، اور یہ کہ اس کو موجب طعن بنانا درست نہیں ہے۔

والمعنىٰ اسر يوسف مقالتهم يعنى اسر يوسف فى نفسه كيفية تلك السرقة ولم يبين لهم أنها كيف وقعت وأنه ليس فيها ما يوجب الذم والطعن. (کبیر۹/۱۸ص۱۴۸)

اور زمخشری نے ھا ضمیر کو بغیر مرجع کے بشرط تفسیر قرار دیا ہے، یعنی اس کی تفسیر "انتم شر مکانا" ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے "انتم شر مکانا" کے قول کو اپنے دل میں چھپائے رکھا، اور ان پر اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا، مگر اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تب ضمیر کو مونث کیوں لائے؟ قاعدہ کے مطابق اسے مذکر لانا چاہئے تھا، کیونکہ "انتم شر مکانا" کلام ہے نہ کہ کلمہ، تو اس کا جواب یہ ہے کہ "انتم شر مکاناً" جملہ یا کلمہ کی تاویل میں ہے، اور کلام پر کلمہ کا اطلاق عربوں کی عادت ہے، گویا معنی یہ ہو گئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے "انتم شر مکانا" کے کلمہ یا جملہ کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا کیونکہ "انتم شر مکانا" اسرھا سے بدل واقع ہو رہا ہے۔

وقال الزمخشری : اضمار علی شریطة التفسیر "تفسیره" انتم شر مکانا وانما أنث لان قوله ((شر مکانا)) جملة او کلمة علیٰ تسمتیهم الطائفة من الکلام کلمة . کأنه قیل : فاسر الجملة او الکلمة التی هی قوله : انتم شر مکانا. لان قوله " قال انتم شر مکانا بدل من اسرها.

اور عبداللہ بن ابی علبہ کی قرأت میں "فاسره" ضمیر مذکر کے ساتھ ہے اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ حضرت یوسف نے "انتم شر مکانا" کے قول یا کلام کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا، و قرأ عبدالله وابن ابی علبة "فاسره" بالتذکیر، قال الزمخشری" یرید القول او الکلام". (الدر المصون ۶/ص:۵۳۶)

قال انتم شر مکاناً کا مفہوم:- یعنی عنداللہ تم انتہائی بے وقعت ہو کیونکہ تم نے اپنے والد نامدار کی نافرمانی کی اور اپنے بھائی کو حیلے بہانے سے حاصل

کر کے ظلماً اسے گمنام کنویں میں ڈال دیا، اور پھر باپ کے سامنے یہ جھوٹ گھڑ کر بیان کیا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا، پھر بیس درہم پر اسے قافلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا، (گویا تم چھنٹے بدمعاش ہو کہ دوسرے تو مال ہی چراتے ہیں اور تم انسانوں کو چرا کر بیچ دیتے ہو) اور ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد بھی تمہارا کینہ اور بغض وحسد ختم نہیں ہوا کہ اب اس پر چوری کا الزام لگا رہے ہو، (یہ تمام باتیں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے جی میں کہیں)۔

ای انتم شر منزلة عندالله تعالیٰ لما اقدمتم علیه من ظلم اخیکم و عقوق ابیکم فاخذتم اخاکم و طرحتموه فی الجب . ثم قلتم لابیکم، ان الذئب اکله و انتم کاذبون ثم بعتموه بعشرین درهما، ثم بعد المدة الطویلة والزمان الممتد مازال الحقد والغضب عن قلوبکم فرمیتموه بالسرقة. (کبیر ۱۸/۹ ص ۱۴۸)

اور ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے "**انتم شر مکانا**" بھائیوں کے سامنے ان کو شرمندہ کرنے کیلئے کہا کہ ابھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم چوری کے قریب تک نہیں ہیں، یا اب غیر حاضر بھائی پر بھی چوری کا الزام لگا رہے ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم انتہائی گھٹیا اور کمینے قسم کے لوگ ہو، یہ کیسا برا مقام ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

والظاهر من قوله ((انتم شر مکانا)) خطا بهم بهذا القول فی الوجه فکأنه اسر کراهته مقالتهم ثم و بخهم بقوله ((انتم شر مکانا)).

(۱/۵ البحر ۳۳۴)

مگر پہلی تفسیر یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کہا وہ اپنے جی میں کہا

بھائیوں کے منہ پر لعن طعن کر کے انہیں شرمندہ نہیں کیا، جمہور مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے، قال: أسر في نفسه. (ابن کثیر ۲/۷۵۶)

والله أعلم بما تصفون: أعلم اسم تفضیل علی الاطلاق مبالغہ کے معنی کو بیان کرنے کیلئے ہے، برادران یوسف کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے علم کی برتری کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ معاملہ کی وہ نوعیت نہیں ہے جو تم بیان کر رہے ہو، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سرقہ کی نسبت کرنے میں تم کاذب ہو۔

((ای عالم علما بالغا الی اقصی المراتب بان الامر لیس کما تصفون من صدور السرقة منا. فصیغة افعل لمجرد المبالغة لا لتفضیل علمه تعالیٰ علی علمهم)). (روح ۷/۱۳/۳۳)

قَالُوْا يَا أَيُّهَا الْعَزِيْزُ إِنَّ لَهُ أَباً شَيْخاً كَبِيْراً فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ .قَالَ مَعَاذَ اللهِ أَنْ نَّاخُذَ إِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ إِنَّا إِذاً لَّظٰلِمُوْنَ .

کہنے لگے اے عزیز اس کا باپ ہے بوڑھا بڑی عمر کا سو رکھ لے ایک کو ہم میں سے اس کی جگہ ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا، بولا اللہ پناہ دے ہم کو کہ پکڑیں مگر جس کے پاس پائی ہم نے اپنی چیز، تو ہم ضرور بے انصاف ہوں گے۔

ترکیب:- جملہ قالوا.....مستانفہ برائے بیان، جملہ "یا ایها العزیز....." جملہ معترضہ، جملہ" ان له ابا....." محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ خذ.....محلاً مجزوم جواب ہے شرط مقدر کا تقدیر عبارت ((ان کان لا بد من أخذ أحد فخذ أحدنا)) ہے، جملہ "انا نراک....." برائے تعلیل، جملہ" نراک....." محلاً مرفوع خبر ہے، (ان) کی، جملہ قال..... مستانفہ برائے بیان، جملہ (اعوذ) معاذ..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ ناخذ ..... صلہ ہے موصول حرفی (أن) کا اور (أن ناخذ) بتاویل مصدر حرف جر مقدر کی وجہ سے محلاً مجرور ہے اور متعلق ہے (معاذ) کے تقدیر عبارت (من ان ناخذ) ہوگی، جملہ "وجدنا....." صلہ ہے اسم موصول (من) کا، جملہ انا ..... لظالمون" مع جواب شرط مقدر کی تفسیر ہے۔ تقدیر عبارت ((ان اخذنا مکانه ظلمنا)) ہوگی۔

معارف وحقائق

"قالوا یا ایها العزیز" الآیہ کا مفہوم:- یعنی برادران یوسف

علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ اب تو برے پھنسے اور ضابطہ سے بنیامین کے چھوٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، تو بہت گھبرائے۔ اور بنیامین کی واپسی کے سلسلہ میں والد نامدار سے جو عہد و پیمان کر آئے تھے وہ یاد آ گیا تو اب اس فکر میں پڑے کہ کس صورت سے بنیامین کو حاصل کریں، ((جزاء ہ من وجد فی رحلہ فھو جزاء ہ)) کہہ کر قول تو ہم پہلے ہی ہار چکے ہیں، اب صرف ایک ہی پہلو باقی رہ گیا ہے کہ خوشامد اور عرض و معروض کے ذریعہ بنیامین کو عزیز مصر سے حاصل کرنے کی کوشش کریں، چنانچہ انھوں نے خوشامد کرتے ہوئے عزیز مصر سے کہنا شروع کیا کہ اے عزیز ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اور اس کو اس کے بھائی کے گم ہو جانے کا بیحد غم ہے۔ جس کی بنا پر وہ اس کا عاشق و متوالا ہے۔ لہذا آپ ہمارے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کیجئے کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو بطور سزا روک لیجئے۔ آپ نے ہمارے ساتھ شروع ہی سے بڑی مہربانی اور کرم کا معاملہ کیا ہے۔ اور پھر آپ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کا شعار ہی حسن سلوک، احسان اور دوسروں کے ساتھ رحم و کرم ہوا کرتا ہے۔

مکانہ : یا تو ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا عامل (خذ) ہے یا یہ کہ (خذ) (اجعل) کے معنی کو متضمن ہے۔ اس صورت میں (مکانہ) مفعول ثانی کے محل میں ہوگا۔

"ان" (مکانہ) نصب علی الظرف والعامل فیہ (خذ) او انہ ضمن (خذ) معنی (اجعل) فیکون (مکانہ) فی محل المفعول الثانی.
(الدر المصون ۶/۵۳۶)

قال معاذاللہ الآیۃ کا مفہوم:- حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی التجاء کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں، بھلا یہ کیسے ہو

سکتا ہے کہ مجرم کے علاوہ میں کسی دوسرے کو اس کے بدلہ میں اپنے پاس روک لوں، یہ تو بڑے ہی ظلم کی بات ہوگی، میں ایسا ظلم اور ناانصافی ہرگز نہیں کرسکتا۔

الا من وجدنا: حضرت یوسف علیہ السلام نے ((الا من سرق)) نہیں فرمایا بلکہ (الا من وجدنا متاعنا) فرمایا اس لئے کہ حقیقت میں بنیامین نے چوری نہیں کی تھی، بلکہ شاہی پیالہ اس کے سامان سے برآمد ہوا تھا۔

" ولم یقل الامن سرق تحرزا من الکذب". (مظہری ۱۸۶/۵)

نیز حضرت یوسف علیہ السلام کے قول "قال معاذ اللہ ان ناخذ الا من وجدنا متاعنا عندہ انا اذا الظلمون" کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ مقاصد و مصالح کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ بنیامین کے بدلہ میں کسی اور کو اپنے پاس نہ روکوں بلکہ اسی کو روکوں، لہذا اگر میں اس کے خلاف کرتا ہوں تو وحی الٰہی کی خلاف ورزی ہوگی۔ اور اس کا ظلم ہونا بالکل واضح ہے۔

"ولجواب یوسف معنی باطن ھو ان اللہ تعالیٰ انما امرنی بالوحی ان آخذ بنیامین لمصالح علمھا سبحانہ و فی ذلک فلو اخذت غیرہ کنت ظالما لنفسی و عاملا بخلاف الوحی". (روح ج ۳۴/۱۳/۷)

فائدہ:- شریعت اسلامی میں بھی سزائے بدنی میں تبادلہ جائز نہیں ہے، زید اگر اپنی خوشی سے اپنے کو عمرو کے عوض میں رجم یا قتل یا قطع عضو کیلئے پیش کرے تو قاضی یا مدعی کو اس کے قبول کر لینے کا اختیار نہیں۔ (ماجدی ۶۳۶/۲)

(نویں رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد للہ تعالیٰ وعونہ)

فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا قَالَ كَبِيْرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوْا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقاً مِّنَ اللهِ وَمِنْ قَبْلِ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْ أَبِيْ أَوْ يَحْكُمَ اللهُ لِيْ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ.

پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو، بولا ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے تم سے عہد اللہ کا، اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا اس ملک سے جب تک کہ حکم دے مجھ کو باپ میرا یا قضیہ چکا دے اللہ میری طرف اور وہ ہے سب سے بہتر چکانے والا۔

ترکیب ولغات:- جملہ ''استیئسوا..... محلا مجرور مضاف الیہ، جملہ ''خلصوا ..... ''جواب شرط غیر جازم، جملہ قال کبیرھم..... ''مستانفہ، جملہ ''الم تعلموا ..... ''محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ'' قد اخذ ..... ''محلا مرفوع خبر ہے، (ان) کی، اور مصدر مؤول ''ان اباکم قد اخذ ..... ''محلا منصوب فعل ((لا تعلموا)) دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ جملہ ''فرطتم..... ''معطوف ہے جملہ ''الم تعلموا ''پر، جملہ ''لن ابرح ..... ''محلا منصوب معطوف ہے جملہ ''فرطتم ''پر، جملہ ''یاذن ''صلہ ہے موصول حرفی (ان) کا، جملہ ((ھو خیر)) مستانفہ۔

((استیئسوا)) وہ ناامید ہوگئے، مشتق ہے استیئاس سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ((خلصوا)) وہ اکیلے بیٹھے، مشتق ہے، خلوص سے جس کے معنی خالص ہونے کے ہیں، یہاں خالص ہونے سے مراد تنہا بیٹھنا اور اکیلے میں ہونا ہے

(نجیا) صفت مشبہ چپکے چپکے سرگوشیاں کرنیوالے، مشورہ کرنے والے، ((موثقا)) مصدر منصوب، وثوق بھی مصدر ہے، باب (حسب) سے پختہ پیمان، مضبوط عہد، ((فرطتم)) جمع مذکر غائب معروف۔

تفریط مصدر باب تفعیل، تم نے قصور کیا، تم نے کوتاہی کی، ((ابرح)) میں پھروں گا، پھرتا ہوں (سمع) مشتق ہے، برح سے جس کے معنی کسی جگہ سے ہٹنے اور پلٹنے کے ہیں، مضارع کا صیغہ واحد متکلم۔

معارف وحقائق

((فلما استیئسوا منه خلصوا نجیا)) استئسوا باب استفعال سے، استفعل یہاں فعل کے معنی میں ہے، اہل عرب کے نزدیک یئس اور استیئس کا ایک معنی میں استعمال کرنا عام ہے، جیسا کہ عجب اور استعجب اور سخر اور استسخر کو وہ ایک معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں، بقول زمخشری سین اور تاء کی زیادتی مبالغہ کے معنی کو پیدا کرنے کیلئے ہے، بزی کی قرأت میں یہ لفظ استایسوا ہے یعنی تاء کے بعد الف پھر یاء ہے، اور اسی سورہ یوسف کی آیت ۸۷، اور ص ۱۱۴ پر ((لا تایسوا انه لاییاس)) بعد التاء الف بعده یاء کے ساتھ یہ لفظ آیا ہوا ہے۔

(الدر المصون ۶/۵۳۷، مظہری ۵/۱۸۶)

ابوعبیدہ نے استیئسوا کا ترجمہ استیقنوا کیا ہے، یعنی برادران یوسف علیہ السلام کو جب اس بات کا یقین ہوگیا کہ ان کا بھائی ان کو واپس نہ مل سکے گا۔

(وقال ابو عبیدة: استیئسوا استیقنوا ان الاخ لا یرد الیهم).

(مظہری ج ۵ ص ۱۸۶)

((منه)) ھا ضمیر کا مرجع حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اور

بنیامین کو بھی پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ برادران یوسف کو حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے "قال معاذ الله ان ناخذ الامن وجدنا متاعنا عنده انا اذا لظلمون کے الفاظ سے جواب مل جانے پر جب مکمل مایوسی ہوگئی، اور دوسری صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ جب برادران یوسف کو بنیامین کی طرف سے اس کے حاصل ہونے کے سلسلہ میں مایوسی ہوگئی۔

((خلصوا)) یعنی لوگوں کے مجمع سے ہٹ کر ایک طرف ہوگئے۔

"ای تفردوا عن سائر الناس". (کبیر ۹/۱۸/۱۴۸، مظہری ۵/۱۸۶، روح ۷/۱۳/۳۴)

برادران یوسف علیہ السلام کے مشورہ کی وجہ:- "نجیا" خلصوا کے فاعل سے حال واقع ہورہا ہے، ای: اعتزلوا فی هذه الحال (الدر المصون) یعنی والد بزرگوار کو جواب دینے کیلئے مشورہ کرنے کی غرض سے وہ ایک طرف ہوگئے، نجیا چونکہ ضمیر جمع سے حال ہے اس لئے اسے بھی جمع ہونا چاہئے تھا، مگر اسے جمع نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ التناجی کی طرح وہ اصل میں مصدر ہے، بطور مبالغہ متناجین پر اس کا اطلاق کردیا گیا ہے، یا اس بنا پر کہ وہ مصدر کے وزن پر ہے، کیونکہ نجیا فعیلا کے وزن پر ہے، اور فعیلا مصدر کے اوزان میں سے ہے، اس کی جمع انجیہ آتی ہے، جیسا کہ ندی کی جمع اندیہ ہے۔

وانما وحده وكان الظاهر جمعه لانه حال من ضمير الجمع لانه مصدر بحسب الاصل كالتناجي . اطلق على المتناجين مبالغة او لكونه على زنة المصدر لان فعيلا من ابنية المصادر . وجمعه انجية، قال لبيد:

و شهدت انجية الخلافة عاليا

کعبی وارداف الملوک شهود
و فی الدر مکان الخلافة ((الافاقه))
وانشد الجوهری :
انی اذا ما القوم کانوا انجیة
واضطربوا مثل اضطراب الارشیة

"فلما استیئسوا منه" کا حاصل:- " فلما استیئسوا منه خلصوا نجیا" آیت کریمہ کے اس ٹکڑے کا حاصل یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو جب بنیامین کے حاصل ہونے کی طرف سے مکمل طور پر مایوسی ہوگئی اور ان کو یقین ہوگیا کہ اس کی واپسی ممکن نہیں ہوسکتی، تو اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ بنیامین کو لئے بغیر باپ کے پاس کس منہ سے جائیں اور پھر ان کو کیا جواب دیں گے، ان کو یہ فکر اسلئے ہوئی کہ بڑی منت وسماجت اور بحفاظت واپس لانے کے مضبوط عہد و پیمان کے ساتھ انہوں نے باپ سے اس کو حاصل کیا تھا، اور یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں اس سے پہلے وہ غلطی کر چکے تھے، لہذا بنیامین کے بارے میں باپ کو مطمئن کرنے کی صورت کیا ہوگی، اور اپنے اوپر سے الزام دفع کیسے کیا جا سکے گا، اس کے لئے لوگوں کے مجمع سے ہٹ کر اور ایک طرف ہو کر مشورہ کرنا شروع کیا۔

بڑے بھائی کی رائے:- ((قال کبیرهم)) ان میں سے بڑے نے کہا، بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عمر میں بڑا ہونا مراد نہیں بلکہ علم وفضل میں بڑا ہونا مراد ہے، اور علم وفضل کے اعتبار سے سب سے بڑا یہودا تھا، جس نے دوسرے بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے قتل سے روکا تھا، قتادہ، سدی، اور ضحاک کے نزدیک عمر میں بڑا مراد ہے، اور یہ روبیل تھا، اور مجاہد کہتے ہیں کہ وہ شمعون تھا جسے

دوسرے بھائیوں پر ریاست وسرداری حاصل تھی۔

ای فی الفضل والعلم لا فی السن وهو یهودا کذا قال ابن عباس (مظہری) **وهو الذی نهاهم عن قتل یوسف** (کبیر) **کبیرهم فی السن وهو روبیل قاله قتادة والسدی والضحاک** (روح،مظہری) **وقال مجاهد وهو شمعون وکانت له ریاسة علی الاخوة** (مظہری) اور بقول محمد بن اسحاق وہ لاوی تھا۔

" و عن محمد بن اسحاق انه لاوی ". (روح)

" الم تعلمو ان اباکم قد أخذ علیکم موثقا من الله و من قبل ما فرطتم فی یوسف " طرز کلام بتا رہا ہے کہ بوقت تناجی ومشورہ ہر ایک نے کنعان واپس چلنے کی رائے دی، مگر اس بڑے نے ان کی اس رائے کو قبول نہیں کیا، **کانهم اجمعوا عندالتناجی علی الانقلاب جملة و لم یرض به فقال منکرا علیهم ((الم تعلموا))** کیا تم کو معلوم نہیں اور کیا تم یہ بھول گئے ہو کہ والد محترم نے بنیامین کو بخیر وعافیت واپس لانے کے سلسلے میں ہم سے کس قدر پختہ عہد وپیمان لیا ہے۔ اور یوسف کے معاملہ میں جو زیادتی اس سے پہلے کر چکے ہو ذرا اس کو بھی یاد کرو ابھی تو اسی شرمندگی سے سر جھکا ہوا ہے۔ پھر یہ نئی شرمندگی لیکر میں والد محترم کے پاس آخر کس منھ سے جاؤں۔ اور پھر ابھی ایسی کوئی مجبوری پیش نہیں آئی ہے کہ کسی بھی درجہ میں کوئی تدبیر نہ کی جاسکتی ہو۔ اس لئے تم جاؤ مگر میں ابھی یہاں سے ٹلنے کا نام بھی نہ لوں گا۔

"**ما فرطتم**" میں (ما) زائدہ ہے لہذا جار مجرور بعد والے فعل کے متعلق ہوگا اور تقدیر عبارت "**ومن قبل هذا ما فرطتم**" ہوگی، یعنی یوسف علیہ السلام کے

معاملہ میں تم اس سے پہلے کوتاہی کر چکے ہو۔اور کلام عرب میں (ما) کا زائدہ ہونا عام اور شائع ہے۔

" ان "ما" مزيدة ، تعلق الظرف بالفعل بعدها والتقدير : ومن قبل هذا ما فرطتم ، اى : قصرتم فى حق يوسف و شأنه و زيادة "ما" كثيرة". (الدرالمصون۶/۵۳۹)

یا یہ کہ (ما) مصدریہ ہے۔اور مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے۔اور ''من قبل ''اس کی خبر ہے۔اور معنیٰ یہ ہیں کہ اس سے پہلے تم یوسف کے معاملہ میں زیادتی کر چکے ہو۔

" الثانىٰ ان تكون "ما" مصدرية فى محل رفع بالابتداء والخبر الظرف المتقدم والمعنىٰ : وقع من قبل تفريطكم فى يوسف". (الدرالمصون۶/۵۳۹)

یا یہ کہ ''ما'' مصدریہ ہی ہے،اور مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے۔مگر خبر ''فی یوسف'' ہے۔

" الثالث " انها مصدرية ايضاً فى محل رفع بالابتداء والخبر هو قوله " فى يوسف" اى : و تفريطكم كائن اور مستقر فى يوسف . (الدرالمصون۶/۵۳۹)

یا یہ کہ ''ما'' مصدریہ ہے اور'' ان اباکم قد اخذ'' پر معطوف ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہے۔تقدیر عبارت ''الم تعلموا اخذ ابیکم المیثاق و تفریطکم فی یوسف'' ہوگی۔

'' الرابع" انها مصدرية ايضاً ، و لكن محلها النصب على انها

منسوق علی " ان اباکم قد اخذ" ای: الم تعلموا اخذ ابیکم المیثاق و تفریطکم فی یوسف". (الدرالمصون ۵۴۱/۶)

یا یہ کہ "مـــا" مصدریہ ہے، اور اسم "ان" پر معطوف ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہے، اس صورت میں تقدیری عبارت "الـم تـعـلـمـوا ان اباکـم وان تفریطکم من قبل فی یوسف" ہوگی، اور اس "ان" مقدرہ کی خبر "من قبل" بھی ہوسکتی ہے، اور "فی یوسف" بھی۔

الخامس : ان تکون مصدریة ایضاً ومحلها نصب عطفا علی اسم " أن " ای : الم تعلموا ان اباکم وأن تفریطکم من قبل فی یوسف و حینئذ یکون فی خبر " أن " هذه المقدر وجهان : احدهما هو " من قبل " والثانی هو " فی یوسف". (الدرالمصون ۵۴۲/۶)

چوتھی اور پانچویں صورت میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فصل کی خرابی کا اعتراض کوئی حقیقت اس لئے نہیں رکھتا کہ جملہ ظرفیہ کے ذریعہ فصل میں کوئی حرج نہیں ہے، " ولا بأس بالفصل بین العاطف والمعطوف بالظرف". (مظہری)

یا یہ کہ "مـــا" موصولہ اسمیہ ہے۔ اور محلاً منصوب یا مرفوع ہے۔ جیسا کہ مصدریہ کی بحث میں تفصیل گذر چکی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ "اس سے پہلے جو زیادتی تم کر چکے ہو، یعنی یوسف علیہ السلام کے حق میں جو زیادتی کر چکے ہو۔

ا"السادس ان تکون موصولة اسمیة . ومحلها الرفع او النصب علی ما تقدم فی المصدریة ، قال الزمخشری " بمعنی : ومن قبل هذا ما فرطتموه، ای: ما قدمتموه فی حق یوسف من الجنایة".

(الدرالمصون ج۶ ۴۲/، ۴۱، ۵۳۹/۴۰)

"فلن ابرح الارض"، "برح" یہاں تامہ "افارق" کے معنیٰ کو متضمن ہے، اور "الارض" مفعول بہ ہے، یعنی میں ملک مصر سے ہرگز ٹلنے والا نہیں ہوں۔

"برح" تامہ ہی ہوگا نہ کہ ناقصہ اس لئے کہ الارض کو یہاں متکلم کی خبر بنانا درست نہیں ہے۔

"ولا یجوز ان تکون ناقصة لان الارض لا یصح ان تکون خبراً عن المتکلم هنا". (روح ۱۳/۷/۳۶)

"حتی یاذن لی ابی او یحکم الله لی وهو خیر الحاکمین"، یعنی میں ملک مصر سے کنعان ہرگز واپس نہیں جا سکتا، الّا یہ کہ جو مخصوص حالات پیش آ گئے ہیں، ان کو سننے کے بعد والد محترم خود کنعان واپسی کی اجازت دیدیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی باپ کے ذریعہ بنیامین کو چھوڑ کر واپسی کا فیصلہ فرمادے، یا یہ کہ بنیامین کی رہائی کی کوئی سبیل فرمادے، یا یہ کہ مجھے موت دیدے۔

"وهو خیر الحاکمین" اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ حق اور انصاف کا ہی ہوا کرتا ہے۔

برادر کبیر نے یہاں دو غایتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک خاص اور دوسری عام، یعنی اللہ کا حکم اور فیصلہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل حکم اور فیصلہ تو اللہ ہی کا ہے۔

"انه غیا ذالک بغایتین خاصة و هی اذن ابیه و عامة و هی حکم الله تعالیٰ له وکانه بعد ان غیابا لاولیٰ رجع و فوض الامر الی من له الحکم حقیقة جل شانه". (روح ۱۳/۷/۳۷)

"او یحکم الله" یہ منصوب ہے، "یأذن" پر معطوف ہونے یا "فلن ابرح" میں "أن" کے مقدر ہونے کی وجہ سے۔

"فی نصبه وجهان، احدهما: وهو ان الظاهر عطفه علی "یاذن" والثانی: انه منصوب باضمار "ان" فی جواب النفی وهو قوله "فلن ابرح" ای: لن ابرح الارض الا ان یحکم". (الدرالمصون ۶/۵۴۳)

ایمان باللہ کی ایک چنگاری بھی حق کی رہنمائی کے لئے کافی ہے:-

سویداء قلب میں اگر ایمان باللہ کی چنگاری موجود ہے تو انسان خواہ کیسا ہی شقی القلب اور معصیتوں میں ڈوبا ہوا کیوں نہ ہو بہر حال وہ مسلمان ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک صاحب ایمان مسلمان خدا کو بالکلیہ فراموش کر دے، برادران یوسف علیہ السلام بھی صاحب ایمان مسلمان اور نہ صرف یہ کہ مسلمان بلکہ نبی زادے بھی تھے، تو وہ خدا کی ذات سے صرف نظر کیسے کر سکتے تھے، چنانچہ معصیتوں میں غرق ہونے کے باوجود ان کی زبان سے وہی کلمہ نکلا جو ایک مسلم کے شایان شان ہے۔

إِرْجِعُوْا إِلٰى أَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يَاأَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِيْنَ ○ وَ سْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْ أَقْبَلْنَا فِيْهَا ○ وَإِنَّا لَصَادِقُوْنَ○

پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے تو چوری کی، اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی، اور ہم کو غیب کی بات کا دھیان نہ تھا، اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے، اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں، اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں۔

ترکیب:- جملہ ارجعوا..... مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ قولوا..... معطوف ہے جملہ ارجعوا پر، جملہ یاابانا .....جملہ معترضہ ہے۔ جملہ ''ان ابنک سرق ..... ،، محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ سرق..... محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ ماشھدنا..... محلاً منصوب معطوف ہے جملہ'' ان ابنک سرق ''پر، جملہ علمنا.....صلہ ہے اسم موصول (ما) کا، جملہ'' ماکنا حافظین ..... محلاً منصوب معطوف ہے جملہ'' ان ابنک سرق ''پر، جملہ، کنا فیھا.....صلہ ہے اسم موصول (التی) کا، جملہ'' اقبلنا فیھا..... ''صلہ ہے اسم موصول (التی) ثانی کا، جملہ'' انا لصٰدقون..... ''محلاً منصوب معطوف ہے جملہ'' ان ابنک سرق ''پر

معارف و حقائق

''ارجعوا الی ابیکم فقولوا یا ابانا ان ابنک سرق وما شھدنا الا بما علمنا''.

بعض مفسرین نے اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے، مگر یہ انتہائی بعید ہے، ظاہر یہی ہے کہ یہ برادر کبیر کے قول کا تتمہ ہے۔

" الظاهر ان هذا القول من تتمة كلام كبيرهم وقيل : هو من كلام يوسف عليه السلام و فيه بعد ". (روح ۱۳/۷/۳۷)

یعنی مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ والد محترم کو اس واقعہ کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ برادر کبیر جس نے بحالت موجودہ کنعان نہ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس نے دوسرے بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا: تم سب کنعان والد کے پاس جاؤ اور جا کر عرض کرو کہ آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کی جس کی پاداش میں عزیز مصر نے اسے پکڑ کر اپنا غلام بنالیا ہے۔ اور ظاہر الامر میں جو بات ہمارے سامنے آئی ہے۔ اسے ہم نے بے کم وکاست آپ سے بیان کردیا۔

جمہور قراء کی قرأت میں تو ''سرق'' مبنی للفاعل اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ابوزرین اور کسائی سے ایک روایت میں '' سرق '' مبنی للمفعول تشدید کے ساتھ منقول ہے۔ اس دوسری قرأت کے مطابق ''ما شهدنا الا بما علمنا '' کا مفہوم یہ ہوگا کہ چوری کے بارے میں ہم نے جو کچھ جانا اور جو بات ہمارے علم میں آئی اسے ہم نے آپ سے بیان کردیا۔ رہی یہ بات کہ بنیامین نے واقعتاً چوری کی ہے۔ یا اس کی لاعلمی میں پیالہ اس کے سامان میں رکھ کر اسے چوری کی جانب منسوب کردیا گیا ہے۔ اس امر مخفی سے ہم لاعلم ہیں۔

وقرأ ابن عباس وابورزين و الكسائي في رواية "سرّق" مبنيا للمفعول مشددا (الدرالمصون) "اى نسب الى السرقة فمعنى " ما شهدنا" الخ وما شهدنا الا بقدر ما علمنا من التسريق وما كنا للامر الخفى بحافظين

اسرق بالصحة ام دس الصواع فی رحله ولم یشعر. (روح ۱۳/۷/۳۷)

اس دوسری قرأت میں چونکہ بنیامین کیلئے چوری سے برأت کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لئے علماء کی ایک جماعت نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔

واستحسن هذه القراءة لما فيها من التنزيه كذا قالوا. (روح)

وما شهدنا الآية کا مفہوم:- "وما شهدنا الا بما علمنا وما كنا للغيب حافظين"، امام تفسیر مجاہد، حسن اور قتادہ نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ بنیامین کے چوری کرنے کی اطلاع کے بعد برادران یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ کا چہیتا بیٹا چوری کے جرم کا ارتکاب کر کے برسر عام ہم کو رسوا کرے گا اور ہم کو غیب کا علم تو تھا نہیں (وہ تو صرف اللہ ہی کیلئے خاص ہے) اگر ہم کو یہ علم ہوتا کہ اس کے گن ایسے ہیں تو ہم اسے ہرگز ملک مصر بادشاہ کے پاس نہ لے جاتے، اور واپس لانے کے بارے میں جو قول وقرار ہم نے آپ کو دیا وہ ہرگز نہ دیتے۔

"قال مجاهد والحسن و قتاده : ما كنا نعلم ان ابنك يسرق ولو علمنا ذلك ما ذهبنا به الى الملك ، وما اعطيناك موثقا من الله فى رده اليك". (کبیر ۱۸/۹/۱۵۲، مظہری ۱۸۷/۵)

"وما كنا للغيب حافظين" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہم رات دن اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے نگراں تو تھے نہیں ممکن ہے کہ پیالہ رات کے وقت اس کے سامان میں چھپا دیا گیا ہو۔

"عن ابن عباس يعنى ما كنا ليله و نهاره مجيئه وذهابه حافظين فلعلها دست بالليل فى رحله . (مظہری ۱۸۷/۵)

"فقولوا یا ابانا ان ابنک سرق" کہنا ان کے بغض حسد اور ان کی شقاوت قلبی کا غماز ہے، کہ ایسے نازک وقت میں بھی بوڑھے باپ پر طعن و تشنیع اور ملامت سے باز نہ آئے اور یہ نہ کہا کہ ہمارے بھائی سے غلطی ہوگئی، بلکہ باپ کی طرف منسوب کر کے کہا کہ تیرے بیٹے ہاں چہیتے اور پیارے بیٹے نے چوری کر کے ہم سب کو رسوا کر دیا۔

" وسئل القریة التی کنا فیها والعیر التی اقبلنا فیها وانا لصادقون " جمہور مفسرین کے نزدیک "القریۃ" سے مراد "مصر" اور حضرت عبداللہ عباس ؓ سے منقول ہے کہ وہ جگہ مراد ہے جہاں پہونچنے کے بعد منادی نے " ایتها العیر انکم لسارقون " کی آواز لگائی تھی۔

"یعنون مصر وقال ابن عباس هی قریة من قریٰ مصر لحقهم المنادی فیها". (مظہری)

وسئل القریة : میں مشہور اور ظاہر یہی ہے کہ مضاف محذوف ہے، ایسے ہی " والعیر التی " ، میں بھی تقدیر عبارت واسأل اهل القریة واهل العیر ہوگی، یعنی آپ ملک مصر کے لوگوں اور اس قافلہ والوں سے تصدیق کر لیجئے جس میں ہم آئے ہیں۔

"المشهور انه علی حذف مضاف تقدیره . وسئل القریة واهل العیر وهو مجاز شائع". (الدر المصون ج ۶ ص ۴۴)

اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف اور مجاز وغیرہ نہیں ہے بلکہ حقیقت مراد ہے اور معنی یہ ہے کہ آپ آبادی، اونٹوں اور دیواروں وغیرہ سے پوچھئے وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم اپنے قول میں صادق ہیں، اس لئے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں

اور بطور معجزہ اللہ کے گویائی عطا کر دینے سے ان اشیاء کا آپ سے کلام کرنا مستبعد نہیں۔

"قال ابوبکر الانباری المعنی: اسأل القریة والعیر والجدار والحیطان فانها تجیبک و تذکر لک صحة ما ذکرنا لک لانک من اکابر انبیاء الله فلایبعد ان یطلق الله هذه الجمادات معجزة لک حتی تخبر بصحة ما ذکرناه". (کبیر ۹/۱۸/۱۵۲)

اور بعض علماء کا قول ہے کہ "القریة والعیر" میں مضاف مضمر نہیں بلکہ یہ دونوں اپنی حقیقت پر ہیں اور کلام اس بات کے دعویٰ پر مبنی ہے کہ معاملہ بالکل واضح اور ظاہر ہے، حتی کہ جمادات و بہائم پر بھی وہ مخفی نہیں رہا، بلکہ ان کو بھی اس کا علم ہو گیا ہے، قدیم و جدید ہر دور کے اہل علم کے کلام میں اس کی نظیر موجود ہے۔

"وقال بعض الاجلة : الاولیٰ ابقاء " القریة والعیر" علی ظاهرهما و عدم اضمار مضاف الیها ویکون الکلام مبنیا علی دعویٰ ظهور الامر بحیث ان الجمادات والبهائم قد علمت به وقد شاع مثل ذلک فی الکلام قدیما و حدیثا ومنه قول ابن الدمینة :

سل القاعة الوعسا من الاجرع الذی
به البان هل حییت اطلال دارک
سلوا مضجعی عنی و عنها فاننا
رضینا بما یخبرن منا المضاجع
واسأل نجوم اللیل هل زار الکریٰ
جفنی وکیف یزور من لم یعرف

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کا کلام بھی مجاز کے ارتکاب سے خالی نہیں ہوا کرتا

بلکہ کسی نہ کسی درجہ میں مجاز ان میں بھی موجود ہوا کرتا ہے۔

" ولا یخفیٰ ان مثل هذا لا یخلو من ارتکاب مجاز".

(روح ۷/۱۳/۳۸)

"والعیر التی اقبلنا فیها" زمانہ قدیم میں سفر کرنے کا طریقہ یہی تھا کہ بہت سے لوگ مل کر ایک ساتھ سفر کیا کرتے تھے، جنگل اور پہاڑ کے اسفار میں آج بھی یہ طریقہ رائج ہے، یہاں جس قافلہ کا تذکرہ ہے یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پڑوسی کنعانیوں کا ایک قافلہ تھا، اور بقول بعض صنعاء کا ایک قافلہ تھا۔ (روح)

"وانا لصٰدقون" آپ ہماری بات تسلیم کریں یا نہ کریں، ہم "ان ابنک سرق" کی خبر دینے میں بہر حال سچے ہیں، یہاں جملہ اسمیہ اور "ان" اور "لام" کا ذکر کرنا اثبات صدق کے واسطے نہیں بلکہ اپنے صدق کو مؤکد کرنے کیلئے ہے، اور یہ انسان کی عادت ہے کہ جب وہ کسی چیز کی صحت پر دلیل قطعی کو ذکر کرتا ہے، تو اس کے بعد کہتا ہے کہ میں اس واقعہ کے بیان کرنے میں سچا ہوں، اور اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ تم ذکر کردہ دلائل میں غور وفکر کرلو تا کہ تمہارا شبہہ بالکلیہ ختم ہو جائے۔

"لیس المراد اثبات صدقهم بما ذکر بل تاکید صدقهم بما یفید ذلک من الا سمیة وان واللام" (روح) والانسان اذا قدم ذکر الدلیل القاطع علی صحة الشئی فقد یقول بعده وانا صادق فی ذلک یعنی فتأمل فیما ذکرته من الدلائل والبینات تزول عنک الشبهة". (کبیر ۹/۱۸/۱۵۲)

ایک مرتبہ اعتبار کھو دینے کے بعد آدمی قابل اعتبار بڑی مشکل سے بنتا ہے:-

"واسال القریة التی" الخ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں اپنے مکر وفریب اور جھوٹ کی وجہ سے برادران یوسف والد کی نظر میں بے اعتبار ہو چکے

تھے، جس کی بنا پر ان کو پورا یقین تھا کہ والدان کی بات کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے، اس کی وجہ سے مزید تاکید کیلئے انہوں نے کہا کہ اگر آپ کو ہماری بات پر یقین نہ ہو تو کسی معتبر آدمی کو ملک مصر بھیج کر معلوم کر لیجئے۔ اور اس قافلہ والوں سے بھی پوچھ لیجئے جس میں ہم آئے ہیں، گویا اپنی صداقت کو ثابت کرنے کے ہزار جتن کئے مگر پھر بھی کامیاب نہ ہو سکے، بلکہ والد کی نظر میں غیر معتبر ہی رہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اول وہلہ میں اعتبار کھو دینے کے بعد آدمی قابل اعتبار بڑی مشکل سے بنتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنی اطلاع نہ دینے کی وجہ:

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت یوسف علیہ السلام نے والد کے ساتھ اس قدر بے رحمی کا معاملہ کیوں کیا کہ قدرت کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنی کوئی اطلاع نہیں دی بلکہ مزید برآں دوسرے بھائی کو بھی اپنے پاس روک لیا جب کہ ان کو یہ معلوم تھا کہ والد کے لئے میری جدائی انتہائی تکلیف دہ ہے، اور ابھی اس کا زخم مندمل نہیں ہوا ہے۔

واقعہ کی تحقیق سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے گریز کی وجہ:۔

اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیٹوں کے اصرار کے باوجود آخر حضرت یعقوب علیہ السلام نے واقعہ کی کوئی تحقیق کیوں نہیں کی جبکہ ایسا کرنا ان کیلئے آسان تھا کہ مصر کسی قابل اعتبار آدمی کو بھیج کر پوری تفصیل معلوم کر لیتے یا کم از کم کنعانی قافلہ کے لوگوں سے پوچھ لیتے مگر انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

پہلا سوال تفسیر مظہری میں مذکور ہے اور پھر اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ بھی کیا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام منجانب اللہ جس ابتلاء وامتحان میں مبتلا کئے گئے ہیں اس کی تکمیل ہو جائے۔

"انه عمل ذلک بامر الله تعالیٰ امره لیزید فی بلاء یعقوب".

(مظہری ۵/۱۸۷)

اور پہلے سوال کے جواب کی روشنی میں غالباً دوسرے سوال کا جواب بھی یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یا تو ان کو معاملہ کی تحقیق سے بذریعہ وحی منع کر دیا تھا یا یہ کہ تکمیل ابتلاء کیلئے ان کے دل میں تحقیق کی بات آنے ہی نہیں دی گئی۔ (واللہ اعلم)

" قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً. فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعاً إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ".

بولا کوئی نہیں، بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، شاید اللہ لے آئے میرے پاس ان سب کو وہی ہے خبردار حکمتوں والا۔

ترکیب:- جملہ قال مستانفہ برائے بیان، جملہ سولت لکم انفسکم..... مستانفہ قول کا مقولہ یہاں محذوف ہے، جملہ (صبری) صبر..... معطوف ہے، جملہ "سولت" پر، جملہ عسی اللہ..... مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ "یاتینی بھم..... " صلہ ہے موصول حرفی (ان) کا، جملہ "انہ ھو العلیم ....." برائے تعلیل جملہ "ھو العلیم..... محلاً مرفوع خبر ہے، (ان) کی۔

معارف و حقائق

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی بات پر اعتبار کیوں نہیں کیا؟

"قال بل سولت لکم انفسکم امرا"، "بل" اضراب کے لئے ہے اس لئے اس سے پہلے ایک ایسے کلام کا ہونا ضروری ہے جس سے اضراب کیا جائے، لہذا کلمہ کی تقدیر "لیس الامر کما ذکرتم حقیقۃ بل سولت" ہوگی، مطلب یہ ہے کہ بنیامین اور خود سے رک جانیوالے بھائی کے علاوہ برادران یوسف علیہ السلام جب کنعان والد کے پاس پہونچے اور بنیامین کے چوری کرنے کے واقعہ کو اور اس کی بنا پر غلام بنا کر روک لئے جانے کو والد سے بیان کیا تو والد چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان کی صداقت کا تجربہ کر چکے تھے، اس لئے ان کی بات کا اعتبار نہیں

کیا، اور ان کو جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ درحقیقت معاملہ وہ نہیں ہے جو تم بیان کررہے ہو بلکہ تم نے اپنی طرف سے ایک بات گھڑلی ہے، ورنہ بادشاہ مصر کو کیا معلوم کہ چوری کی سزا میں چور کو غلام بنالیا جائے گا۔

"فما ادری الملک ان السارق یوخذ بسرقته". (مظہری)

بنیامین کے واقعہ میں برادران یوسف علیہ السلام کے سچا ہونے کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام کا ان پر اعتبار نہ کرنا اور وہی جملہ ارشاد فرمانا جو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ارشاد فرمایا تھا، اس کی وجہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ان کا جھوٹ بولنا ہے، جو شخص ایک مرتبہ کسی واقعہ میں متہم اور مشتبہ ہو چکا اس کو دوسرے واقعہ میں بھی ظن وگمان کی حد تک متہم کرنا اور مشتبہ قرار دینا درست ہے، لہذا اس واقعہ میں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کا "بل سولت لکم انفسکم" کہنا بالکل بجا اور درست ہے اور "قال بل سولت لکم انفسکم امرا" کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ بنیامین نے حقیقت میں کوئی چوری نہیں کی ہے، بلکہ کسی خاص مقصد کے واسطے چوری کی نسبت اس کی جانب کرکے اسے روک لیا گیا ہے۔

" امـــــــراً" میں تنوین معاملہ کے عظیم ہونے کو بتانے کے لئے ہے۔

"والتنوین فی "امرا" للتعظیم ای امراً عظیماً". (روح ۳۹/۱۳/۷)

"قال بل سولت" کی تفسیر میں علامہ عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ تم یہاں سے حفاظت کے کیسے وعدے کرکے اصرار کے ساتھ لے گئے وہاں پہنچ کر اتنا بھی نہ کہا کہ اس کے اسباب میں سے پیالہ برآمد ہونے سے چوری کیسے ثابت ہوگئی، شاید کسی اور نے چھپادیا ہو، مدافعت تو کیا کرتے یہ کہہ کر کہ پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، اس کے جرم

کو پختہ کردیا، تمہارے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو یہ طرز عمل اختیار نہ کرتے، اب باتیں بنانے کیلئے آئے ہو بہر حال میں تو اس پر بھی صبر ہی کروں گا کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں گا۔ (فوائد عثمانی:۳۲۵)

"فصبر جمیل" اسے مبتدا بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اور خبر بھی، "ای فامری صبر جمیل اوفصبر جمیل اجمل". (مظہری، روح، بیضاوی)

میرا معاملہ تو صبر جمیل کا ہی ہے، اسی کو اختیار کرتا ہوں، اور وہی میرے لئے بہتر ہے، یعنی اس معاملہ میں کسی سے کوئی شکوہ شکایت ہرگز نہیں کروں گا۔

جزع فزع کے بغیر مصائب پر صبر کرلینا صبر جمیل ہے:- آلام و مصائب پر صبر کرلینا کسی سے شکوہ شکایت نہ کرنا کوئی معمولی اور آسان کام نہیں ہے، لیکن اگر اس بات کا استحضار ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق اور نہایت شفیق ورحیم ہے اور رنج وتکلیف جو کچھ بھی ہے سب اسی کی طرف سے ہے، اور اس میں ہماری ہی مصلحتوں کی رعایت ہے، تو پھر بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر کرلینا آسان ہے، مگر یہ استحضار عام لوگوں کو بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو براہ راست حق جل مجدہ کی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے، مصائب پر اس طرح صبر کہ نہ تو جزع وفزع ہو اور نہ تو کسی سے کوئی شکوہ شکایت، رسول اللہ ﷺ نے اسی کو صبر جمیل فرمایا ہے۔

"عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعاً"، ضمیر جمع سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین اور وہ بیٹا ہے جو بنیامین کی گرفتاری کے بعد ملک مصر میں رک گیا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین سے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت بالکل واضح ہے، اور ظاہر ہے کہ محبوب کی گرفتاری پر اس کی رہائی کی تدبیر کیلئے رک جانا اور باپ کی

اجازت کے بغیر سامنے نہ آنا بھی تو محبوب بنا دینے والا عمل ہے، تو گویا محبوبین کی پوری ایک جماعت جدا ہو چکی ہے، اس لئے ضمیر جمع لا کر "عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعاً" فرمایا: مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ سے کیا بعید ہے، کہ وہ ایک دن ان تمام گم شدہ بیٹوں کو جمع کر کے ایک ساتھ مجھ سے ملا دے، بلاشبہہ وہ دانا و بینا اور علم حکمت والا ہے۔

"انہ ھو العلیم الحکیم" بلاشبہہ وہ میرے اور ان کے حال سے باخبر ہے۔ یعنی کون کہاں اور کس حال میں ہے، اور حکمتوں والا ہے، جو اپنی حکمت بالغہ سے مخلوق کو ابتلاء و امتحان میں ڈالتا بھی ہے اور اس سے نکالتا بھی ہے۔

"الذی یبتلی ویرفع البلاء حسب الحکمۃ البالغۃ". (روح ۷/۱۳/۳۸۹)

مجھ کو بھی اس ابتلاء و امتحان میں کسی حکمت و مصلحت سے ہی ڈالا ہے۔

"ای لم یبتلنی بذالک الا لحکمۃ". (مدارک ۲/۲۳۴)

اور اس کا ضابطہ اور اصول یہ ہے کہ مصیبت جب آخری حد پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد وہ بڑی آسائش و کشادگی کی زندگی عطا فرماتا ہے۔

"فانہ قد جرت سنتہ ان الشدۃ اذا تناھت یجعل وراءھا فرجا عظیماً". (روح)

لہذا وہ اپنی حکمت سے ایسے اسباب اور تدبیریں ضرور پیدا فرما دے گا جس کا انجام راحت و آرام اور مسرت و شادمانی ہو۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ.

اور الٹا پھرا ان کے پاس سے اور بولا ہائے افسوس یوسف پر اور سفید ہو گئیں آنکھیں اس کی غم سے سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا۔

ترکیب ولغات:- جملہ تولّٰی..... معطوف ہے جملہ قال پر، جملہ قال معطوف ہے جملہ تولّٰی..... پر، جملہ ندا مقولہ ہے قول کا، جملہ ابیضت عیناہ..... مستانفہ، جملہ ھو کظیم..... معطوف ہے جملہ ابیضت عیناہ پر۔

تولی اس نے منہ موڑا، ماضی صیغہ واحد مذکر غائب، یااسفی ہائے افسوس، اہل عرب اسے حسرت وغم کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔

"اسفی" کی یاء پر الف مقصورہ داخل کر کے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ الف یاء کے عوض میں ہے، اصل میں اسفی، فاء کے کسرہ اور یاء مفتوح کے ساتھ تھا، پھر آواز کو پھیلانے کی غرض سے فاء کو جب فتحہ دیا تو یاء ماقبل مفتوح کے قاعدہ سے یاء الف سے بدل گئی۔ (اعراب القرآن: ۴۹/۱۳/۷)

ابیضت سفید ہو گئیں، مشتق ہے ابیضاض سے جس کے معنی سفید ہونے اور دکھنے کے ہیں، فعل ماضی واحد مونث غائب، یہاں آنکھوں کا سفید ہونا مراد ہے یعنی وہ بے رونق یا بے نور ہو گئیں۔ (عثانی ص: ۳۲۵) الحزن غم، بیقراری، رنج، جمع احزان، کظیم جو اپنے غم کو گھونٹ کر رکھے ظاہر نہ کرے، صفت مشبہ بروزن فعیل، کظیم

یہاں مفعول، یعنی مکظوم کے معنیٰ میں ہے جیسا کہ سورہ یونس میں مذکور ہے، "اذ نادیٰ وھو مکظوم" اور فاعل کے معنیٰ میں بھی ہوسکتا ہے، کقولہ تعالیٰ والکاظمین". (آل عمران ۱۳۴)

معارف وحقائق

نئی چوٹ سے پرانے زخم کا ہرا ہوجانا فطرت انسانی میں داخل ہے:-

"وتولیٰ عنھم و قال یاسفی علی یوسف" تکلیف دہ چیزوں سے طبیعت کا منقبض اور مکدر ہوجانا اور نئی چوٹ سے پرانی چوٹ کا تازہ ہوجانا اور تازہ زخم سے پرانے زخم کا ہرا ہوجانا انسانی طبیعت وفطرت ہے، متمم بن نویرہ کے یہ اشعار ہمارے دعویٰ کی واضح دلیل ہیں:

وقد لامنی عندالقبور علی البکاء
رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رأیته
لقبر ثوی بین اللویٰ والدکادک
فقلت له ان الأسیٰ یبعث الأسیٰ
فدعنی فهذا کله قبر مالک

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

فلم تنسنی او فی المصیبات بعده
ولکن نکاء القرح بالقرح اوجع

اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی انسان اور بشر ہوتے ہیں، لہذا وہ ان فطری تقاضوں سے بالاتر ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے، چنانچہ سید الانبیاء حضور انور ﷺ کا اپنے

فرزند حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات پر آنسوؤں سے رونا ثابت ہے۔

"روی ان النبی علیه الصلوٰة والسلام بکیٰ علی ولده ابراهیم علیہ السلام وقال انما انا بشر تدمع العین و یخشع القلب ولا نقول ما یسخط الرب والله یا ابراهیم انا بک لمحزونون". (ابن سعد ج۱ ص۱۱۸)

عن انس: انه ﷺ بکیٰ علی ولده ابراهیم وقال "ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضیٰ ربنا وانا بفراقک یا ابراهیم لمحزونون". (بخاری ۱۳۰۳/ مسلم ۲۳۱۵)

حضرت یعقوب علیہ السلام بھی بشری تقاضوں سے خالی ہوں یہ کیسے ممکن ہے، لہذا بیٹوں کی زبانی جب بنیامین کے گرفتار کرلئے جانے کی روح فرسا خبر ان کے کانوں میں پڑی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کا غم تازہ ہوگیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی چونکہ انہیں بیٹوں کے کالے کرتوت کا کرشمہ تھا، اس لئے ان کے بارے میں اپنے انقباض کو ظاہر کرنے کیلئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی جانب سے رخ پھیر لیا، اور فرمانے لگے، "آہ فراق یوسف کی غم انگیزی" اور اس معاملہ میں بیٹوں سے کوئی گفتگو نہیں کی، اور بنیامین کی گرفتاری سے یوسف علیہ السلام کا غم اس لئے بھی تازہ ہوگیا کہ دونوں ایک ماں کے بطن سے تھے اور صورت وسیرت میں ایک دوسرے کے مثنیٰ، گویا یوسف علیہ السلام کے گم ہوجانے پر ان کی طرف سے بھی بھرپور تسلی کا سامان یہی تھے، اور اب یہ سامان تسلی بھی نظر سے اوجھل ہوگیا۔

نیز حضرت یوسف علیہ السلام کا غم اور ان کی یاد اس لئے بھی تازہ ہوگئی کہ بنیامین کا زندہ ہونا تو یقین کے ساتھ معلوم تھا مگر یوسف علیہ السلام کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

ان یوسف وبنیامین کانا من ام واحدة وکانت المشابهة بینهما فی الصورة والصفة اکمل ،فکان یعقوب یتسلی برویته عن روية يوسف عليه السلام فلما وقع ما وقع زال ما يوجب السلوة فعظم الالم والوجد، وايضاً انه عليه السلام كان ليعلم هؤلاء فی الحياة وامايوسف فما كان يعلم انه حی أو ميت. (کبیر۹/۱۸/۱۵۴)

انا للہ الخ امت محمدیہ کی خصوصیت ہے:- سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ استرجاع (یعنی مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا) امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت ہے، مصیبت کے وقت اس کو پڑھنے کی کسی اور امت کو تعلیم نہیں دی گئی، یہی وجہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام پر جب مصیبت پڑی تو انہوں نے اس کلمہ کو پڑھنے کے بجائے "یا اسفیٰ علی یوسف" کہہ کر اپنے رنج وغم اور حسرت وافسوس کا اظہار فرمایا:

"عن سعيد بن جبير انه قال : لم يعط احد غير هذه الامة الاسترجاع ، الا تسمعون الیٰ قول يعقوب " ياأسفیٰ علیٰ يوسف"

(ابن کثیر۲/۷۵۴، مظہری۵/۱۸۸، کبیر۹/۱۸/۱۵۵)

لیکن امام رازیؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "انا للہ" میں اللہ کی بندگی اور اس کی خالقیت کا اقرار ہے۔ اور "وانا للہ وإنا اليه راجعون" میں قیامت اور حشر ونشر کے وقوع کی طرف اشارہ ہے، اور یہ بات محال ہے کہ کوئی امت اس سے ناواقف ہو یا کوئی مومن اس سے بے خبر ہو۔

"وهذا عندی ضعيف لان قوله " انا للہ" اشارة الیٰ انا مملوكون لله وهو الذی خلقنا واوجدنا و قوله " وانا اليه راجعون "

اشـارة الی انه لا بد من الحشر والقیامة ومن المحال ان امة من الامم لا یعرفون بذالک وان المومن باللہ غیر عارف له". (کبیر۹/۱۸/۱۵۵)

"یا اسفیٰ علیٰ یوسف"، "یا عجبا" کی طرح یہ غم وحزن کو پکارنا اور دعوت دینا ہے، گویا حضرت یعقوب علیہ السلام غم وحزن کو دعوت دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ تمہارے آنے اور حاصل ہونے کا وقت ہے۔

"نداء الاسف وهو کقوله "یا عجبا" والتقدیر کانه ینادی الأسف و یقول: هذا وقت حصولک واوان مجیئک". (کبیر)

بلاغت:- لفظ "اسف" اور "یوسف" کے مابین جناس اشتقاق کا ہونا واضح اور ظاہر ہے، جس سے کلام کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے، "وهو مما یزید الجلیل بهجة"، (روح) جیسا کہ "اثاقلتم الی الارض أرضیتم" (توبہ۳۸) "ولا ینهون عنه و ینأون" (انعام:۲۶) "و یحسبون انهم یحسنون" (سورہ کہف۱۰۴) اور "من سبأ بنبأ" میں اشتقاق جناس کا ہونا ظاہر ہے، جناس اشتقاق یا تصریف کا حاصل یہ ہے کہ دو کلمے ایک لفظ میں مشترک ہوں پھر ان دونوں کے درمیان ایک کے اندر کوئی ایسا حرف داخل کردیا جائے جو دوسرے میں نہ ہو۔

"وهو ان تشترک الکلمتان فی لفظ و یفرق بینهما بحرف لیس فی الاخریٰ". (الدر المصون ج۷ ص۵۴۵)

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُ تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضاً أَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهَالِكِيْنَ . قَالَ إِنَّمَا أَشْكُوْ بَثِّي وَحُزْنِيْ إِلَى اللّٰهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ .

کہنے لگے قسم اللہ کی تو نہ چھوڑے گا یوسف کی یاد کو جب تک گھل جائے یا ہو جائے مردہ، بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے۔

ترکیب ولغات:- جملہ قالوا..... مستانفہ اور، جملہ قسم وجواب قسم محلاً منصوب مقولہ ہیں قول کا، جملہ (لا) تفتؤ تذکر..... جواب قسم، جملہ تذکر..... محلاً منصوب خبر ہے (لا) تفتأ کی، جملہ تکون..... صلہ ہے موصول حرفی (ان) مضمر کا جملہ تکون .....ثانیہ معطوف ہے جملہ تکون اولیٰ پر، جملہ قال.....مستانفہ برائے بیان، جملہ أشکو.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ أعلم .....محلاً منصوب معطوف ہے أشکو پر، جملہ لا یعلمون..... صلہ ہے اسم موصول (ما) کا۔

تفتؤ تو ہمیشہ رہتا ہے، تو ہمیشہ رہے گا، تو برابر رہے گا، تو برابر رہتا ہے، (سمع) سے یہ افعال ناقصہ میں سے ہے، اصل میں لا تفتؤ تھا چونکہ آیت میں تاللہ تفتؤ ہے اس لئے حرف نفی حذف ہو گیا کیونکہ قسم کے ساتھ جب علامت اثبات یعنی لام ابتداء اور نون تاکید نہیں ہوتی تو وہ نفی پر محمول ہوتی ہے۔

حرضاً: مضمحل، بیکار، جو چیز نکمی اور بیکار ہو جائے اور در خور اعتناء نہ رہے

''حوض'' کہلاتی ہے۔ یہ اصل میں باب فرح کا مصدر سماعی ہے۔ بمعنی ہلاکت کے قریب ہو جانا۔

الھالکین: اسم فاعل جمع مذکر مجرور، واحد (الھالک) باب (ض، س، ف، بمعنی ہلاک ہونے والے، مرنیوالے)۔

أشکو: میں کھولتا ہوں، مشتق ہے شکو سے، فعل مضارع صیغہ واحد متکلم شکو کے معنی اضطراب اور غم کے اظہار اور بیان کرنے کے ہیں، اصل میں شُکْوَۃ (چھوٹا مشکیزہ) کے کھولنے کو ''شکو'' کہتے ہیں پھر بطور استعارہ اظہار غم والم کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

بثی: میری بیقراری، پراگندگی۔ ''بث'' مضاف ی ضمیر مضاف الیہ ''بث'' مصدر سماعی ہے فعل بث یبث باب ضرب ونصر کا۔

معارف وحقائق

قالوا تاللہ ..... الی ..... من الھالکین: قالوا کا فاعل برادران یوسف کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اور خاندان یعقوب کے دوسرے افراد اور ان کے متبعین کو بھی، امام رازی کے نزدیک برادران یوسف کے علاوہ خاندان یعقوب کے دوسرے افراد کو قالوا کا فاعل قرار دینا راجح ہے۔

ألا ظھران ھولاء لیسوا ھم الاخوۃ الذین قد تولی عنھم بل الجماعۃ الذین کانوا فی الدار من أولاد أولادہ و خدمہ. (کبیر ۹/۱۸/۱۵۷)

تاللہ: کی تحقیق آیت ۷۳ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔ تفتؤ، لا تفتأ اور لا تزال کے معنی میں ہے، حرف نفی کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ قسم کے ساتھ جب علامت اثبات یعنی لام اور نون تاکید نہ ہو تو وہ قسم نفی پر محمول ہوتی ہے، قال امرء

القیس:

فقلت یمین اللہ ابرح قاعدا ولو قطعوا رأسی لدیک و أوصالی

حرضا: بفتح الحاء والراء اور ایک قرأت میں راء کا کسرہ بھی منقول ہے، اور حسن کی قرأت میں حاء اور راء دونوں مضموم ہیں۔

حزنی: مشہور قرأت میں حاء مضموم اور زا ساکن ہے لیکن حسن اور عیسیٰ کی قرأت میں دونوں مفتوح اور قتادہ کی قرأت میں دونوں مضمون ہیں۔

(الدر المصون ج۶ ص ۵۴۸)

قالوا تاللہ سے مالا تعلمون تک کا مفہوم:- دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ دوبارہ مصر سے واپسی کے بعد بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب اطلاع دی کہ چوری میں ماخوذ ہونے کی وجہ سے بنیامین کو عزیز مصر نے روک لیا ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل پر زبردست جھٹکا لگا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی یاد بے اختیار تازہ ہوگئی اور ان کا غم وحزن دوبالا ہوگیا لیکن انہوں نے شکوہ شکایت کے بجائے "فصبر جمیل" کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالہ کردیا، بیٹوں یا خاندان کے دوسرے افراد نے جب ان کے شدید غم وحزن اور اس پر صبر جمیل کو دیکھا تو کہنے لگے "بخدا تم تو اسی طرح یوسف کی یاد میں گھلتے رہو گے یا اسی غم میں جان دیدو گے" بیٹوں یا دوسرے افراد خاندان کے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گم ہوئے ایک طویل زمانہ گذر گیا، آخر ہر غم وحزن کی ایک حد ہوتی ہے، اب تو آپ کو صبر آ ہی جانا چاہئے اور یوسف علیہ السلام کی یاد دل سے محو ہوجانی چاہئے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں یا افراد خاندان کا یہ نصیحت آمیز یا طنزیہ جملہ سنا تو ارشاد فرمایا! تم کو میرے معاملہ میں خواہ مخواہ دخل انداز ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اپنی حاجت وفریاد اور رنج

وغم کا اظہار کسی اور کے سامنے نہیں کر رہا ہوں بلکہ بارگاہ خداوندی میں عرض معروض کر رہا ہوں اور تم کو کیا معلوم کی خداوند قدوس نے مجھے کس قدر نواز رکھا ہے سنو! میں اللہ کی جناب سے وہ بات جانتا ہوں جسکی تم کو ہوا تک بھی نہیں لگی، مجھے پوری امید ہے کہ رب العزۃ میرے ساتھ تلطف ومہربانی کا معاملہ فرمائے گا اور مجھے مایوس وناامید ہرگز نہ کرے گا بلکہ بخیر خوبی وہ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملادے گا۔

غالبًا نبوی فراست، یا خواب، یا بذریعہ وحی حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام باحیات ہیں اور ان سے ملاقات ضرور ہوگی، اس لئے مذکورہ جملہ ارشاد فرمایا:

حضرت یعقوب علیہ السلام کی شکایت صبر جمیل کے منافی نہیں:-

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "فصبر جمیل" فرمانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے پھر شکوہ شکایت کیوں کی جو بظاہر صبر جمیل کے خلاف ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کسی مخلوق سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی بلکہ جو کچھ بھی عرض ومعروض کیا ہے وہ اپنے اللہ سے کیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: انما أشكو بثي وحزني الى الله سے ظاہر ہے اور صبر جمیل کے منافی شکایت الی الخلق ہے نہ کہ شکایت الی الخالق بلکہ وہ تو عین دعاء والتجاء مطلوب ہے۔

(بیان القرآن ج ۵ ص ۹۴)

يَا بَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ أَخِيْهِ وَلَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ .

اے بیٹو! جاؤ اور تلاش کرو یوسف کی اور اس کے بھائی کی اور ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے، بے شک ناامید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔

ترکیب ولغات:- جملہ نداء "یا بنی ....." مستانفہ، جملہ اذھبوا..... ندا کا جواب ہے، جملہ تحسسوا..... معطوف ہے جملہ جواب النداء پر، جملہ لا تیئسوا ..... معطوف ہے جملہ جواب نداء پر، جملہ انہ لا ییئس ..... برائے تعلیل جملہ لاییئس..... محلاً مرفوع خبر ہے ان کی۔

تحسسوا: تم تلاش کرو جمع مذکر حاضر، روح بمعنی فیض، رحمت، راحت مصدر ہے۔ اس کا فعل نصر اور سمع سے آتا ہے۔ امام راغب نے اس کے معنی تنفس یعنی سانس لینے کے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ لفظ روح سے وسعت کا تصور پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا "سعة روحاء" یعنی کشادہ پیالی، ارشاد الٰہی ہے: لا تیئسوا من روح اللہ" مت ناامید ہو اللہ کے فیض سے یعنی اللہ کی کشائش اور رحمت سے کیونکہ یہ بھی روح کا ایک جزو ہے۔

معارف و حقائق

دراصل بات یہ ہے کہ تنفس باعث فرحت وراحت اور سبب رحمت ہے اور اسی کے ذریعہ خوشبو کا احساس ہوتا ہے، اس لئے فرحت، تازگی، آسائش، خوشبو، نسیم کی خنکی اور خوش آیند ہوا کیلئے اس کا استعمال عام ہے، چنانچہ امام بغوی نے مجاہد سے

راحت کے، اور سعید بن جبیر سے فرحت کے، اور ضحاک سے مغفرت ورحمت کے معنی نقل کیے ہیں، بیہقی نے شعب الایمان میں مجاہد سے روح کے معنی جنت اور ہوائے خوش آئند کے روایت کیے ہیں۔ (معالم التنزیل ج ۷ ص ۲۳، فتح الباری ج ۶ ص ۲۲۸)

روح جمہور کی قرأت میں بفتح الراء ہے حسن، عمر بن عبدالعزیز اور قتادہ نے اسے بضم الراء پڑھا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کی اس رحمت سے مایوس نہ ہو جس سے وہ بندوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ اور ابن عطیہ نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اس زندہ شخص سے مایوس نہ ہو جس کے ساتھ اللہ کی ہبہ کردہ روح موجود ہے، کیونکہ جس کی روح موجود ہو اس کے حصول کی امید رکھی جاتی ہے۔

والعامة على "روح الله" بالفتح وهو رحمته و تنفسه و قرء الحسن و عمر بن عبدالعزيز و قتادة بضم الراء . قال الزمخشري اى من رحمته التي يحيا بها العباد، وقال عطية وكان معنى هذه القراءة لا تيئسوا من حي معه روح الله الذى وهبه فان من بقي روحه يرجى. (الدر المنثور ج ۶ ص ۵۴۹)

تحسس اور تجسس کے درمیان فرق:- بعض علماء نے دونوں کے درمیان اس طرح فرق کو بیان کیا ہے کہ تحسس کا استعمال خیر میں اور تجسس کا استعمال شر میں ہوتا ہے، چنانچہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ "والتحسس يكون في الخير والتجسس يكون في الشر" (ابن کثیر ج:۲ ص:۷۵۵) لیکن اکثر کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں ہم معنیٰ ہیں اس لئے کہ یہاں ایک قرأت بجائے حاء کے جیم کی بھی ہے، ایسے ہی سورہ حجرات میں: ولا تجسسوا میں ایک قرأت حاء کے ساتھ بھی مروی ہے، امام رازی تحریر فرماتے ہیں:

والتحسس هو طلب الشئی بالحاسة وهو شبیه بالسمع والبصر، وقرئ" تجسسوا" بالجیم کما قرئ بهما فی الحجرات.

(کبیر ج۹/۱۸ص۱۵۸، روح ج۱۳/۷ص۴۴)

یا بنی اذهبوا الآیة کا مفہوم:- یا بنی اذهبوا فتحسسوا من: ما قبل میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو کسی نہ کسی ذریعہ سے اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ یوسف علیہ السلام بقید حیات ہیں اور ان سے ان کی ملاقات ضرور ہوگی، چنانچہ بیٹوں کو یہ حکم دے رہے ہیں کہ اے بیٹو! ایک بار پھر مصر جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش وجستجو کرو اور خدا کے فیض ورحمت سے ناامید نہ ہو اس لئے کہ خدا کی رحمت سے مایوسی کافروں کا شیوہ ہے، ان کے سوا کوئی اور رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہوا کرتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو یا بنی کے لفظ سے خطاب فرمایا جو خطاب شفقت ورحمت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے علاوہ دوسرے بیٹوں سے بھی ان کو تعلق خاطر اور محبت ضرور تھی، البتہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے مقابلہ میں کمتر تھی، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے مصر میں روک لئے جانے کے بعد ان کی تلاش وحصول کے سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا نام بھی لیا، حالانکہ بظاہر اس مقام پر ان کے سراغ کا کوئی جوڑ نہیں لگتا، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو غالباً یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اب حضرت حق جل مجدہ کی طرف سے ان کے ابتلاء وامتحان کا دور ختم ہو چکا ہے اور بنیامین کے قصہ میں یوسف علیہ السلام کی ملاقات کا راز بھی مضمر ہے، اس لئے بنیامین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی تلاش کا حکم بھی دیا۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک تیسرا بیٹا بھی تو مصر میں رکا ہوا ہے۔ آخر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بیٹا تو اپنی مرضی سے بنیامین کی گرفتاری کی بنا پر رکا ہوا ہے، جب بنیامین رہا ہو جائے گا تو وہ خود بخود واپس آجائے گا، یا یہ کہ بیٹوں سے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی تلاش میں تو کوتاہی کا احتمال تھا کیوں کہ وہ دونوں سوتیلے تھے اور تیسرا تو خود ان کا حقیقی تھا، اس کی تلاش تو وہ خود ہی کرتے اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس تیسرے بیٹے کا تذکرہ نہیں کیا۔

اللہ کی رحمت سے مایوسی کافرین کا شیوہ ہے:- اللہ کی رحمت سے مایوس وہی انسان ہوتا ہے جو دولت ایمان سے خالی ہو کیونکہ رحمت خداوندی سے مایوسی اس اعتقاد کی بنا پر ہوتی ہے کہ "نعوذ باللہ" اللہ کو قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے یا یہ کہ اسے تمام معلومات کا علم نہیں ہے، یا یہ کہ وہ کریم نہیں بلکہ بخیل ہے، اور یہ تمام چیزیں انسان کو کافر بنا دیتی ہیں۔

واعلم ان الیأس من رحمة الله لا یحصل الا اذا اعتقد الانسان ان الله غیر قادر علی الکمال، او غیر عالم بجمیع المعلومات، او لیس بکریم بل هو بخیل، وکل واحد من هذه الثلاثة یوجب الکفر، فاذا کان الیأس لا یحصل الا عند حصول احد هذه الثلاثة و کل واحد منها کفر ثبت ان الیاس لا یحصل الا لمن کان کافراً. (والله اعلم)۔

البتہ اس بات پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی صاحب ایمان خدا کی رحمت سے مایوسی اختیار کرتا ہے (بشرطیکہ اس کا عقیدہ وہ نہ ہو جس کا ماقبل میں تذکرہ کیا گیا) تو وہ کافر نہیں ہوگا، اور اس پر کفر کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

وجمهور الفقهاء على ان اليأس كبيرة، ومفاد الآية أنه من صفات الكفار لا ان من ارتكبه كان كافرا بارتكابه) ہاں رحمت خداوندی سے مایوسی شدید قسم کا گناہ کبیرہ ضرور ہے، "نعم كونه كبيرة مما لا شك فيه بل جاء عن ابن مسعود أنه اكبر الكبائر". (روح ۱۳/۷ ص ۴۵)

يا بني اذهبوا : الآیۃ آیت کریمہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بندہ پر جب اس کے جان و مال اور اولاد وغیرہ کے سلسلہ کا ابتلاء وامتحان پیش آئے تو اسے صبر جمیل اختیار کرنا چاہئے۔ اور ذات خداوندی سے کشائش کی امید رکھنی چاہئے۔ اگر اس نے ایسا کرلیا تو خداوند قدوس ضرور بالضرور اسے ابتلاء وآزمائش سے نکال کر راحت وسرور کی زندگی عطا فرمائیں گے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ ان کے تمام رنج ومحن کو دور فرما کر راحت وسکون کی بے نظیر زندگی سے نوازا اور عزت و عظمت کے اعلیٰ مقام پر فائز فرمایا۔

بلاغت :- ولا تيئسوا من روح الله: فيه استعارة استعير الروح وهو تنسيم الروح التى يلذ شميمها و يطيب نسيمها للفرج الذى ياتى بعد الكربة واليسر الذى ياتى بعد الشدة. (صفوۃ ج۲ ص۶۰)

✿✿✿✿✿✿✿

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يَا أَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ .

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے اے عزیز پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور لائے ہیں ہم پونجی ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر اللہ بدلہ دیتا ہے خیرات کرنیوالوں کو۔

ترکیب ولغات:- دخلو..... محلاً مجرور ومضاف الیہ، جملہ قالوا..... جواب شرط غیر جازم، یاایھا العزیز .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ مسنا ..... جواب ندا، جملہ جئنا .....معطوف ہے مسنا پر، جملہ أوف.....محلاً مجزوم جواب ہے شرط مقدر کا تقدیر عبارت ان رضیتھا فأوف ہوگی۔ جملہ تصدق ..... محلاً مجزوم معطوف ہے أوف پر، جملہ ان اللہ یجزی .....برائے تعلیل، جملہ، یجزی..... محلاً مرفوع خبر ہے ان کی۔

ضر: بلا، سختی، برائی، تکلیف، ضرر، ایذا، نقصان، یہ اسم ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں: ضر بمعنی بدحالی ہے خواہ اپنے نفس (اندرون) میں ہو بسبب علم وفضل اور عفت کی کمی ہونے کے، خواہ اپنے بدن میں کسی عضو کے نہ ہونے کے باعث، یا کسی نقص کی بنا پر، اور خواہ وہ حالت ظاہری میں بوجہ مال وجاہ کی قلت کے ہو۔

"والضر سوء الحال إما فی نفسه لقلة العلم والفضل والعفة

واما فی بدنه لعدم جارحة و نقص واما فی حالة ظاهرة من قلة مال و جاه . (مفردات القرآن ج ا ص ۲۹۳)

مزجاة: اسم مفعول واحد مونث، مزجی واحد مذکر از جاء مصدر باب افعال بمعنی قلیل، حقیر، بے قدر، تھوڑی، ایک شاعر کا قول ہے "دجاجة غیر مزجاة عن الحاج" حاجت مند کی بعض حاجتیں آسان اور حقیر نہیں کہ ان کو پورا کیا جا سکے، مزجاۃ میں الف واو سے بدلا ہوا ہے، اس لئے کہ اس کا فعل مجرد میں زجا یزجو ہے، فتحہ کے بعد جب واو پر حرکت آئی تو اسے الف سے بدل دیا۔

المتصدقین: اسم فاعل جمع مذکر منصوب واحد المتصدق

معارف وحقائق

فلما دخلوا الآیة کا مفہوم:- برادران یوسف کا بجانب مصر یہ تیسرا سفر ہے جس کی وجہ کچھ تو والد محترم کا اصرار ہے۔ اور کچھ شدت قحط کی بنا پر واقعی اپنی حاجت وضرورت کہ قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہونچی ہوئی تھی، اور غلہ کا آس پاس نشان نہ تھا، اور مزید یہ کہ بنیامین کے ساتھ ایک بھائی اور بھی مصر ہی میں رکا ہوا ہے، اور بنیامین کو خوشامد برآمد کے ذریعہ کسی طرح حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے برادران یوسف جن کی تعداد اب نو ہے، مصر کیلئے روانہ ہوئے، اور جب عزیز مصر کے سامنے حاضر ہوئے (جو خود حضرت یوسف علیہ السلام ہیں) تو انتہائی عجز وانکسار اور منت وسماجت کے ساتھ کہنے لگے اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے، اور اس مرتبہ ہم پونجی بھی بہت تھوڑی لائے ہیں، جو حاضر خدمت ہے، اب معاملہ خرید وفروخت اور لین دین کا نہیں ہے، ہم پوری اور اچھی قیمت ادا کرنے سے قاصر ہیں، اس لئے آپ کی خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے

کہ از راہ کرم ہم کو غلہ پوری تول دیدیجئے اور ہمیں ضرورتمند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمایئے۔ بلاشبہہ اللہ تعالیٰ صدقہ وخیرات دینے والوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

حاجت روا سمجھے بغیر مخلوق کے سامنے عجز وانکسار درست ہے:-

قالوا یاایھا العزیز مسنا واھلنا الضر : آیت کے اس ٹکڑے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حاجت وضرورت کے وقت مخلوق کے سامنے عجز وانکسار ظاہر کرنا بشرطیکہ مخلوق ہی کو حاجت روا نہ سمجھ لے، ہرگز حق تعالیٰ کی شکایت نہیں بلکہ بلا تردد جائز اور درست ہے، یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو یہ حکم دیا تھا کہ جاؤ یوسف اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین کو تلاش کرو، اور بیٹے بجائے اس کے عزیز مصر کے پاس پہونچ کر پہلے غلہ لینے کی سعی میں لگ گئے آخر ایسا کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل انہوں نے یہ سوچا کہ منت وسماجت سے عزیز مصر کو خوش کر کے پہلے بنیامین کو حاصل کرلیں جس کا پتہ معلوم ہے پھر یوسف کو تلاش کریں گے جو ابھی تک لاپتہ ہیں، اور اس کا طریقہ ان کے ذہن میں یہ آیا کہ پہلے اپنی خستگی کا اظہار کر کے غلہ کا مطالبہ کریں تاکہ عزیز کو ہماری غربت پر رحم آجائے، اور درخواست کرنے پر وہ بنیامین کو بھی ہمارے حوالہ کردے" **فاوف لنا الکیل**" یعنی پونجی اگرچہ مقدار میں تھوڑی اور خراب قسم کی ہے مگر آپ ہمیں پوری تول عطا کر دیجئے، جیسا کہ اس سے پہلے مقدار میں پوری اور کھری پونجی کے عوض آپ نے ہم کو پورا غلہ دیا تھا۔

"اعطنا کیلا کاملا کما کنت تعطینا قبل ھذا بالثمن الجیاد الموافی"۔ (مظہری ج۵ ص۱۹۶)

نکمی اور گھٹیا چیزوں کی تفصیل:-

وجئنا ببضاعة مزجاة : یہ

مقدار میں تھوڑی، نکمی اور گھٹیا چیزیں کیا تھیں قرآن وحدیث میں اس کی تفصیل مذکور نہیں ہے اور نہ اس کے جاننے کی کوئی ضرورت ہی ہے، تاہم مفسرین نے چونکہ مختلف اشیاء کا تذکرہ کیا ہے، اس لئے ان میں سے چند کو یہاں لکھا جارہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نہ چلنے والے خراب قسم کے دراہم تھے، عکرمہ کہتے ہیں کہ وہ تھوڑے سے دراہم تھے، اور عبداللہ بن حارث کا بیان ہے کہ وہ کچھ اون اور گھی تھے، بعض علماء سے پنیر اور صنوبر وغیرہ کا قول بھی منقول ہے، اور بعض نے چمڑے اور جوتے کا بھی قول کیا ہے، ازجاء کے اصل معنی ہنکانے اور دفع کرنے اور پھینک دینے کے ہیں، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ "ان اللہ یزجی سحابا" اللہ بادل کو ہنکاتا اور چلاتا ہے، اور حاتم طائی کا یہ شعر بھی اسی معنیٰ میں ہے:

لبیک علی ملحان ضیف مدفع وار ملة تزجی مع اللیل ارملا

(الدر المصون ج۶ ص۵۵)

اور ردی دراہم واشیاء بھی قابل التفات نہیں ہوتیں، بلکہ پھینک دی جاتی ہیں اسی بنا پر برادران یوسف نے اپنی پونجی کو لفظ مزجاۃ سے تعبیر کیا، ایسے ہی اگر بیش قیمت سامان کے عوض تھوڑی پونجی دی جائے تو وہ بھی رد کر دی جاتی ہے، یہی حال دوسری خراب چیزوں کا ہے۔

واصل الازجاء الدفع والسوق، منه قوله تعالیٰ ان اللہ یزجی سحابا ای یسوق فیقال للدراهم الردیة مزجاة لانها تدفع ولا توخذ وکذا للدراهم القلیلة ولأنها تدفع ولا توخذ فی مقابلة المتاع العزیز وکذا لغیر الدراهم من الأشیاء الردیة لدفعها وعدم قبولها فی الثمن الا بتجوز من البائع. (مظہری ج۵ ص۱۹۵)

کیا اولاد انبیاء کے لئے صدقہ لینا جائز ہے:۔ وتصدق علینا:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادران یوسف ایک نبی کی اولاد ہیں تو کیا اولاد انبیاء کیلئے صدقہ لینا جائز ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں مراد اصطلاحی صدقہ نہیں ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے اپنے اور اپنی اولاد و خاندان کیلئے عدم جواز کا قول منقول ہے۔

عن ابی هريرة انه قال اخذ الحسن بن علی تمرة من تمر الصدقة فجعلها فی فيه فقال رسول الله ﷺ كخ كخ ارم بها اما علمت انا لا ناكل الصدقة ، و فی رواية انه قال انالاتحل لنا لصدقة.

(مسلم ج۱ص۳۴۳/۳۴۴)

بلکہ تسامح فی المعاملہ مراد ہے، یعنی پونجی اگرچہ تھوڑی یا ردی قسم کی ہے مگر آپ اسے نظر انداز کر کے بطور احسان غلہ پورا دیدیجئے، اور تسامح فی المعاملہ کی درخواست نبی اور آل نبی سب کیلئے درست ہے، یا یہ کہ مراد صدقۂ نافلہ ہے نہ کہ واجبہ اور آل انبیاء کیلئے صدقہ نافلہ جائز ہے۔ (بیان القرآن ج۵ص۹۶)

یا یہ کہ یہاں "وتصدق علینا" سے مراد یہ ہے کہ آپ ہمارے بھائی بنیامین کو ہمارے حوالہ کر کے ہمارے والد پر احسان کیجئے کیونکہ وہ ان کیلئے گمشدہ بھائی کی جگہ تسلی کا باعث ہے۔

وقال ضحاک وابن جرير انهم ارادوا التصدق علينابرد أخينا بنيامين علی أبيه. (روح ج۱۳/۷ص۴۶)

بھائی کی واپسی کی درخواست کا حقیقتاً صدقہ نہ ہونا بالکل واضح اور ظاہر ہے۔ اور اگر صدقہ کی حرمت کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اہل خاندان کیلئے خاص

مان لیا جائے جیسا کہ حضرت سفیان بن عیینہؒ کا مسلک ہے تو پھر کسی سوال جواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ سے پوچھا گیا کہ کیا حضرت محمد ﷺ کے علاوہ کسی اور نبی پر بھی صدقہ حرام تھا؟ تو انہوں نے اسی آیت کریمہ "و تصدق علینا" سے استدلال کرتے ہوئے جواب دیا کہ نہیں کسی اور نبی کیلئے صدقہ حرام نہیں تھا۔ مگر حضرت سفیان بن عیینہؒ کا یہ استدلال اس لئے محل نظر ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام سرے سے نبی ہیں ہی نہیں۔

"سئل سفیان بن عیینة هل حرمت الصدقة علی نبی من الأنبیاء سوی نبینا محمد ﷺ قال سفیان الم تسمع قوله تعالیٰ "وتصدق علینا" الآیة کذا اخرج ابن جریر، قلت استدل سفیان بهذه الآیة علی حل الصدقة علی الانبیاء ولا یتم الاستدلال الا اذا ثبت نبوة اخوه یوسف. (مظہری ج۵ص۱۹۶)

البتہ سفیان بن عیینہؒ کا یہ استدلال بایں معنی درست ہوسکتا ہے کہ نبی اور آل نبی دونوں کا حکم باب صدقہ میں ایک قرار دیا جائے۔

"قول اول یعنی تسامح فی المعاملہ" کی درخواست والا قول ہی راجح ہے، کیوں کہ برادران یوسف نے بغیر عوض غلہ کا سوال کیا ہی نہیں ہے، بلکہ انہوں نے پہلے کھوٹی اور مختصر ہی سہی پونجی پیش کی ہے اور اس کے عوض میں غلہ کی درخواست کی ہے۔

ان اللہ یجزی المتصدقین: آیت کے اس ٹکڑے میں یہ اصولی بات ذکر کی گئی ہے کہ صدقہ خیرات اور احسان کا معاملہ کرنیوالے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ بہترین جزا اور بدلہ دیا کرتا ہے، اگر وہ شخص مومن ہے تو دنیا و آخرت دونوں میں

اجر وثواب پاتا ہے، اور اگر کافر ہے تو اسے دفع بلا وغیرہ کی صورت میں دنیا میں ضرور بالضرور نفع حاصل ہوتا ہے، البتہ عدم ایمان کی وجہ سے وہ اجر آخرت سے محروم رہتا ہے، برادران یوسف علیہ السلام نے "یجزئک بصدقتک" کے بجائے "ان اللہ یجزی المتصدقین" کے عام جملہ کو ذکر اس لئے کیا کہ عزیز مصر کا مسلمان ہونا انہیں معلوم نہیں تھا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَأَخِيْهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ . قَالُوْا ءَ إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ قَالَ أَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا أَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ .

کہا! کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف اور اسکے بھائی سے جب تم کو سمجھ نہ تھی، بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف، کہا میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا۔

ترکیب:- جملہ قال.....مستانفہ، جملہ ھل فعلتم .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ" اذ انتم جاھلون ....." محلا مجرور مضاف الیہ، جملہ فعلتم..... صلہ ہے اسم موصول ما کا اور عائد محذوف ہے، جملہ قالوا.....مستانفہ برائے بیان، جملہ"انک لانت یوسف .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ أنت یوسف..... محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ قال.....مستانفہ، جملہ انا یوسف..... محلا منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ ھذا اخی .....محلاً منصوب معطوف ہے جملہ انا یوسف پر، جملہ من اللہ علینا .....مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ انہ من یتق ..... علت کے حکم میں ہے، جملہ من یتق .....محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ لا یتق..... محلاً مرفوع خبر ہے من مبتدا کی، جملہ یصبر .....محلا مرفوع معطوف ہے جملہ یتق پر، جملہ ان اللہ لا یضیع .....محلا مجزوم جواب شرط مقترن بالفاء، جملہ لا یضیع..... محلا مرفوع خبر ہے ان کی۔

"ھل علمتم" ظاہر یہ ہے کہ ھل استفہامیہ برائے توبیخ ہے، اور بقول

بعض خبر کیلئے ہے اور ھل، قد کے معنیٰ میں ہے۔

یجوز ان یکون استفهاما للتوبیخ وهو الاظهر وقیل هو خبر وهل بمعنی قد.

انک جمہور کی قرأت ''بھمز تین'' ہے استفہام کے ساتھ، اور استفہام تعجب واستعظام کیلئے ہے، ای انهم تعجبوا من ذلک. (ابن کثیر ج۲ ص۷۵۶)

اور ابن کثیر نے اسے خبر کے ساتھ انک پڑھا ہے، اور غالباً ان کی مراد بھی استفہام ہی ہے، دلالت سیاق کی بنا پر حرف استفہام کو حذف کر دیا ہے۔

ویحتمل ان یکون استفهاماً حذفت منه الاداة لدلالة السیاق.

(المصون ج۶ ص۵۵۱)

''لانت'' ابی بن کعب کی قرأت میں ''وانت'' ہے۔

معارف و حقائق

قال هل علمتم : یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کی اکڑ اور مزاج کی تمکنت اور خودداری سے بخوبی واقف تھے، لیکن آج انداز بدلا ہوا تھا کہ وہ انتہائی عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی، اپنے والد اور اہل وعیال کی خستگی کا تذکرہ کر رہے تھے، اور احسان وسلوک کے طالب تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے آج جب والدین اور بھائیوں کی اس پریشانی کا حال سنا اور ان کی عاجزانہ درخواست اور نیازمندانہ طلب کی مجبور کن حالت پر غور کیا تو دل بھر آیا اور اب ضبط نہ ہوسکا کہ خود کو چھپائیں اور راز کو ظاہر نہ ہونے دیں اور غالباً اب خداوند قدوس کی جانب سے بھی اس بات کی اجازت مل چکی تھی کہ راز کو ظاہر کر دیا جائے چنانچہ فرمانے لگے، کیوں جی! تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے۔ (قصص ج۱ ص۳۲۹)

"اذا نتم جاهلون" سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد بھائیوں پر لعنت وملامت نہیں بلکہ ان کی دلدہی اور توبہ کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

انما قال ذالک تحریضا لهم علی التوبة و شفقة علیهم لا معاتبة و تشریباً یدل علیه قوله " لا تثریب علیکم الیوم". (مظہری ج۵ص۱۹۶)

قال ابوسعود وانما قاله نصحا لهم و تحریضا علی التوبة وشفقة علیهم.

"قالوا ء انک لأنت یوسف"، "أنت" دونوں قراءتوں میں مبتدا اور "یوسف" اس کی خبر ہے۔ اور جملہ محلاً مرفوع خبر ہے "ان" کی۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور بھائیوں کے درمیان تعارف:-

بھائیوں نے جب عزیز مصر کی زبان سے اس موقع پر هل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیه اذ أنتم جاهلون کی غیر متوقع گفتگو سنی تو چونکے اور لب و لہجہ پر غور کر کے ایک دم ان کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگے (کیا واقعی تم یوسف ہو؟) یعنی اس حیرانی و پریشانی میں تھے کہ ہم عزیز مصر کے دربار میں کھڑے ہیں اس سے باتیں کر رہے ہیں یہ بے محل یوسف کا ذکر کیسا؟ صورت وشکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو اب دوسری نظر سے دیکھا تو یوسف کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی اور سمجھ گئے کہ بیشک یہ یوسف ہے، مگر حالت موجودہ کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ جرأت نہیں کی کہ یہ کہہ اٹھیں کہ تو یوسف ہے بلکہ ایسے موقع کے مناسب لب ولہجہ سے کہنے لگے کیا آپ واقعی یوسف ہی ہیں؟

عزیز مصر کی گفتگو "هل علمتم" کے بعد برادران یوسف علیہ السلام نے جب

غور وخوض سے کام لیا اور از اول تا آخر اپنے ساتھ عزیز کے معاملات پر نظر ثانی کی تو کچھ نفس معاملہ اور کچھ لب ولہجہ اور شکل وصورت سے اس بات کا تو یقین ہو گیا کہ یہ عزیز مصر یوسف علیہ السلام ہی ہے۔ مگر بہر حال تردد کی ایک کیفیت ضرور باقی رہ گئی تھی۔ سوال کا پیرایہ اختیار کر کے اسی تردد کو دور کرنا مقصود ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ''أنا یوسف و هذا اخی'' کے جملہ سے اس تردد کو بھی ختم کر دیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا، ہاں! میں یوسف ہوں اور یہ میرا حقیقی بھائی (بنیامین) ہے۔ ''قد من الله علینا'' اللہ نے بلاء ومصیبت سے نجات دے کر اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کے بعد اکٹھا کر کے اور ذلت وخواری کی زندگی کو راحت و عزت سے تبدیل کر کے احسان فرمایا:

صبر وتقا کا انجام:- '' انه من یتق ویصبر'' انه میں ھا ضمیر شان ہے، اور قنبل کی قرأت میں حالت وصل ووقف دونوں میں ''یتقی'' یاء کے اثبات کے ساتھ اور جمہور قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر کے پڑھا ہے، بلاشبہ شان یہ ہے کہ جو بلاء ومحن اور شدائد پر اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، اور فرائض کی ادائیگی اور معاصی سے اجتناب کرتا ہے۔ فان الله لا یضیع اجر المحسنین تو اللہ تعالیٰ اس کے اجر کو باطل اور احسان کو ضائع نہیں کرتا، بلکہ دنیا وآخرت دونوں میں بھرپور بہترین جزاء اور بدلہ عطا کرتا ہے، ''اجرهم'' ضمیر کے بجائے '' المحسنین'' کا ذکر اس بات پر متنبہ کرنے کیلئے ہے کہ محسن وہی شخص کہلاتا ہے جو تقویٰ اور صبر دونوں کا جامع ہو۔

وضع المحسنین موضع الضمیر للتنبیه علی أن المحسن من جمع بین التقوىٰ والصبر.

(مظہری ج ۵ ص ۱۹۸، البیضاوی ص ۲۶۹، بحوالہ صفوۃ ج ۲ ص ۵۹، روح ۷/۱۳/۴۹)

ہر معصیت کا صدرو جہالت کی بنا پر ہوتا ہے:- ارشار باری تعالیٰ ''ثم ان ربک للذین عملوا السوء بجهالة'' اور ''اذ انتم جاهلون'' سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ معصیت خداوندی کا مبنیٰ جہالت ہی ہوا کرتی ہے۔ اور بعض سلف کا قول ''کل من عصی الله فهو جاهل'' بھی اسی بات کا پتہ دے رہا ہے۔

''اذ انتم جاهلون'' ای انما حملکم علی هذا الجهل بمقدار هذا الذی ارتکبتموه کما قال بعض السلف کل من عصی الله فهو جاهل، و قراء ثم ان ربک للذین عملوا السوء بجهالة''.

صبر وتقویٰ ہر مصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے:- آیت کریمہ انه من یتق و یصبر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس انسان کے دل میں اللہ کا خوف ہوگا اور مصائب پر ثابت قدمی اس کا شیوہ ہوگا تو وہ انجام کے اعتبار سے دنیا وآخرت دونوں کی سرخروئی سے ہم کنار ہوگا، قرآن کریم نے کئی ایک آیتوں میں ان دونوں صفات پر فلاح وکامیابی کا تذکرہ کیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدهم شیئا، یعنی اگر تم نے اپنے کو صبر وتقویٰ کا خوگر بنالیا تو پھر دشمنوں کا کوئی مکر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا، ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: یا ایها الذین آمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا واتقوا الله لعلکم تفلحون. (آل عمران:۲۰۰) اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم اپنی مراد کو پہونچو، ایک جگہ اور ارشاد ہے'' فاصبر ان العاقبة للمتقین'' اے نبی! آپ صبر کیجئے بے شک نیک انجامی پرہیزگاروں ہی کیلئے ہے، (ھود:۴۹) اور بھی اس مضمون کی بہت سی آیات موجود ہیں۔

کیا اپنے لئے دعویٰ تقویٰ درست ہے:- تقویٰ کا اظہار اگر اپنی عظمت و بڑائی کو ظاہر کرنے کیلئے اور کبر وغرور اور ریاکاری کے طور پر ہے تو ہرگز جائز نہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی" یعنی اپنے نفس کو پاکیزہ قرار نہ دو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے، اور رہی یہ بات کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے (من یتق ویصبر) سے جو اپنے صبر وتقویٰ کا ذکر کیا ہے، تو یہ درحقیقت اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر ہے کہ اللہ نے مجھے تقویٰ اور صبر کی دولت سے نوازا جس کی بدولت یہ مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔

تنبیہ:- اس جگہ اکثر مفسرین امام رازی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، اور صاحب روح المعانی علامہ محمود آلوسی وغیرہ نے بنام حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک خط کا تذکرہ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے عزیز مصر تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم ایسے گھرانے والے ہیں جن پر مصائب وآلام کی بارش ہوتی رہی ہے، میرے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، میرے والد حضرت اسحاق علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھ کر چلایا گیا اور میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ میرے سب سے محبوب بیٹے کو مجھ سے جدا کر دیا گیا، اور اس بیٹے کے حقیقی بھائی کو چوری کے الزام میں آپ نے روک لیا ہے، جو میرے لئے تسلی کا سامان تھا حالانکہ ہم ایسے خاندان والے ہیں جو چوری نہیں کرتے اور نہ ہمارے یہاں چور پیدا ہوتا ہے، آپ میرے بیٹے کو واپس کر دیں ورنہ میں ایسی بددعا کروں گا کہ آپ کی سات پشت تک اس کا اثر باقی رہے گا، اس خط سے بادی النظر میں ہی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ جعلی ہے، کیونکہ کوئی نبی بلا تحقیق صرف ان بیٹوں کے قول پر اعتماد کر کے کسی کیلئے اس طرح بددعا کرے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی خصوصاً جن کا جھوٹ اب سے پہلے ظاہر

ہو چکا ہے، اخیر کے جملہ سے جعلی ہونے کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے، نیز اس میں حضرت اسحاق کو ذبیح قرار دیا گیا ہے، حالانکہ صحیح دلائل اور خود تورات کی تصریح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق نہیں بلکہ حضرت ابراہیم کے پہلے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔

ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام یا حضرت اسحاق علیہ السلام:- ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں یا حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے متعلق مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''قصص القرآن'' میں اجمالاً جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ قارئین فی الجملہ حقیقت واقعہ سے آگاہ رہیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، اور اگر کسی صاحب ذوق کو مسئلہ کی تفصیل مطلوب ہو تو وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی کتاب **"الرای الصحیح فی من ھو الذبیح"** کا مطالعہ کرے اس کتاب کا اردو ترجمہ ''ذبیح کون ہے'' کے نام سے بھی دستیاب ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے کہ وہ یہ ہے:

ذبح عظیم:- مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے، اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہم گروہِ انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لئے ان کو بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، اور اپنی جلالتِ قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں

کامل ومکمل ثابت ہوئے۔

جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت جس صبر اور رضاء بہ قضاء الٰہی کا انہوں نے ثبوت دیا، اور جس عزم واستقامت کو پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا، اس کے بعد جب اسماعیل اور ہاجرہ کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا، آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا، بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز، راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم وچراغ اسماعیل کو صرف حکمِ الٰہی کی تعمیل وامتثال میں ایک بے آب وگیاہ جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھے پھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقتِ پدری جوش میں آجائے اور امتثالِ امرِ الٰہی میں کوئی لغزش ہوجائے۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے، جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز اور جاں گسل امتحان ہے، یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابراہیم! تو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء علیہم السلام کا خواب ''رویاء صادقہ'' اور وحیِ الٰہی ہوتا ہے اس لئے ابراہیم (علیہ السلام) رضاء وتسلیم کا پیکر بن کر تیار ہوگئے کہ خدا کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کریں، مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزء وہ ''بیٹا'' تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس لئے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سنایا، بیٹا ابراہیم جیسے مجدد انبیاء ورسل کا بیٹا تھا فوراً سر تسلیم خم کردیا اور کہنے لگا کہ اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے، اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے جنگل روانہ ہوگئے، باپ نے بیٹے کی مرضی

پاکر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے، فوراً خدا کی وحی ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی، اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچا کر دکھلایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو مینڈھا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے ذبح کر، ہم نکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے پیچھے مڑکر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہی وہ ''قربانی'' ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیاءِ اسلام میں یہ ''شعار'' اسی طرح منایا جاتا ہے۔

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ''ذبیح'' کون ہے، اسماعیل (علیہ السلام) یا اسحاق (علیہ السلام)؟

قرآن عزیز نے اگرچہ ''ذبیح'' کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے بغیر کسی کنج وکاؤ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصِ قرآنی اسماعیل کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے۔

والصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ، فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى، قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ، وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي

المحسنینَ، ان هذا لهو البلؤا المبینُ، وفدینٰه بذبحٍ عظیم، وترکنا علیه فی الاٰخرینَ، سلٰمٌ علیٰ ابراهیمَ، کذٰلک نجزی المحسنینَ، انهٗ من عبادنا المؤمنینَ، وبشرنٰه باسحٰقَ نبیًّا من الصٰلحینَ و بٰرکنا علیهِ و علیٰ اسحٰق. (الصافات۳)

ترجمہ: اے پروردگار! مجھ کو ایک نیکوکار لڑکا عطا کر، پس بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے کی، پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے، ابراہیم نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے؟ کہا "اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ کر، اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائے گا، پس جب ان دونوں نے رضا و تسلیم کو اختیار کر لیا اور پیشانی کے بل اُس (بیٹے) کو پچھاڑ دیا، ہم نے اُس کو پکارا، اے ابراہیم! تو نے خواب سچا کر دکھایا، بیشک ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے، اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (مینڈھے) کے ساتھ، اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو، اس طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے، اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحاق کی جو نبی ہوگا اور نیکوکاروں میں سے ہوگا، اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق پر۔

ان آیات میں ابراہیم (علیہ السلام) کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا نام نہیں لیا اور "غلامٍ حلیمٍ" کہہ کر اس کے ذبح عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا "بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ" اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے دونوں صاحبزادوں

اسماعیل واسحاق میں سے اسماعیل بڑے ہیں اور اسحاق چھوٹے، پس جب کہ چھوٹے لڑکے کا ذکر بعد کی آیت میں نام لے کر کر دیا گیا تو پہلی آیت میں اسماعیل کے علاوہ اور کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسماعیل (علیہ السلام) ہی ہیں جنہوں نے "سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ" کہہ کر اور "وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ" کا مظاہرہ کر کے "وَفَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ" کا اعزاز حاصل کیا۔

قَالُوْا تَا للّٰهِ لَقَدْ آثَرَکَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِيْنَ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ . إِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِي هٰذَا فَأَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِيْ يَاْتِ بَصِيْراً وَأْتُوْنِيْ بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِيْنَ .

بولے قسم اللہ کی البتہ پسند کرلیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تھے چوکنے والے، کہا! کچھ الزام نہیں تم پر آج بخشے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے مہربان، لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا، اور لے آؤ میرے پاس گھر اپنا سارا۔

ترکیب:- جملہ قالوا .....مستانفہ برائے بیان، تاللہ لقد..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ آثرک اللہ ..... جواب قسم، جملہ ان (نا) کنا .....معطوف ہے جواب قسم، آثرک اللہ پر، جملہ کنا لخاطئین .....محلاً مرفوع خبر ہے ان مخففہ کی، جملہ قال.....مستانفہ، جملہ لا تثریب علیکم .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ یغفر اللہ..... مستانفہ قائم مقام قول کے برائے دعا، جملہ ھو ارحم الراحمن..... معطوف ہے یغفر اللہ پر، جملہ اذھبوا .....مستانفہ قائم مقام قول کے، جملہ القوہ .....معطوف ہے اذھبوا پر، جملہ یات .....جواب ہے شرط مقدر کا غیر مقترن بالفاء ہے۔ جملہ ایتونی .....معطوف ہے اذھبوا پر۔

ایثار اور تثریب کے معنی:- آثرک اللہ : اللہ نے آپ کو فضیلت عطا کی، ایثار کے معنیٰ ہیں ہر قسم کی عنایات کے ذریعہ فضیلت و برتری عطا کرنا، آثرہ یوثرہ ایثارا اس کی اصل الأثر ہے، اس کے معنیٰ شی کے تتبع کے ہیں، مطلب یہ

ہے کہ اللہ جسے فضیلت و برتری عطا کرتا ہے تو اس کے لئے اخلاق ومکارم کی تمام قسموں کا استقصاء کر دیتا ہے۔

آثرک ای تفضل علیک، والایثار التفضل بجمیع انواع العطایا، آثرہ یوثرہ ایثاراً، واصلہ من الأثر وھو تتبع الشئی فکانہ یستقصی جمیع انواع المکارم. (الدر المصون ج۶ ص۵۵۴)

تشریب: باب تفعیل سے سرزنش کرنا، الزام لگانا، گناہ پر ڈانٹنا، جھڑکنا، ایک معنی ہے عار دلانا، حدیث میں ہے: **اذا زنت امۃ احدکم فلیجلدھا ولا یثرب، ای: لا یعیر** تم میں سے کسی کی باندی زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوڑے لگاؤ اور عار نہ دلاؤ۔ (ابوداؤد/۴۴۷۰/۴۴۷۱، الدر المصون ج۶ ص۵۵۶)

معارف و حقائق

قالوا تاللہ لقد آثرک اللہ علینا وانا کنا لخاطئین: برادران یوسف علیہ السلام کے سامنے جب یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ عزیز مصر یوسف ہی ہیں تو اب ان کے پاس ندامت، شرمساری، خفت اور اعتراف جرم کے سوا کیا تھا، معاً یوسف کی تباہی و بربادی کیلئے اپنی تمام بیہودگیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اور جب ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ جس کو کل کنعان کے کنویں میں پھینک آئے تھے اور پھر قافلہ والوں کے ہاتھوں فروخت کر کے غلام بنا دیا تھا وہ آج عزیز مصر بلکہ مصر کے تاج وتخت کا مالک ہے تو سر جھکا کر کہنے لگے کہ بخدا اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر جمال صورت، کمال سیرت، اور تمام دنیوی اور اخروی فضائل وکمالات کے اعتبار سے برتری عطا فرمائی، اور بلا شبہہ ہم نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس میں سراسر قصوروار تھے۔

خطأ: کے معنی جان بوجھ کر غلطی کرنے کے آتے ہیں، اور أخطأ باب

افعال کے معنی نادانستہ غلطی کرنے کے ہیں۔

"یقال خطأ خطأً اذ تعمد بالذنب واخطأ اذا کان غیر متعمد". (مظہری ج۵ ص۱۹۸)

حضرت یوسف علیہ السلام کا حلم وعفو:۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رافت ورحمت اس کو برداشت نہ کرسکی، چنانچہ عفوودرگذر اور حلم وکرم کے ساتھ فوراً یہ ارشاد فرمایا آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں (اور جب آج کوئی سرزنش نہیں ہے جبکہ اس کا موقع ہے، تو پھر آئندہ ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں) اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے، یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اقرار کے بعد میں نے تم کو معاف کردیا اور جب نادار محتاج ہونے کے باوجود میں نے معاف کردیا تو خدا کی ذات تو بے نیاز اور رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والی ہے، بھلا وہ کیوں نہ معاف کردے گی، یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہئے میں درگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس غلطی کو معاف کردے، کیوں کہ وہی سب سے بڑھ کر رحیم وکریم ہے۔ (قصص القرآن ج اول)

"علیکم الیوم" میں "علیکم" متعلق ہے فعل مقدر کے جو خبر واقع ہو رہا ہے اور "الیوم" اسی خبر مقدر یا ظرف کے متعلق ہے۔

"ای لا تثریب مستقر علیکم الیوم" ولیس التقیید به لافادة وقوع التثریب فی غیره فانه علیهم السلام اذا لم یثرب اول لقائه واشتعال ناره فبعده بطریق الأولیٰ. (روح ۱۳/۷۰)

فتح مکہ کے موقع پر ہمارے نبی رحمۃ اللعالمین ﷺ نے بھی اسی آیت "لا

تثریب علیکم الیوم" کی تلاوت کر کے اپنے ان تمام جانی دشمنوں پر ہمیشہ کے لئے قلم عفو کھینچ دیا تھا جو حرم مکہ میں گردن جھکائے اعتراف جرم سے شرمسار آپ کے سامنے موجود تھے۔

روی ان الرسول علیه السلام اخذ بعضا دتی باب الکعبة یوم الفتح و قال لقریش "ما ترون فاعلابکم فقالوا نظن خیراً أخ کریم وابن أخ کریم وقد قدرت فقال، اقول ما قال اخی یوسف لا تثریب علیکم الیوم". (دلائل النبوۃ ج۵ص۸۶)

نظر اگر قضاوقدر پر رہے تو پھر کسی سے اختلاف نہ ہو:- لا تثریب الآیة: روح میں شاہ کرمانی سے منقول ہے کہ جو شخص مخلوق کی طرف نظر حق سے دیکھے گا وہ ان کی مخالفت کی پروانہ کرے گا، اور جو شخص ان کو اپنی نظر سے دیکھے گا اپنی عمر ان کی بحث وتکرار میں ختم کر دے گا، دیکھئے یوسف علیہ السلام کو چونکہ مجاری قضا کا علم تھا تو انہوں نے اپنے بھائیوں کا کس قدر عذر قبول کیا۔ (بیان القرآن ج۵ص۹۵)

"اذهبوا بقمیصی هذا فالقوه علی وجه أبی یات بصیراً و أتونی بأهلکم أجمعین".

بقمیصی کو فعل ماقبل کے متعلق بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں باء تعدیہ کیلئے ہوگا جیسا کہ ذهبت به میں باء تعدیہ کے لئے ہے اور اسے حال قرار دیکر فعل محذوف کے متعلق بھی قرار دیا جاسکتا ہے، "یعنی لے جاؤ اپنے ساتھ میرا کرتہ" اور "هذا" قمیص کی صفت ہے، یا اس کا بیان یا بدل ہے، "بصیرا" حال اور "اجمعین" تاکید کے لئے ہے۔

یجوز ان یتعلق بما قبله علی ان الباء متعدیة کفی "ذهبت به" وان

تکون للحال فتعلق بمحذوف ای اذهبوا معکم قمیصی و "هذا نعت له او بیان او بدل "وبصیرا" حال و "اجمعین" تاکید۔ (الدرالمصون ج۶ص۵۵۶)

والد محترم کی حالت وکیفیت کے بارے میں استفسار:- تعارف کی تکمیل اور معافی تلافی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام کی خیریت دریافت کی تو بھائیوں نے بتایا کہ آپ کے فراق اور جدائی کے غم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہوچکی ہیں جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بینائی ختم ہوچکی ہے، اور یہ بھی کہ بینائی بہت کمزور ہوچکی ہے، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا: اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیراہن لیتے جاؤ، یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا انشاء اللہ شمیم یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کردے گی، اور تمام خاندان کو مصر لے آؤ، برادران یوسف علیہ السلام کیلئے اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کو چاہ کنعان میں ڈال کر والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود پیراہن لے کر آئے تھے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ ان کے دل وجگر کو زخمی کیا تھا آج بھی انہیں کو پیراہن یوسف لے جانا چاہئے تاکہ اس زخم کا مرہم بنے اور رنج وغم، مسرت وشادمانی سے بدل جائے۔

بقمیصی سے مراد کوئی خاص کرتہ ہے یا عام؟:- وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ بھائیوں کے ہاتھوں حضرت یوسف علیہ السلام نے جس کرتے کو بھیجا تھا وہ کوئی عام کرتہ اور پیراہن نہیں تھا بلکہ وہی کرتہ تھا کہ جب حضرت ابراہیم کو نار نمرود میں ڈالا گیا تھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کے واسطے جنت سے لائے تھے اور ان کو پہنا دیا تھا، اور آگ حضرت ابراہیم کے لئے بردوسلام بن گئی تھی، یہی کرتہ وراثتاً حضرت اسحاق علیہ السلام پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک نلکی

میں ڈال کر اسے تعویذ کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں ڈال دیا تھا، پھر جب بھائیوں نے کرتہ اتار کر ان کو کنویں میں ڈال دیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کرتے کو نلکی سے نکال کر حضرت یوسف کو پہنا دیا، وہی کرتا حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس محفوظ تھا اور بھائیوں کو انہوں نے دیا تھا۔

وروی عن وهب بن منبه قال: كان القميص من الجنة وهو القميص الذى البس جبرئيل لابراهيم حين القى فى النار فبردت عليه النار فصار عند اسحاق ثم صار عند يعقوب فى عوذة و علقه فى عنق يوسف فكان معه حين القى فى الجب ونزع عنه قميصه فبشره جبرئيل والبسه فى الجب وكان القميص معه. (سمرقندی ج۲ص۲۰۹)

اور مجاہد کی روایت میں اتنی زیادتی ہے کہ حضرت جبرئیل تشریف لائے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اسی کرتے کے بھیجنے کا حکم دیا۔

ففى هذا الوقت جاء جبرئيل وقال ارسل ذالك القميص فان فيه ريح الجنة لا يقع على مبتلى ولا سقيم الا عوفى فدفع يوسف ذلك القميص الى اخوته . وقال " القوه على وجه ابى يات بصيرا .

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مکاشفہ:- حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکاشفات میں یہ بات مرقوم ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن دنیوی اشیاء میں سے نہ تھا بلکہ وہ جنت کی چیزوں کی جنس سے تھا، لہذا یہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ کرتہ جنت سے آیا تھا بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا پہنا ہوا تھا۔

(مظہری ج۵ص۱۹۹)

کسی کا پیراہن بینائی کے عود کا کوئی مادی سبب نہیں ہے:- حضرت یوسف

علیہ السلام کے کرتے کو آنکھوں پر ڈال دینے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کا واپس آجانا یا تیز ہو جانا یہ کوئی مادی سبب نہیں ہے، بلکہ بطور معجزہ ہے۔ لہذا یہاں اس قول کی سرے سے ضرورت ہی نہیں کہ وہ جنت سے آیا ہوا کوئی خاص کرتہ تھا اور اگر اسے معجزہ نہ بھی مانا جائے (جیسا کہ بعض لوگوں کو انبیاء کے معجزات سے چڑ ہوتی ہے) تو بھی اس میں کسی قسم کا کوئی استحالہ نہیں ہے، کیوں کہ واقعات و مشاہدات کی بنا پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ کسی سخت صدمہ اور غیر معمولی خوشی کے اثر سے بعض دفعہ نابینا بینا ہو گئے۔

(فوائد عثمانی: ۳۲۶)

نیز سخت صدمہ اور غیر معمولی خوشی کے اثر سے آدمی کے اندر جسمانی تغیرات کا پیدا ہو جانا بہت عام بات ہے جس کا مشاہدہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔

واتونی باھلکم أجمعین کا مفہوم:- حضرت یوسف علیہ السلام کا اصل مقصد تو والدین کو بلانا ہے مگر ادب و احترام کی بنا پر اس کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ بھائیوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "وأتونی باھلکم أجمعین" اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ بینائی کے واپس آجانے کے بعد پورے خاندان کے ساتھ والد محترم بھی ضرور تشریف لائیں گے۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ والد محترم کی خدمت میں خود حاضری دینے کے بجائے یوسف نے آخر انہیں مصر آنے کی زحمت کیوں دی، جو بظاہر خلاف ادب بھی ہے اور خلاف اخلاق و مروت بھی؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ملک مصر کی سلطنت و حکومت کے مالک ہو چکے ہیں، جس کی بنا پر حالات کی نزاکت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ مصر چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں لیکن اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ حکم خداوندی یہی تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مع اہل و عیال خود مصر تشریف لائیں اور بدوی و دیہاتی زندگی ترک کر کے حضری و شہری زندگی اختیار

کریں تا کہ احکام خداوندی کی خوب اچھی طرح نشر واشاعت ہو یہی وجہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹے کے پیغام کو بسر وچشم قبول کر کے فورا مصر جانے کی تیاری میں لگ گئے اور بلا تاخیر چل بھی پڑے یہ نہیں کہا آخر یوسف خود کیوں نہیں آیا، اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کی تکمیل بھی تو ہونی ہے، اور اس کی تکمیل وتعبیر کا سامنے آنا اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ حضرت یعقوب بذات خود مع اہل و عیال تشریف لے جائیں۔

بأهلكم أجمعين: حضرت یعقوب علیہ السلام کا خاندان اس وقت کافی پھیل چکا تھا تاریخی روایات کے مطابق ان کی تعداد ستر یا اس سے بھی زیادہ ہو چکی تھی، تاریخی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس زمانہ کے اعتبار سے عمدہ قسم کی سواریاں بھی بھیج دی تھیں تا کہ خاندان کے تمام افراد مع اسباب بسہولت مصر آسکیں۔

بلاغت:- "لا تثريب عليكم اليوم" میں "اليوم" کی قید تخصیص کیلئے نہیں بلکہ مبالغہ کے واسطے ہے اس لئے کہ آج ملامت کا احتمال اور موقع دونوں ہے، اس کے باوجود جب آج ملامت نہیں ہے تو دوسرے ایام میں بدرجہ اولیٰ نہیں ہوگی۔

التقييد باليوم ليس للتخصيص بل للمبالغة لان اليوم زمان احتماله فاذا انتفى فى اليوم انتفى فى غيره بالاولىٰ . (بیان القرآن ج۵ ص۹۵)

(دسویں رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ أَبُوْهُمْ إِنِّيْ لَأَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُوْنَ قَالُوْا تَاللّٰهِ إِنَّكَ لَفِيْ ضَلَالِكَ الْقَدِيْمِ .

اور جب جدا ہوا قافلہ ان کے باپ نے کہا میں پاتا ہوں بو، یوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا ہے، بولے قسم اللہ کی تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے۔

ترکیب ولغات:- جملہ **فصلت العیر** ..... محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ **قال ابوھم**..... جواب شرط غیر جازم، جملہ **انی لاجد** .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا،" جملہ **اجد ریح**....."محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ **تفندون**.....صلہ ہے موصول حرفی "ان" کا، جملہ"ان تفندون ....." بتاویل مصدر محلاً مرفوع ہونے کی بنا پر مبتداء ہے خبر محذوف کا، تقدیر عبارت "**لولا تفندکم موجود**" ہوگی، اور **لولا** کا جواب **لصدقتمونی** محذوف ہے۔ جملہ **قالوا**..... مستانفہ برائے بیان، جملہ **تاللہ**.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ" **انک لفی ضلالک**..... جواب قسم۔

ریح :ہوا، بو، ہوائے متحرک جو آسمان وزمین کے درمیان مسخر ہے۔

ریح :اصل میں روح تھا بکسر الراء وسکون الواو، دلیل یہ ہے کہ اس کی تصغیر **رویحة** آتی ہے، لیکن ماقبل مکسور ہونے کی بنا پر واو کو یاء سے بدل دیا گیا، اصل کے اعتبار سے اس کی جمع ارواح، اور کسرہ ماقبل کے اعتبار سے **ریاح** آتی ہے، ریح کی چار قسمیں ہیں: (۱) شمالی (شمالی ہوا) یہ ملک شام کی طرف سے چلتی ہے، موسم گرما میں گرم

ہوتی ہے اور خاک اڑاتی ہے۔ (۲) جنوب (جنوبی ہوا) جو اس کے مقابل ہے یعنی ریح یمانی (۳) صبا (پروا ہوا) مشرق کی طرف سے چلتی ہے اس کو "قبول" بھی کہتے ہیں۔ (۴) دبور (پچھوا ہوا) مغرب کی سمت سے چلتی ہے۔ ریح کا استعمال بیشتر تو مونث ہی ہو کر ہے مگر کبھی کبھی مذکر بھی بولا جاتا ہے۔ یہ ابوزید نے نقل کیا ہے۔ اور ابن الانباری کا بیان ہے کہ ریح بلا کسی علامت کے مونث ہے بجز ایک عصار (بگولا) کے کہ وہ تو البتہ مذکر ہے۔ اس کے اور تمام اسماء بھی اسی طرح کے ہیں۔ (لغات القرآن ج۳ ص۱۲۳) نیز ریح کا استعمال بو کے معنی میں بھی ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز کی بو جو ناک میں پہونچتی ہے۔ وہ ہوا ہی کے ذریعہ پہونچتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ "انی لاجد ریح یوسف" میں بو ہی کے معنی مراد ہیں، کبھی کبھی بطور استعارہ غلبہ کیلئے بھی ریح کا استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ "وتذھب ریحکم" (اور تمہاری ہوا کھڑ جائے گی) میں یہی معنی مراد ہے۔

معارف و حقائق

تفندون : تم نقصان عقل بتاتے ہو، تم نقصان عقل بتاؤ گے، تم بہکا ہوا بتاتے ہو، تم بہکا ہوا بتاؤ گے، مشتق ہے تفنید سے جس کے معنی جھوٹ، کمزوری، عاجزی، جہالت اور غم کی طرف منسوب کرنے کے ہیں۔ صیغۂ مضارع جمع مذکر حاضر یہاں نقصان عقل کی طرف منسوب کرنا مراد ہے۔ ھانی بن سکیم العدوی کا شعر:

یا صاحبی دعا لومی و تفنیدی فلیس ما قلت من امرٍ بمردود

(الدر المصون ج۶ ص۵۵۷)

لولا ان تفندون : میں نون، نون وقایہ ہے، اور "ان" کی بنا پر منصوب ہونے کی وجہ سے فعل مضارع کو رفع دینے والا نون محذوف ہو گیا ہے، اور فواصل و ترنم

کلام کی رعایت سے یاء متکلم کو حذف کر دیا گیا ہے۔

هذالنون للوقاية واما نون رفع الفعل المضارع فقد حذفت بعد ان نصب ب "أن" و حذفت ياء المتكلم لمراعاة الفواصل و جرس الكلام. (اعراب القرآن ج ۷ ص ۱۳/۶۲)

ولما فصلت العير الآية کا مفہوم:- بقول مجاہد تین روز کی مسافت سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنچ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں آٹھ رات کی مسافت کا ذکر ہے، حسن اور ابن جریج کے بقول اسی فرسخ کا فاصلہ تھا، تقریباً ڈھائی سو میل۔

قال مجاهد اصاب يعقوب ريح يوسف من مسيرة ثلثة ايام ، و حكى عن ابن عباس من مسيرة ثمان ليال وقال الحسن وابن جريج كان بينهما ثمانون فرسخا .

بغوی کی روایت میں ہے کہ بادصبا نے اپنے رب سے اجازت لیکر مبشر سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو کو حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہونچا دیا۔

قال البغوی روی ان ريح الصبا استأذنت ربها فی أن ياتی يعقوب بريح يوسف قبل أن يأتيه البشير. (مظہری ج ۵ ص ۱۹۹)

بہرحال برادران یوسف کا کارواں جب پیراہن یوسف علیہ السلام کو لیکر مصر سے کنعان کیلئے روانہ ہوا تو خدا کے برگزیدہ پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام کو وحی الٰہی نے شمیم یوسف سے مہکا دیا، وہ اپنے اِردگرد بیٹھے ہوئے افرادِ خاندان سے فرمانے لگے: اے خاندان یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی اور بڈھا سٹھیا گیا ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف کی مہک آرہی ہے، انبیاء علیہم السلام

کی ذکاوتِ حس انتہائی تیز ہوتی ہے، چنانچہ اُدھر قافلہ پیراہن کو لے کر چلا اِدھر حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی خوشبو محسوس ہوئی، مگر ان کی یہ ذکاوت حس بھی تمام تر فیضان الٰہی کے تابع ہوتی ہے، خود ان کی اپنی اختیاری نہیں ہوتی ہے، چنانچہ کنعان کے کنویں میں جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام بے حد قریب تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کی خوشبو محسوس نہ ہوسکی، شیخ سعدی فرماتے ہیں:

گہے برطارم اعلیٰ نشینم ☆ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اصل یہ ہے کہ کنعان کے کنویں سے ابھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحان کی ابتدا ہوئی تھی، ملاقات کا وقت ابھی کافی دور تھا اس لئے ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس نہ ہوسکی، اور قافلہ جب مصر سے پیراہن یوسف لے کر چلا ہے، تو ملاقات کا وقت قریب آچکا ہے، اس لئے خوشبو محسوس ہوگئی۔

"قالوا تالله انک لفی ضلالک القدیم" ضلال یہاں گمراہی کے معنی میں نہیں بلکہ وہم وخبط کے معنی میں ہے، اور ابن جریر کی تخریج کے مطابق امام مجاہد نے ضلال سے مراد یہاں محبت کو لیا ہے۔

"واخرج ابن جریر عن مجاهد ان الضلال هنا بمعنی الحب". (روح ج ۱۳/۷، ۵۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو نیک نیت جاننے کے باوجود خاندان کے تمام افراد کہنے لگے "بخدا تم تو اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہو" یعنی اس قدر عرصہ گذر جانے کے باوجود جبکہ یوسف کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا تمہیں یوسف کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ اور ابھی تک افراط محبت کی وجہ سے اسے یاد کئے جارہے ہو اور زندہ ہونے اور ملاقات کا یقین کئے بیٹھے ہو، یعنی ہوا وہی جس کا اظہار حضرت یعقوب علیہ السلام نے "لولا ان

تفندون" کے جملے سے کیا تھا کہ اہل خاندان نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے قول "انی لاجد ریح یوسف" کو ان کا خبط اور افراط محبت قرار دے کر رد کر دیا۔

بلاغت :- تا للہ انک لفی ضلالک " اکدوا کلامهم بالقسم وان واللام وهذا الضرب يسمىٰ "انكاريا" لتتابع انواع الموكدات.

(صفوۃ ج۲ ص۶۱)

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيْرُ أَلْقَاهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْراً قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيْ أَعْلَمُ مِنَ اللهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ .

پھر جب پہنچا خوشخبری والا ڈالا اس نے وہ کرتہ اس کے منہ پر پھر لوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا، بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے۔

ترکیب ولغات:- جملہ جاء البشیر .....محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ القاہ..... جواب شرط غیر جازم، ارتد، معطوف ہے القاہ پر، جملہ قال..... مستانفہ برائے بیان، جملہ لم اقل.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول اول کا، جملہ انی أعلم..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول ثانی کا، جملہ أعلم.....محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ لا تعلمون.....صلہ ہے اسم موصول (ما) اسمی یا حرفی کا۔

بشیر: بروزن فعیل معنی میں فاعل کے ہے، خوش خبری دینے والا، بشارت سنانے والا۔

ارتد: وہ لوٹ گیا، مشتق ہے ارتداد سے جس کے معنی جس راستہ آیا اسی راستہ واپس جانے کے ہیں، صیغہ ماضی واحد مذکر غائب۔ یہاں اپنی اصلی حالت پر لوٹ آنا مراد ہے۔

معارف و حقائق

"فلما ان جاء البشیر الایة" بشیر سے مراد یہوذا ابن یعقوب ہے۔ جو پیراہن یوسف کو لئے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو خوشخبری سنانے کیلئے قافلہ کے

آگے آگے چل رہا تھا۔

قال ابن عباسؓ هو يهوذا و قال ابن مسعودؓ جاء البشير بين يدى العير. (مظہری ج۵ص۲۰۰)

القاه: ظاہر ہے کہ اس کا فاعل ضمیر بشیر ہے یعنی خوشخبری سنانے والے نے کرتے کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا۔

"الظاهر ان الفاعل هو ضمير البشير" اور ایک قول یہ ہے کہ فاعل ضمیر یعقوب ہے یعنی کرتہ لانے والے نے اسے حضرت یعقوب علیہ السلام کے حوالہ کر دیا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے اپنے چہرہ پر رکھ لیا، **"وقيل: هو ضمير يعقوب".** (الدر المصون ج۶:۵۵۷)

"فارتد بصيرا" بقول ابوحیان ارتدّ، کان کے اخوات میں سے نہیں ہے لہذا بصیراً باعتبار ترکیب حال ہے، معنی یہ ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی پہلی حالت پر لوٹ آئی۔

وصحح ابوحيان انها ليست من اخوات كان . فبصيرا حال، والمعنى انه رجع الى حالته الاولىٰ من سلامة البصر، اور بعض نے ارتد کو کان کے اخوات میں شمار کیا ہے، اس صورت میں وہ صار کے معنی میں ہوگا، اور بصیراً اس کی خبر بنے گا۔ (روح ج۱۳/۷، ۵۴)

پیراہن یوسف علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کا واپس آجانا بطور معجزہ ہے:- الحاصل! کنعان کا قافلہ بخیریت تمام پہنچ گیا اور برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ان کا پیراہن حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دیا، یا یہ کہ اسے حضرت یعقوب علیہ السلام کے حوالہ کر دیا،

اور انہوں نے اسے اپنے چہرہ پر ڈال لیا تو ان کی آنکھیں فوراً روشن ہوگئیں، اور پہلی حالت پر لوٹ آئیں۔

الفت اسے کہتے ہیں بوبن کے رہی برسوں پیراہن یوسف میں یعقوب کی بینائی

دیار محبوب سے چلنے والی ہوا میں محبّ کی بیماری کا علاج بھی ہوا کرتا ہے:-

اصل تو یہی ہے کہ پیراہن یوسف علیہ السلام کے آنکھوں پر ڈال لینے سے یعقوب علیہ السلام کی بینائی کا واپس آجانا حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ دیار محبوب سے چلنے والی ہوا میں محبّ کی بیماری کا علاج بھی ہوا کرتا ہے، ایک شاعر کہتا ہے:

وانی لاستشفی بکل غمامة یهب بها من نحو ارضک ریح

ایک دوسرے شاعر کا شعر ہے:

الا یا نسیم الصبح مالک کلما تقربت منا فاح نشرک طیبا

کأن سلیمی نبئت بسقامنا فاعطتک ریاها فجئت طبیبا

حسن کی روایت میں ہے کہ خوش خبری سنانیوالے سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ سات دن سے ہمارے یہاں فاقہ چل رہا ہے اور تم کو کچھ دینے کیلئے موجود نہیں ہے، البتہ میں تمہارے واسطے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکرات موت کو آسان کردے۔

واخرج ابو الشیخ عن الحسن قال : لما جاء البشیر الیه علیه السلام قا ل وماوجدت عندنا شیئا وما اختبزنا منذ سبعة ایام و لکن هو ن الله تعالیٰ علیک سکرات الموت. (روح ج ۱۳/۷ ۵۵)

امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہ روایت کی گئی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے

خوش خبری سنانے والے سے پوچھا کہ یوسف علیہ السلام کا کیا حال ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ وہ مصر کے بادشاہ ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں بادشاہت کو کیا کروں گا؟ یہ بتاؤ کہ تم نے ان کو کس دین وملت پر عمل پیرا دیکھا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ ''دین اسلام'' پر تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اب نعمت مکمل ہوگئی۔

''قال البغوی روی انه قال للبشیر کیف یوسف؟ قال انه ملک مصر فقال یعقوب ما اصنع بالملک علی ای دین ترکته قال علی الاسلام ، قال الآن تمت النعمة. (مظہری ج۵ص۲۰۰)

قال الم اقل لکم الآیة: پیراہن یوسف علیہ السلام کے ڈالنے سے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور ان کے قول '' انی لاجد ریح یوسف ''اور''یا بنی اذهبوا الی ..... ولا تیئسوا من روح الله'' کی صداقت کھلی آنکھوں سب کے سامنے آگئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

مبشر کو انعام دینا سنت انبیاء ہے:- برادران یوسف علیہ السلام میں سے جس بھائی نے بسلامت ان کے زندہ ہونے کی خوش خبری حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنائی تھی، اس کو انہوں نے بطور انعام کچھ دینے کی تمنا کا اظہار فرمایا تھا مگر کچھ نہ ہونے کی بنا پر صرف سکرات موت کی سہولت کی دعا پر اکتفا فرمایا جو بذات خود ایک عظیم الشان انعام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خوش خبری سنانے والے کو انعام واکرام سے نوازنا سنت انبیاء ہے، اور اگر دینے کیلئے کچھ نہ ہو تو کم از کم دعاء خیر کر دینے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہئے۔

قَالُوْا يَاأَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَاذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِيْنَ . قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ .

بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو بیشک ہم تھے چوکنے والے، کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

ترکیب ولغات:- جملہ قالوا.....مستانفہ، جملہ یا ابانا.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ استغفر.....جواب ہے نداء کا، جملہ انا کنا.....جملہ تعلیلیہ، جملہ کنا خاطئین..... محلاً مرفوع خبر ہے ان کی، جملہ قال.....مستانفہ برائے بیان، جملہ استغفر..... محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ انه هو الغفور .....برائے تعلیل، جملہ هو الغفور.....محلاً مرفوع خبر ہے ان کی۔

خاطئین: گناہ گار، خطا کرنے والے، چوکنے والے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب وجر۔

معارف و حقائق

قالوا يا ابانا استغفر لنا الی ..... انه هو الغفور الرحيم . حقیقت حال جب واضح ہوکر سامنے آچکی تو برادران یوسف علیہ السلام شرم وندامت میں غرق سر جھکائے ہوئے بولے، اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا فرمایئے، یعنی پہلے خود معاف کردیجئے اور پھر جناب باری تعالیٰ

میں بھی ہمارے لئے معافی طلب کیجئے، کیوں کہ اب تو ظاہر ہی ہو چکا کہ بلا شبہ ہم سخت خطا کار اور قصوروار ہیں، بیٹوں کی درخواست کا جواب دیتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دعا کروں گا، بلا شبہہ وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔ چنانچہ صفت غفوریت سے پچھلی تقصیریں بھی معاف کر دیتا ہے، اور صفت رحیمیت سے آئندہ ترقی مراتب کے راستے برابر کھلے رکھتا ہے۔

سوف: جب مضارع پر آتا ہے تو مضارع میں مفہوم حال کا نہیں، صرف استقبال کا رہ جاتا ہے۔

سوف حرف یخصص افعال المضارعة بالاستقبال و یجردها عن معنی الحال نحو "سوف استغفر لکم وقوله فسوف تعلمون".

(المفردات ص ۲۴۹)

فوراً دعاءِ مغفرت نہ کرنے کی وجہ:- "قال سوف استغفر لکم ربی" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور اکثر مفسرین کا قول ہے کہ بیٹوں کیلئے طلب مغفرت کی دعاء کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے سحر کے وقت پر موقوف رکھا، کیونکہ یہ وقت قبولیت دعاء کا ہے، چنانچہ بخاری و مسلم کی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، تو خداوند قدوس سماء دنیا پر خصوصی نزول تجلی فرماتا ہے، اور ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعاء قبول کروں، کوئی ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اسے عطا کروں اور ہے کوئی جو مجھ سے عفو گناہ کی درخواست کرے اور میں اسے معاف کروں۔

"قال ابن عباس والاکثرون اراد ان یستغفر لهم فی وقت

السحر لان هذاالوقت اوفق الاقات لرجاء الاجابة". (کبیر۹/۱۸/۱۷۶)

"و فی البخاری و مسلم عن ابی هریرة ینزل ربنا تبارک و تعالیٰ کل لیلة الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخر، یقول من یدعونی فاستجیب له من یسئلنی فاعطیه من یستغفرنی فاغفرله". (بخاری ۱۱۴۵/ مسلم ۷۵۸)

حضرت یعقوب علیہ السلام کی دعاء اوراس کی قبولیت:- چنانچہ حسب وعدہ وقت مقررہ پر حضرت یعقوب علیہ السلام نماز کیلئے کھڑے ہوئے اوراس سے فراغت کے بعد یہ دعا فرمائی، خداوندا! یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں مجھ سے جو بے صبری ہوئی تو اسے معاف فرمادے، اور میرے بیٹوں نے میرے اور یوسف کے ساتھ جو برا سلوک کیا اسے بھی تو معاف کردے، اس پر وحی آئی کہ میں نے تمہارے اور تمہارے لڑکوں کے قصور کو معاف کردیا۔

فلما انتهیٰ الی الموعد قام إلی الصلوٰة بالسحر فلما فرغ منها رفع یدیه الی الله عزوجل قال اللهم اغفر لی جزعی علی یوسف و قلة صبری عنه، واغفر لولدی ما اتوا الی اخیهم یوسف فاوحی الله الیه انی قد غفرت لک و لهم اجمعین. (مظہری ج۵ص۲۰۰)

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کیلئے طلب مغفرت کو شب جمعہ تک کیلئے موخر کردیا، اس لئے کہ شب جمعہ اجابت دعاء کا وقت ہے، اور بقول بعض حضرت یعقوب علیہ السلام نے تاخیر اس لئے فرمائی تاکہ وہ بیٹوں کا امتحان لیں کہ حقیقتاً وہ نادم ہیں، اور اخلاص کے ساتھ معافی چاہ رہے ہیں، یا یہ کہ یہ وقتی انفعال کا نتیجہ ہے۔

قال ابن عباس فی روایة اخریٰ : اخر الاستغفار الی لیلة الجمعة لانها اوفق الاوقات للاجابة (الثالث) اراد ان یعرف انهم هل تابوا فی الحقیقة ام لا و هل حصلت توبتهم مقرونة بالاخلاص التام ام لا. (کبیر۹/۱۸/۱۶۷)

امام شعبیؒ ''سوف استغفر لکم ربی '' کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ میں یوسف علیہ السلام سے معاف کردینے کیلئے کہوں گا اور ان کو معاف کردینے پر میں اللہ سے تمہارے لئے مغفرت طلب کروں گا، کیونکہ مظلوم جب تک معاف نہ کردے اس وقت تک خدا سے طلب مغفرت بے سود ہے۔

''وقال الشعبی ، قال "سوف استغفر لکم ربی" یعنی اسئل یوسف ان عفا عنکم استغفرت لکم ربی فان عفو المظلوم شرط المغفرة لله تعالیٰ''. (مظہری ج۵ص۲۰۰)

ایک سوال اور اس کا جواب:- یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصر میں جب برادران یوسف علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی کی درخواست کی تو انہوں نے ''لا تثریب علیکم الیوم '' کہہ کر فوراً معاف کردیا۔ اور بیٹوں نے جب والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے معافی کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً معاف نہیں کیا آخر ایسا کیوں؟ اس سوال کا اجمالی جواب تو ماقبل میں آچکا، مگر صاحب قصص القرآن نے اس سوال کا جو جواب تحریر فرمایا ہے اسے نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ مفسرین کے حوالہ سے بیان فرماتے ہیں کہ: (۱) برادران یوسف علیہ السلام کی تمام خطاکاریوں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اخلاق کریمانہ کی راہ

سے اسی وقت ان کا اطمینان کر دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملہ کا تعلق یوسف علیہ السلام سے ہے، اس لئے اس کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے، اس طرح جواب دیا کہ توقع اور امید تک بات رہے، اور ساتھ ہی اپنی طبیعت کا رجحان بھی ظاہر کر دیا کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان خطا کاریوں کو معاف کر دے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے، اس لئے ان کے کریمانہ وصف میں حزم واحتیاط کا پہلو نہ تھا، انہوں نے فوراً معاف کر دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ کار، محتاط اور پھر باپ تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کا یہ انفعال و ندامت کا اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے، اور صرف دفع الوقتی کے لئے ہے یا اب ان کی طبیعت میں حقیقی ندامت وشرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں، اس لئے ان کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا، اور رجحان طبیعت کا اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور امید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا۔ (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۲/۳۳)

صراحتاً معافی نہ مانگنے کی وجہ:- بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے صراحۃ معافی نہیں مانگی بلکہ ان سے یہ کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے معافی طلب کیجئے، آخر ایسا کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں ان پر دو قسم کے حقوق تھے یعنی انہوں نے حق اللہ اور حق العباد دونوں میں کوتاہی کی تھی، اس لئے ایسا جامع عنوان اختیار کیا جس میں دونوں مضمون آ گئے، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ جو شخص کسی کیلئے اللہ سے مغفرت طلب کرے گا وہ خود بھی ضرور معاف کرے گا، اس لئے کہ خود معاف کئے بغیر اللہ سے مغفرت طلب کرنے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہی نہیں، ورنہ حقوق اللہ کیلئے پھر جدا کہنا پڑتا اور غالباً اسی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے وعدہ استغفار کیا، جیسا کہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی یغفر اللہ کہا کہ یہ دونوں کے حق کا جامع ہے، یعنی یغفر اللہ میں حق اللہ اور حق عبد دونوں آ گئے، گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کہہ دیا کہ میں نے معاف کر دیا اللہ بھی معاف کرے۔ (ماخوذ از بیان القرآن ج ۵ ص ۹۷)

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰى إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ .

پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی اپنے پاس اپنے ماں باپ کو اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دلجمعی سے۔

ترکیب:- جملہ دخلوا..... محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ آوی.....جواب شرط غیر جازم، جملہ، ادخلوا.....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ شاء اللہ..... جملہ معترضہ اور جواب شرط محذوف ہے جس پر اس کا ماقبل دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی ان شاء اللہ دخولکم آمنین دخلتم۔

معارف و حقائق

حضرت یعقوب علیہ السلام مصر کے شاہی محل میں:- فلما دخلوا علی یوسف الآیة: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کافی مقدار میں ساز وسامان اور بہت سی سواریاں اپنے بھائیوں کے ساتھ کنعان بھیجیں تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام پوری تیاری کے ساتھ مع اپنے اہل وعیال کے بسہولت مصر آسکیں، چنانچہ حیات یوسف علیہ السلام کی بشارت ملنے اور آنکھوں کے روشن ہوجانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے خاندان کو لیکر جن کی تعداد اس وقت توراۃ کی روایت کے مطابق ستر تھی، مصر کیلئے روانہ ہوگئے، حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع ہوئی کہ والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہونچ گئے، تو فوراً مع اعیان مصر

ووزراء کے استقبال کیلئے باہر نکلے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لختِ جگر کو دیکھا تو سینہ سے چمٹالیا پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے تعظیم و اکرام کے ساتھ والدین کو اپنے پاس بٹھایا، اور ہر طرح خاطر مدارات کی، کچھ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا، جب یہ مسرت آمیز ملاقات ہو چکی اور چونکہ یہ ملاقات شہر سے باہر مصر کی سرحد پر ہوئی تھی اس لئے جب شہر میں چلنے کی بات آئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے والد سے عرض کیا کہ اب آپ مع خاندان عزت واحترام اور امن وحفاظت کے ساتھ شہر میں تشریف لے چلیں، اس وقت مصر کا دارالسلطنت رعمسیس تھا اور ''جشن کا شہر'' کہلاتا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام والدین اور پورے خاندان کو بڑے کروفر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

''اوىٰ اليه ابويه'' بقول سدی وعبدالرحمٰن بن زید بن اسلم حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت والد کے نکاح میں ان کی خالہ تھیں اور خالہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے، جیسا کہ چچا بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے، اور خالہ جب اپنے والد کے نکاح میں ہو تو اس کا بمنزلہ ماں کے ہونا اور موکد ہو جاتا ہے اور بقول محمد بن اسحاق وابن جریر حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ حیات تھیں، ابن جریر فرماتے ہیں کہ ان کی ماں کے انتقال پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اور قرآن کریم کا ظاہر بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے، بہر حال اکثر مفسرین اور مورخین اس بات کے قائل ہیں کہ دخول مصر کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی خالہ تھیں، مگر ابن کثیر کا رجحان اس بات کی جانب ہے کہ حقیقی والدہ زندہ تھیں اور وہی ساتھ میں تھیں، تفصیل کیلئے دیکھئے۔

(ابن کثیر ج ۲ ص: ۷۵۹، روح ۱۳/۷/۵۷، کبیر ۹/۱۸/۱۶۸، مظہری ج ۵ ص ۲۰۱)

وقال ادخلو مصر ان شاء اللہ آمنین کا مفہوم:- اس قول کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین اور اہل خاندان کا استقبال شہر سے باہر کیا تھا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "ادخلوا مصر" کی تفسیر یہ منقول ہے کہ امن کے ساتھ اس میں قیام کرو، اقامت کو دخول کے لفظ سے بیان کرنا دونوں کے درمیان اقتران کی وجہ سے ہے۔

وعن ابن عباس المراد بقوله "ادخلوا مصر" ای اقیموا بها آمنین ، سمی الاقامة دخولا لاقتران احد هما بالآخر.

"ان شاء اللہ" ایک قول یہ ہے کہ استثناء کا تعلق امن سے ہے نہ کہ دخول سے اور معنی یہ ہیں کہ "داخل ہو جاؤ شہر میں امن کے ساتھ اگر اللہ نے چاہا" اور اس ترکیب کی نظیر اللہ تعالیٰ کا قول "**لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ امنین**" ہے۔ (سورہ فتح ۲۷) اور دوسرا قول یہ ہے کہ استثناء کا تعلق دخول سے ہے۔

" ان شاء اللہ" فیه قولان : الاول : انه عائد الی الامن لا الی الدخول والمعنی: ادخلو مصر آمنین ان شاء اللہ و نظیره قوله تعالیٰ "لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین" (الفتح ۲۷) وقیل انه عائد الی الدخول علی القول الذی ذکرناه انه قال لهم هذا اکلام قبل ان یدخلوا مصر آمنین .

یعنی تم کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہوگا۔ تمہارے اہل و عیال، مال و متاع اور تمہاری جانیں سب محفوظ رہیں گی، کسی قسم کے قحط وغیرہ میں مبتلا ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہوگا، اور اس کے ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ شہر میں داخلہ کیلئے تم کو شاہی اجازت نامہ کی ضرورت نہیں ہے، جب کہ غیر ملکیوں کیلئے یہ اجازت نامہ

ضروری تھا۔

''آمنین'' یعنی علیٰ انفسکم واموالکم واھلکم لا تخافون احدا وکانوا فیما سلف یخافون ملوک مصر و قیل آمنین من القحط والشدة والفاقة . (کبیر ۹/۱۸/۱۶۸)

'' وقیل من الجواز لانھم کانوا لا یدخلون مصر قبلہ الا بجواز من ملوکھم'' .

بلاغت :- المجاز المرسل : فی قولہ تعالیٰ '' وقال ادخلوا مصر ان شاء اللہ آمنین '' ومعلوم انھم لا یستوعبون البلد کلھا وانما یدخلون جزءاً منھا. فعبر بالکل واراد الجزء فعلاقة ھذا المجاز الکلیة . (اعراب القرآن ج ۷/۱۳/۷۰)

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّداً وَّقَالَ يَا أَبَتِ هٰذَا تَاوِيْلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ، وَقَدْ أَحْسَنَ بِيْ إِذْ أَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَاءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ إِخْوَتِيْ، إِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاءُ إِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ.

اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے سجدہ میں، اور کہا اے باپ! یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا، اس کو میرے رب نے سچ کر دیا، اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں، میرا رب تدبیر کرتا ہے جو چاہتا ہے بیشک وہی ہے خبردار حکمت والا۔

ترکیب:- جملہ ،،رفع .....،، معطوف ہے جملہ مقدرہ پر اور واقعہ ماقبل کے تابع ہے تقدیر عبارت ،،لما دخل یوسف مصر جلس علیٰ سریرہ ورفع ابویہ علیٰ السریر ،، ہوگی۔ جملہ ''خرّوا .....،، معطوف ہے جملہ رفع پر، جملہ النداءؑ ''یا ابت ..... ،، جملہ معترضہ، جملہ ،،ھذا تأویل ....،، محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا جملہ ،،جعلھا ربی ..محلا منصوب حال مقدرہ یا مقارنہ ہے، جملہ ''احسن بی ''محلا منصوب معطوف ہے جملہ جعلھا ربی پر، جملہ ،،اخرجنی ....،، محلا مجرور مضاف الیہ، جملہ ،،جاء بکم ...،، محلا مجرور معطوف ہے جملہ اخرجنی پر، جملہ ،،نزغ الشیطان ...،، صلہ ہے موصول حرفی ان کا، جملہ ،،ان ربی لطیف

....،، مستانفہ ہے اور اسمیں علت کے معنیٰ پائے جاتے ہیں، جملہ یشاء...،، صلہ ہے اسم موصول (ما) کا، جملہ ،،انہ ھو العلیم ...،، مستانفہ تعلیلیہ، جملہ ھو العلیم...،، محلاً مرفوع خبر ہے ان کی۔

معنی عرش کی تحقیق:- عرش کے معنیٰ تخت شاہی کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ "ورفع ابویہ علیٰ العرش" میں وہی مراد ہے، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقم طراز ہیں عرش اصل میں مسقف شے کو کہتے ہیں، اور اس کی جمع عروش ہے، ارشاد ہے: "وھی خاویہ علی عروشھا" اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش کہتے ہیں کہ وہ بلند ہوتی ہے، یہاں مراد حضرت یوسف کا تخت شاہی ہے۔ (کبیر ۹/۱۸/۱۶۸)

البدو ضد الحضارۃ، بدو بمعنی جنگل، بدو کے اصل معنی ظاہر ہونے کے ہیں، اس لئے ہر وہ مکان جہاں کی سب چیزیں ظاہر ہوں بدو کہلاتا ہے، جنگل میں بھی سب چیزیں کھلی اور ظاہر ہوتی ہیں، اس لئے اس کا نام بدو ہو گیا، اس کی جمع بادیات اور بواد آتی ہے۔

ورفع ابویہ علی العرش وخروا لہ سجداً کا مفہوم:-

مراد والد اور والدہ یا خالہ ہیں، بطور تغلیب ابویہ کہہ دیا گیا ہے، "من باب التغلیب، یرید اباہ وامہ او خالتہ"، (الدر المصون ۶/۵۵۷) حضرت یعقوب علیہ السلام جب اپنے پورے خاندان کے ساتھ مصر پہونچ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تاکہ مصریوں کا بھی بزرگ باپ اور اہل خاندان سے تعارف ہو جائے، اور تمام درباری ان کے عزت و احترام سے واقف ہو جائیں، (حضرت یوسف علیہ السلام یا تو اس وقت مقام شاہی پر فائز ہو چکے تھے، یا یہ کہ بادشاہ نے

سب کچھ ان کے حوالہ کر دیا تھا اور بحیثیت بادشاہ تخت شاہی پر وہی بیٹھا کرتے تھے۔ چنانچہ دربار منعقد ہوا، تمام درباری جب اپنی اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے والدین کو تخت شاہی پر جگہ دی گئی، اور باقی تمام افراد خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی، جب یہ سب انتظامات مکمل ہو چکے تب حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے، اسی وقت تمام درباری ''حکومت کے دستور کے مطابق'' تخت کے سامنے تعظیم کیلئے سجدہ میں گر پڑے، موجودہ صورت کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف علیہ السلام نے بھی یہی عمل کیا۔

(قصص القرآن ۱/۳۳۳)

وخروا له سجداً سے کیا مراد ہے؟:- (۱) عطاء کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ والدین اور بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تھا، بلکہ ان کو پالینے کی خوشی میں وہ اللہ کے لئے بطور شکریہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس صورت میں لام سببیہ ہوگا۔ اور ضمیر لہ اللہ کی جانب راجع ہوگی۔

''وفی روایة عطاء عن ابن عباس ان المراد بهذه الآية انهم خروا له لاجل وجدانه سجد الله تعالیٰ ای ان ذلک السجود کان سجود اللشکر فالمسجود له هو الله سبحانه و تعالیٰ''.

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس سجدہ میں قبلہ کی تھی، اور سجدہ حقیقت میں یوسف کو پالینے کی بنا پر بطور شکرانہ اللہ ہی کا تھا، اور یہ ایک عمدہ اور بہتر تاویل ہے، کیوں کہ اہل عرب جس طرح ''صلیت الی الکعبه'' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں ایسے ہی ان کے یہاں ''صلیت للکعبة'' کی ترکیب بھی مستعمل ہے، لہذا جس طرح ''فلان صلی للقبلة'' کی ترکیب درست ہے ایسے ہی ''سجد

للقبلة " کی ترکیب بھی درست ہے، اور ظاہر ہے کہ "سجد للقبلة" کے معنی قبلہ کو سجدہ کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد اللہ ہی کا سجدہ ہے۔

ایسے ہی "خروا له سجداً" میں بھی حضرت یوسف کا سجدہ نہیں بلکہ بطور شکر اللہ کا سجدہ مراد ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت صرف قبلہ کی ہے۔

ای انهم جعلوا یوسف کالقبلة وسجدوا لله شکرا لنعمة وجدانه ، وهذا التاویل حسن فانه یقال: صلیت للکعبة کما یقال صلیت الی الکعبة .

قال حسان شعراً

ما کنت اعرف ان الامر منصرف عن هاشم ثم منها عن ابی حسن

الیس اول من صلیٰ لقبلتکم واعرف الناس بالقرآن والسنن

وهذا یدل الی انه یجوز ان یقال فلان صلی للقبلة وکذالک یجوز ان یقال سجد للقبلة ، وقوله " وخروا له سجدا" ای جعلوه کالقبلة ثم سجدوا لله شکراً لنعمة وجدانه. (کبیر ۱۶۹/۱۸/۹)

(۳) ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں سجدہ سے مراد پیشانی کا زمین پر رکھنا نہیں یعنی اصطلاحی سجدہ مراد نہیں ہے بلکہ تواضعاً جھک جانا مراد ہے۔ (مگر لفظ "خروا له" سے اس قول کی تردید ہو رہی ہے)۔

(۴) بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہاں اصطلاحی سجدہ یعنی پیشانی کا زمین پر رکھنا ہی مراد ہے مگر یہ سجدۂ عبادت نہیں بلکہ سجدۂ تعظیم واحترام ہے، جو پہلی شریعتوں میں جائز و درست تھا اور اس کی حیثیت سلام کی تھی، لیکن شائبہ شرک کی وجہ سے امت محمدیہ (علی صاحبها الصلوٰة والسلام) پر قیامت تک کیلئے حرام قرار

دے دیا گیا۔

"لم یرد بالسجود وضع الجباه علی الارض انما هو الانحناء والتواضع یعنی تواضعوا لیوسف . وقیل : وضعوا الجباه علی الارض وکان ذلک علی طریق التحیة والتعظیم لا علی طریق العبادة وکانت تحیة الناس یومئذ السجود وکان ذالک جائزاً فی الامم السابقة فنسخت فی هذه الشریعة". (مظہری ج۵ص۲۰۲)

اس سلسلہ میں اور بھی متعدد اقوال تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔قرآن کریم نے جس انداز میں یہاں والدین اور برادران یوسف علیہ السلام کے سجدہ کا ذکر کیا اور اس کیلئے لفظ "خروا" استعمال فرمایا جس کے معنی زمین پر گر پڑنے کے ہیں، اس سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سجدہ اصطلاحی یعنی زمین پر پیشانی کو رکھ دینا ہی مراد ہے، خواہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قبلہ بنا کر اللہ کے لئے ہو یا بطور تعظیم وتکریم حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے، البتہ اتنی بات ضرور ملحوظ رہنی چاہئے کہ سجدۂ عبادت اللہ کے علاوہ کسی اور کیلئے کسی بھی شریعت میں جائز نہیں رہا ہے، ہاں بحیثیت سلام وتحیۃ البتہ سجدۂ تعظیمی کا جواز پچھلی شریعتوں میں رہا ہے، مگر شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اسے بھی حرام قرار دیدیا گیا ہے، لہذا اب قیامت تک کسی کیلئے یہ درست نہیں ہے کہ بطور تعظیم وتکریم بھی وہ کسی کا سجدہ کرے، نبی کریم ﷺ سے صراحۃً اس کی ممانعت منقول ہے، حدیث میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ملک شام تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے مقتدا وعلماء کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، چنانچہ جب واپس مدینہ منورہ آئے تو انہوں نے آنحضور ﷺ کو سجدہ کیا، آپ نے دریافت کیا معاذ! یہ کیا کر رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے شامیوں کو اپنے مقتداء اور علماء کا

سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور آپ ﷺ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ ﷺ کو سجدہ کیا جائے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر میں کسی کو کسی کے سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کا سجدہ کرے، اس کے حق کی عظمت کی بنا پر، ایسے ہی حضرت سلمان فارسی نے جب اپنے اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ایک مرتبہ آپ ﷺ کے سامنے سجدہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ اس ذات حی وقیوم کو سجدہ کرو جس کیلئے کبھی فنا نہیں ہے۔

وفی الحدیث ان معاذ قدم الشام فوجدهم یسجدون لاساقفتهم، فلما رجع سجد لرسول الله ﷺ فقال " ما هذا یا معاذ؟" فقال انی رأیتهم یسجدون لاساقفتهم، وانت احق ان یسجد لک یا رسول الله فقال: " لو کنت آمراً احدا ان یسجد لاحد لأمرت المرأة ان تسجد لزوجها لعظم حقه علیها. (بخاری ج ۷ ص ۱۰۴)

وفی حدیث آخر: ان سلمان لقی النبی ﷺ فی بعض طرق المدینة وکان سلمان حدیث عهد بالاسلام، فسجد للنبی ﷺ فقال " لا تسجد لی یا سلمان، واسجد للحی الذی لا یموت". (ابن کثیر ج ۲ ص ۷۵۹، ابن ماجہ ۱۸۵۳)

اول ملاقات میں سجدہ نہ کرنے اور مصر میں آکر سجدہ کرنے کی وجہ:-

دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شہر سے باہر نکل کر والدین اور اہل خاندان کا استقبال کیا تھا، گویا پہلی ملاقات مصر سے باہر ہوئی، مگر اس وقت ان لوگوں نے سجدہ نہیں کیا، بلکہ داخلۂ مصر کے بعد اجلاس شاہی کے وقت سجدہ کیا، جیسا کہ قرآن کریم کا بیان اس پر شاہد ہے، آخر ایسا کیوں؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ پہلی ملاقات میں شاید عظمت پر محبت غالب رہی ہو، اس لئے اس وقت صرف ملنا

جلنا، معانقہ اور خیر وخیریت تک معاملہ محدود رہا، جو کہ محبت کا تقاضا ہے، اور مصر میں آنے کے بعد اجلاس کے وقت عظمت کا محبت پر غلبہ ہوا یا تو اس بنا پر کہ محبت کے جوش کو (ملاقات کی وجہ سے) سکون ہو گیا تھا، اس لئے عظمت کا مشاہدہ ہوا، (اور وہاں جوش محبت میں عظمت کا مشاہدہ نہ ہو سکا تھا) یا یہ کہ مصر میں آنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام گویا اپنے اجلاس شاہی پر تھے، اور باہر اجلاس پر نہ تھے، اور دونوں حالتوں میں تفاوت ظاہر ہے اس لئے وہاں سجدہ نہ کیا اور یہاں آ کر کر لیا، اور رہا امام رازی وغیرہ کا یہ شبہہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین سے اتنی بڑی تعظیم کیوں کر گوارا کی، جو کہ والدین کی شان میں بظاہر گستاخی معلوم ہوتی ہے، تو یہ شبہہ انتہائی کمزور ہے، کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی خواب یوسف علیہ السلام سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایسا امر واقع ہونے والا ہے تو کیا وہ ان امور میں دخل دے سکتے تھے جن کا وقوع منجانب اللہ متعین ہو چکا تھا۔ (ماخوذ از بیان القرآن ج ۵ ص ۹۸)

''قال یا ابت هذا تاویل رؤیای من قبل قد جعلها ربی حقا'' من قبل متعلق ہے رویای کے اور معنی یہ ہیں کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہے جسے میں نے بچپن میں دیکھا تھا، قد جعلها ربی حال ہے، رؤیای سے اور اس کا مستانفہ ہونا بھی درست ہے، اور حقا باعتبار ترکیب حال بھی ہو سکتا ہے اور جعل کا مفعول ثانی بھی بن سکتا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ وہ مصدر ہو اور من حیث المعنیٰ فعل کی تاکید کیلئے ہو، یعنی خواب کو واقع کر کے میرے رب نے اس کی سچائی کو ثابت کر دیا۔

'' قوله'' من قبل '' یجوز ان یتعلق ب '' رؤیای'' ای : تاویل رؤیای فی ذلک الوقت '' قوله '' قد جعلها ربی '' حال من ''رؤیای'' ویجوز ان یکون مستانفة و فی '' حقا'' وجوه احدها: انه حال ،

والثانی : انه مفعول ثان، والثالث : انه مصدر مؤکد للفعل من حیث المعنیٰ ای : حققها ربی حقا بجعله. (الدرالمصون ج۶ ص۵۵۸)

''قال یا ابت الآیة: جلوس شاہی کے وقت والدین، برادران یوسف علیہ السلام اور اعیان سلطنت جب تمام سجدہ میں گر پڑے تو والدین اور بھائیوں کو سجدہ میں گرا ہوا دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اپنے بچپن کا خواب یاد آ گیا۔ اور اپنے والد سے کہنے لگے ابا جان: یہ اس خواب کی تعبیر ہے جسے بچپنے میں میں نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور شمس وقمر میرے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ میرے پروردگار نے اس خواب کو سچا ثابت کر دیا۔

خواب کی تعبیر کتنے دنوں بعد واقع ہوئی:- خواب دیکھنے اور تعبیر کے واقع ہونے کے درمیان کا فاصلہ بعض نے اسی سال، بعض نے ستر سال، بعض نے چالیس سال بیان کیا ہے۔ اکثر کا قول چالیس سال کا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی خواب کی تعبیر چالیس سال کے بعد بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اختلفوا فی مقدار المدة بین هذا الوقت و بین الرؤیا، فقیل ثمانون سنة وقیل : سبعون، وقیل : اربعون وهو قول الاکثرین . ولذالک یقولون ان تاویل الرؤیا انما صحت بعد اربعین سنة. (کبیر۹/۱۸/۱۷۱)

وقد احسن بی میں ''احسن'' لطف کے معنی میں ہے:-

''وقد احسن بی اذا خرجنی من السجن و جاء بکم من البدو من بعد ان نزغ الشیطان بینی و بین اخوتی''، '' احسن بی'' درحقیقت متعدی بالیٰ ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ ''واحسن کما احسن الله الیک'' (قصص ص:۷۷) چنانچہ کہا گیا ہے کہ احسن کو لطف کے معنیٰ میں لے لیا گیا ہے۔

جس کی بنا پر وہ باء کے ساتھ متعدی ہوگیا۔ جیسا کہ" وبالوالدین احسانا "میں (بقرۃ ۸۳) اور کثیر عزہ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی لطف کے معنی کو متضمن ہونے کی بنا پر احسن باء کے ساتھ متعدی ہے۔

أسيئ بنا أو أحسني لا ملومة لدينا ولا مقلية ان تقلت

اور ایک قول یہ ہے کہ احسن بھی باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آیت میں بـــاء الـی کے معنی میں ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہاں مفعول محذوف ہے۔ تقدیر عبارت. احسن صنعه بی" اور بی اسی محذوف کے متعلق ہے۔ مگر یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ مصدر کو حذف کر کے اس کے معمول کو باقی رکھنا بصریین کے نزدیک ممنوع ہے۔ اور اذ احسن کی بنا پر منصوب ہے۔ یا مصدر محذوف کی بنا پر، مصدر محذوف کی بنا پر منصوب ماننے کی صورت میں ماقبل والا اعتراض وارد ہوگا۔

قوله "احسن بی"، "حسن" ان يتعدى ب "الى" قال "واحسن كما احسن الله اليک" فقيل: ضمن معنى لطف فتعدىٰ بالباء كقوله: "وبالوالدين احساناً" و قول كثير عزه:

أسيئ بنا أو أحسني لا ملومة
لدينا ولا مقلية ان تقلت

وقيل: بل يتعدىٰ بها ايضا و قيل هي بمعنى "الى" وقيل: المفعول محذوف "احسن صنعه بی" ف "بی" يتعلق بذالک المحذوف، وهو تقدير الى البقاء (الاملاء ج۲ ص ۵۹) و فيه نظر من حيث حذف المصدر و ابقاء معموله، و هو ممنوع عند البصريين و "اذ" منصوب ب "احسن" او المصدر المحذوف قاله ابو البقاء وفيه

النظر المتقدم. (الدر المصون ج۶ ص۵۵۸)

وقد احسن بی الآیة کا مفہوم:- اور اسی کا یہ احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی عطا کی اور تم سب کو دیہات کی غیر متمدن زندگی سے نکال کر مرکز تہذیب وتمدن میں میرے پاس پہنچا دیا۔ اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈالدیا تھا جس کا اقتضا بظاہر یہ تھا کہ میرے اور ان کے درمیان کبھی صلح وصفائی نہ ہوسکتی، اور ہم کبھی یکجا نہ ہوسکتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی کریم النفسی:- یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اپنی کریم النفسی کی بنا پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں کی قید کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ شدید ترین قید خانہ تھا کیوں کہ اس میں بھائیوں کی رسوائی وشرمندگی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام "لا تثریب علیکم الیوم" فرما کر یہ وعدہ کر چکے تھے کہ وہ بھائیوں کو کبھی شرمندہ نہ کریں گے۔ نیز اس لئے بھی کنویں کی قید اور اس سے نکلنے کا تذکرہ نہیں فرمایا کہ اس سے نکلنے کے بعد غلام بننا پڑا تھا اور پھر عورتوں کے مکر کی بنا پر جیل خانہ کی قید اٹھانی پڑی تھی۔ اور جیل خانہ سے نکلنے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر کیا کہ اس کے بعد بادشاہت کی عظیم الشان دولت ملی اور والدین اور بھائیوں سے ملاقات ہوئی، اور عورتوں کے قید ومکر سے برأت وصفائی حاصل ہوئی۔ گویا قید خانہ سے نکلنے پر انعام کی تکمیل اور مکمل منفعت کا حصول ہوا تھا۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرمایا:

ولم یذکر اخراجه من البئر لوجوه : الاول : انه قال لاخوته " لا تثریب علیکم الیوم " ولو ذکر واقعة البئر لکان ذلک تثریبا لهم فکان اهماله جاریا مجری الکرم . الثانی : انه لما خرج من البئر لم

یصر ملکا بل صیروہ عبداً، اما لما خرج من السجن صیروہ ملکا فکان ھذا الاخراج اقرب من ان یکون انعاما کاملاً ، الثالث : انہ لما خرج من البئر وقع فی المضار الحاصلۃ بسبب تھمۃ المرأۃ فلما خرج من السجن وصل الی ابیہ واخوتہ . وزالت التھمۃ فکان ھذا اقرب الی المنفعۃ. (کبیرہ ۹/۱۸/۱۷۱، مظہری ج ۵ ص ۲۰۲)

حضرات انبیاء مصائب پر صبر کے ساتھ شکر کا پہلو بھی نکال لیتے ہیں:-

دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے شکر اور احسان کے طور پر قید خانہ سے نکلنے کا تذکرہ تو کیا مگر اس کی سختیوں اور وہاں کے مصائب کا کوئی ذکر نہیں کیا، ایسے ہی والدین کی طویل جدائی اور مفارقت کے مصائب کا تذکرہ اس شکر و احسان کے ساتھ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیہاتی زندگی سے نکال کر جہاں ضروریات زندگی بسہولت حاصل نہیں ہوا کرتیں متمدن شہری زندگی میں پہنچا دیا، جہاں راحت و آرام کے سامان بسہولت حاصل ہوا کرتے ہیں۔ اور بھائیوں کے جور جفا کے تذکرہ کو شیطان کے حوالہ کر کے اس معاملہ کو بھی یکسر ختم کر دیا۔ گویا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر حالت میں شکر خداوندی کا پہلو نکال لیا کرتے ہیں۔ ان کی کوئی حالت بھی شکر الٰہی سے خالی نہیں ہوا کرتی۔

" ان ربی لطیف لما یشاء انہ ھو العلیم الحکیم : لطف دراصل متعدی بالباء ہوتا ہے۔ مگر مدبر کے معنی کو متضمن ہونے کی صورت میں وہ متعدی باللام ہوا کرتا ہے، اور یہاں مدبر کے معنی ہی مراد ہیں۔

"لطف اصلہ ان یتعدیٰ بالباء وانما تعدیٰ باللام لتضمنہ معنی مدبر ، ای انت مدبر بلطفک لما تشاء". (الدر المصون ۶/۵۵۹)

" ان ربی " الایة: بلاشبہہ میرا پروردگار ان باتوں کیلئے جو وہ کرنی چاہے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ کیونکہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کیلئے مستقبل کا کوئی راز راز نہیں ہے۔ اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے کہ اس کے تمام کام محکم اور حکمت پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ خواہ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک ہو سکے یا نہ ہو سکے۔

بلاغت:- " من السجن " لم یقل و من الجب تکرما لاخوته کیلا یخجلوا ولان تمام النعمة کان بعد الخروج من السجن . قوله " نزغ الشیطان " فیه تلطف باخوته حیث لم یفعلوا ما فعلوا بانفسهم وانما اغراهم الشیطان فمعظم الملامة علیه. (بیان القرآن ج۵ص۹۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِماً وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ .

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا، اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں، موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں۔

ترکیب:- جملہ "النداء رب..... مستانفہ، جملہ آتیتنی..... جواب ہے نداء کا، جملہ "النداء: فاطر السمٰوات مستانفہ ہے یا پہلے نداء سے بدل ہے۔ جملہ " أنت ولی..... "جواب ہے نداء ثانی کا، جملہ توفنی.....مستانفہ قائم مقام نداء کے۔ جملہ" الحقنی..... "معطوف ہے جملہ "توفنی پر"

معنی فاطر کی تحقیق:- فاطر اسم فاعل واحد مذکر فطر مصدر (باب نصر ضرب) عدم کو پھاڑ کر وجود میں لانیوالا، نیست سے ہست میں کرنیوالا، اہل تفاسیر نے اس کا ترجمہ مبدع کیا ہے۔ یعنی بغیر نظیر و مثال کے عدم محض سے عالم وجود میں لانیوالا۔ لغت میں فطر کے معنی ہیں پھاڑنا (قاموس وصحاح) اللہ بھی کائنات کو عدم کا پردہ پھاڑ کر وجود میں لایا ہے۔ اس لئے اس کو فاطر کہا جاتا ہے۔

معارف و حقائق

" رب قد آتیتنی الی ..... تاویل الاحادیث ""من "من

الملک و من تاویل الاحادیث دونوں میں زائدہ یا بیان جنس کیلئے نہیں بلکہ تبعیضیہ ہے۔ اس لئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پوری دنیا کی سلطنت وحکومت نہیں بلکہ اس کے بعض حصہ یعنی صرف ملک مصر کی سلطنت وحکومت ملی تھی۔ یا یہ کہ ملک مصر کے بھی بعض حصہ کی حکمرانی عطا ہوئی تھی۔ ایسے ہی انہیں تمام علوم اور ہر خواب کی تعبیر کا علم اس طرح عطا نہیں ہوا تھا کہ کسی خواب کی تعبیر بیان کرنے سے وہ عاجز نہ رہ سکیں۔ ایسا نہیں تھا، کیوں کہ یہ تو اللہ کی شان ہے کہ اس کا علم ہر شی کو محیط ہے۔ بندہ تو بہر حال عاجز و درماندہ ہے اور اس کا علم محدود اور متناہی ہے۔

''من'' فی قولہ تعالیٰ ''من الملک ''و''من تاویل الاحادیث'' للتبعیض لانه لم یوت الا بعض ملک الدنیا او بعض ملک مصر و بعض التاویل قال الاصم : انما قال من الملک لانه کان ذو ملک فوقه (کبیر ۹/۱۸/۱۷۳) ''من الملک '' ای بعض الملک وهو ملک مصر '' من تاویل الاحادیث'' ای الرؤیا ومن هذا ایضاً للتبعیض لانه لم یوت کل التاویل (وفوق کل ذی علم علیم). (مظہری ج۵ص۲۰۳)

تاویل احادیث سے کیا مراد ہے:- تاویل احادیث سے مراد خوابوں کی تعبیر بھی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ وہ ظاہر ہے اور کتب الٰہیہ کے اسرار وغوامض اور سنن انبیاء کے دقائق اور اس کی باریکیاں بھی مراد ہوسکتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ من کل الوجوہ یہ تمام چیزیں حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا نہیں ہوئی تھیں۔

''وعلمتنی من تاویل الاحادیث '' ای بعضا من ذالک والمراد بتاویل الاحادیث اما تعلیم تعبیر الرؤیا وهو الظاهر واما تفهیم غوامض اسرار الکتب الالٰهیة و دقائق سنن الانبیاء و علی

التقديرين لم يوت عليه السلام جميع ذالک. (روح ۷/۱۳/۶۱)

حضرت یوسف علیہ السلام کی شکر گذاری:- حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق تمام واقعات ایک عجیب وغریب ترتیب سے وقوع میں آئے، اور ہر قدم پر خداوند قدوس کی طرف سے ان کی دستگیری ہوتی رہی یہاں تک کہ ان کے دین ودنیا کے تمام کام درست ہوگئے، تو اس حسن انجام کو دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام بے اختیار ہوگئے، اور بارگاہ خداوندی میں شکر ودعا کا اس طرح اظہار کرنے لگے، خداوندا! تو نے مجھے دنیا کے متمدن اور گہوارہ تہذیب وتمدن ملک، مصر کی سلطنت وحکومت سے نوازا، اور باتوں کا صحیح مطلب اور اس کے نتیجہ نکالنے کا علم عطا فرمایا، اے آسمان وزمین کو عدم سے وجود عطا کرنے والے تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو جس طرح تو نے میری دنیا کو سنوار دیا ہے اور قدم قدم پر اپنی کرشمہ سنجیوں اور چارہ سازیوں سے نواز کر راہ راست پر گامزن کر رکھا ہے، ایسے ہی اپنی کارسازی سے میری آخرت بھی سنوار دینا کہ جب میں دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں، اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

" فاطر السموات والارض": فاطر منصوب ہے منادی کی صفت ہونے کی بناء پر، یا یہ بذات خود منادی ہونے کی بنا پر یا بدل یا بیان یا اعنی مقدر کی بنا پر" "انتصابه على النداء" (مدارک ۲/۳۲۸) و نصبه على انه نعت لرب او بدل او بيان او منصوب باعني او منادى ثان. (روح: ۷/۱۳/۶۱)

توفنی مسلماً سے موت کی تمنا مراد نہیں ہے:- عطاء کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ "توفنی مسلماً" "موت کی تمنا نہیں بلکہ اس خواہش وتمنا کا اظہار اور اس بات کی درخواست ہے کہ باری تعالیٰ

میری وفات جب بھی ہو تو اسلام کی حالت میں ہو یعنی تیرے دربار میں تیرا مطیع و فرمانبردار ہونے کی حالت میں حاضر ہوں، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہ خصوصی نصیحت فرمائی تھی، "ولا تموتن الا وانتم مسلمون" (آل عمران ۱۰۲)، لہذا حضرت یوسف علیہ السلام! پر یہ اعتراض لازم نہیں آتا کہ نبی ہونے کے باوجود انہوں نے موت کی تمنا کیسے کی جو کہ ممنوع ہے، اور ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مذکورہ دعاء قرب موت کے وقت کی ہو، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات کے وقت انگلی اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا تھا، " اللهم فی الرفیق الاعلیٰ" .

وقال ابن عباس رضی اللہ عنہ فی روایة عطاء : یرید اذا توفیتنی فتوفنی علی دین الاسلام ، فهذا طلب لان یجعل وفاته علی الاسلام و لیس فیه ما یدل علی انه طلب الوفاة، (کبیر ۱۸/۹ ۱۷۵)طلب الوفاة علی حال الاسلام کقول یعقوب علیہ السلام لولده " ولا تموتن الا وانتم مسلمون. (مدارک ۲/۲۳۸)

یا یہ کہ حضرت یوسف کی دعا لقاء الٰہی کے شوق میں ہے اور اس کے جواز پر اتفاق ہے۔

وهذا الدعاء یحتمل ان یوسف قاله عند احتضاره کما ثبت فی الصحیحین عن عائشة ان رسول الله ﷺ جعل یرفع اصبعه عندالموت و یقول- اللهم فی الرفیق الاعلیٰ ،ثلاثا، " وتحتمل انه سئل الوفاة علی الاسلام واللحاق بالصالحین اذا جاء اجله . وانقضیٰ عمره . لا انه سئل منجزاً کما یقول الداعی لغیره : اماتک الله علی الاسلام، ویقول الداعی اللهم احینا مسلمین وتوفنا مسلمین، و الحقنا بالصالحین.

اور بقول قتادہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا فوری طور پر موت کی تمنا تھی، اور یہ تمنا ان کے دین میں درست تھی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ باریٰ تعالیٰ تو نے مجھے سلطنت وحکومت عطا کر کے دنیوی نعمتوں سے معمور کر دیا ہے، اب دنیا کی کوئی خواہش اور تمنا باقی نہیں رہی، اب اگر کوئی تمنا ہے تو یہ ہے کہ اپنے آباء گرامی قدر کی ملاقات سے مشرف ہو جاؤں۔

ویحتمل انه سئل ذلک منجزاً وان ذالک سائغا فی ملتهم، کما قال قتادة قوله "توفنی مسلما والحقنی بالصالحین" لما جمع الله شمله واقر عینیه، وهو یومئذ معمور فی الدنیا و ملکها ونضارتها اشتاق الی الصالحین قبله. (ابن کثیر ۲/۷۶۱)

کیا موت کی تمنا ہر حال میں ممنوع ہے؟:- نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ تم میں سے کوئی کسی مصیبت یا تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اور اگر تمنائے موت کے بغیر چارہ نہ ہو تو یہ دعا کرے: اے اللہ ﷻ میرے لئے جب تک زندہ رہنے میں خیر ہے اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب موت ہی میں میرے لئے بہتری ہو تو مجھے وفات دیدے، اور صحیحین کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ اگر وہ نیکو کار ہے تو اس کی نیکی میں اضافہ ہوگا، اور اگر بدکار ہے تو ممکن ہے کہ توبہ کے ذریعہ اپنے نفع کی چیز یعنی رضاء رب کو حاصل کرلے۔

قال الامام احمد بن حنبل حدثنا اسماعیل بن ابراهیم حدثنا عبدالعزیز بن صهیب عن انس بن مالک قال: قال رسول الله لایتمنین احدکم الموت لضر نزل به، فان کان ولا بد متمنیا الموت فلیقل "اللهم احینی ما کانت الحیاة خیراً لی وتوفنی اذا کانت الوفاة

خیرا لی" واخرجاه فی الصحیحین وعندهما لا یتمنین احدکم الموت لضر نزل به اما محسنا فیزداد ، واما مسیئا فلعله یستعتب ولکن یقل اللهم احینی ماکانت الحیاة خیرا لی و توفنی اذا کانت الوفاة خیرا لی . (مسند احمد ۱۳۰۰۴، ۳/۱۰۱، بخاری ۵۶۷۳، مسلم ۲۸۱۶)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مصیبت اور تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا درست نہیں ہے، اور اسی سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ اللہ کی ملاقات کے شوق یا کسی دوسری غرض صالح یا فتنوں کے ہجوم کے وقت موت کی تمنا نہ صرف یہ کہ درست بلکہ مستحسن ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سنا کرتی تھی کہ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ اسے دنیا و آخرت میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار نہ دیدیا جائے، چنانچہ آپ ﷺ کی بیماری نے جب نازک حالت اختیار کرلیا تو میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

" مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقیین والشهداء والصالحین و حسن اولئک رفیقا" (نساء ۶۹) تو میں نے جان لیا کہ آپ کو اختیار دیدیا گیا، " وعن عائشة قالت کنت اسمع لا یموت نبی حتی یخیر بین الدنیا والآخرة ، قالت اصاب رسول الله بحّة شدیدة فی مرضه سمعته یقول " مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقیین والشهداء والصالحین و حسن اولئک رفیقاً فظننت انه خیر".

(بخاری ۴۵۸۶، مسلم ۲۴۴۴)

کسی غرض صالح اور دین میں فتنہ کے اندیشہ سے بھی موت کی تمنا درست ہے، چنانچہ ایمان لانے کے بعد فرعون نے جب جادوگروں کو قتل کی دھمکی دی اور ان کو

دین صحیح سے ہٹانے کی کوشش کی تو انہوں نے دعاء فرمائی، " قالوا ربنا افرغ علینا صبراً و توفنا مسلمین". (اعراف ۱۲۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت جب حضرت مریم کو خطرہ ہوا کہ قوم کے لوگ طعنہ زنی کریں گے (کیونکہ وہ کسی کے نکاح میں نہ تھیں) اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی طعنہ زنی سے دین کے معاملہ میں کسی فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں تو انھوں نے دعا فرمائی: " یا لیتنی مت قبل هذا و کنت نسیا منسیاً" (مریم ۲۳) (اے کاش میں اب سے پہلے موت کی آغوش میں جا چکی ہوتی، اور بھولی بسری ہو چکی ہوتی) اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: " واذا اردت بقوم فتنة فاقبضنی الیک غیر مفتون " (باری تعالیٰ جب تو کسی قوم کو امتحان و آزمائش اور فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ کرے تو مجھ کو مبتلاء فتنہ ہونے سے پہلے موت دیدے) اور ایک حدیث میں ہے: آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "انسان دو چیزوں کو اپنے لئے مکروہ اور برا جانتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے۔ حالانکہ مومن کے لئے موت فتنہ میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے، اور قلت مال کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ مال کی قلت عند اللہ حساب میں سہولت پیدا کرنے والی ہے، مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ دین میں حلول فتنہ کے وقت موت کی دعا درست ہے، اسی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا خلافت کا معاملہ سدھار پر آنے کے بجائے بگڑتا جا رہا تھا اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہوتے چلے جا رہے تھے، تو اس وقت دعا فرمائی (اے اللہ تو مجھ کو اپنے پاس بلا لے کیوں کہ میں ان سے بیزار ہو چکا ہوں اور یہ مجھ سے اکتا چکے ہیں) اور امام بخاری کا جب امیر خراسان کے ساتھ جھگڑا پیش آیا تو انہوں نے دعا فرمائی (اے اللہ تو مجھے اپنے پاس بلا لے، اور حدیث میں ہے کہ خروج دجال کے بعد جبکہ فتنوں کا دور دورہ ہوگا اس حال میں ایک

شخص کسی قبر کے پاس سے گذرے گا تو یہ دعا کرے گا (کاش تیری جگہ میں ہوتا)۔

واما اذا كان فتنة فى الدين فيجوز سوال الموت، كما قال الله تعالىٰ اخباراً عن السحرة لما ارادهم فرعون عن دينهم و تهددهم بالقتل " قالوا ربنا افرغ علينا صبرا و توفنا مسلمين " وقالت مريم لما جاء ها المخاض وهو انطلق الى جذع النخلة " ياليتنى مت قبل هذا وكنت نسيا منسيا" وفى حديث معاذ الذى رواه الامام احمد والترمذى فى قصة المنام والدعاء فيه، "واذا اردت بقوم فتنة فاقبضنى اليك غير مفتون". (مسند احمد ۱/۳۶۸، بحوالہ ابن کثیر ۲/۷۶۲)

وقال الامام احمد: حدثنا ابوسلمة ، انا عبدالعزيز بن محمد بن عمرو بن عاصم ، عن كثير بن قتادة عن محمود بن لبيد مرفوعاً ان النبى ﷺ قال " ثنتان يكرههما ابن آدم ، يكره الموت والموت خير للمؤمن من الفتن " و يكره قلة المال و قلة المال اقل للحساب.

(مسند احمد ۵/۲۳۶۱۷، بحوالہ ابن کثیر)

فعند حلول الفتن فى الدين يجوز سوال الموت : و قال على بن ابى طالب فى آخر خلافته لما رأى ان الامور لا تجتمع له ولا يزداد الامر الا شدة ، فقال : "اللهم خذنى اليك فقد سئمتهم و سئمونى " و قال البخارى لما وقعت له تلك الفتنة و جرى له مع امير خراسان ما جرىٰ قال : "اللهم توفى اليك" وفى الحديث وان الرجل ليمر بالقبر اى فى زمان الدجال . فيقول : "يا ليتنى مكانك " لما يرىٰ من الفتن . (ابن کثیر ج ۲ ص ۷۶۲)

صالحین سے کون لوگ مراد ہیں؟:- والحقنی بالصالحین میں صالحین سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء واجداد حضرت یعقوب، حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ باری تعالیٰ تو مجھ کو ان مقربین بارگاہ کے اجر وثواب، مقام ومرتبہ اور ان کے عالی درجات پر فائز کردے۔

قال ابن عباس ﷺ و غیرہ من المفسرین :یعنی بآبائه ابراهیم واسماعیل و اسحاق و یعقوب ، والمعنیٰ ألحقنی بهم فی ثوابهم و مراتبهم و درجاتهم. (کبیر ۹/۱۸/۱۷۷)

اب یہ اعتراض وارد نہیں ہوگا کہ مرتبہ صلاح تو ایک مومن کا اول درجہ ہے، اور مقام نبوت پر فائز ہونے کی بنا پر حضرت یوسف علیہ السلام صلاح کے انتہائی مقام پر ہیں تو پھر انہوں نے صلاح کے اول درجہ کی دعا کیوں کی۔

توفنی مسلماً :حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ''توفنی مسلماً'' سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں، (۱) باوجود عصمت اور امتناع کفر کے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خوف کرنا (۲) شوق لقاء میں موت کی تمنا کرنا۔ (بیان القرآن ۵/۹۹)

حضرت یوسف کی دعاء صالح پر أحسن قصص اپنے حسن اختتام کو پہنچا: اللهم وفقنی لما تحب و ترضیٰ وتوفنی مسلماً والحقنی بالصالحین برحمتک یا ارحم الراحمین، و صلی الله تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد المصطفیٰ و علیٰ آله و اصحابه و اتباعه الی یوم الدین.

انوار احمد اعظمی بتاریخ ۲۵ صفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۳۰ مئی ۲۰۰۰ء

حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق تاریخ اور تورات وغیرہ کا بیان:-

حضرت یوسف علیہ السلام کا عجیب وغریب واقعہ جو قرآن کریم میں موجود ہے، اور جسے خود خداوند قدوس نے احسن قصص کے نام سے موسوم فرمایا ہے، وہ تو ان کی دعا" توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین" پر ختم ہوگیا، بقیہ واقعات کی وہ تفاصیل جو تاریخی روایات، اور توراۃ وغیرہ میں مذکور ہیں، ان میں سے بعض کا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اور تقریباً تمام مفسرین نے انہیں بیان بھی کیا ہے، وھو ھذا -

امام بغوی نے اہل تاریخ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر میں چوبیس سال انتہائی امن وچین اور خوشگوار ماحول میں گذارے، پھر مصر ہی میں آپ کی وفات ہوگئی، وفات کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو وصیت کی کہ مجھے لے جا کر میرے باپ حضرت اسحاق علیہ السلام کے پاس دفن کرنا، حضرت یوسف علیہ السلام نے وصیت کے مطابق انتقال کے بعد لے جا کر ان کے والد کے پہلو میں دفن کر دیا، اور پھر مصر لوٹ آئے، انتقال کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتالیس سال تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات:- حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی زندگی کے طویل حصہ عمر کو مصر ہی میں گذارا اور جب ان کی عمر ایک سو دس سال کو پہنچی تو ان کی وفات ہوگئی، حضرت یوسف علیہ السلام نے وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے یہ عہد لیا کہ وہ مجھ کو مصر کی زمین میں دفن نہ کریں گے، بلکہ جب خدا کا وعدہ پورا ہو کر بنی اسرائیل

دوبارہ فلسطین یعنی آباء واجداد کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں وہیں لے جا کر سپرد خاک کرنا، چنانچہ انہوں نے وعدہ کیا، اور جب حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہوگیا تو ان کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ رکھ دیا، اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اس تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے، اور آباء واجداد کی سرزمین میں ہی لیجا کر سپرد خاک کیا، حمویؒ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے، جو فلسطین کے علاقہ نابلس کا ایک گاؤں ہے، یہ قبر ایک درخت کے نیچے ہے۔

(قصص القرآن ج۱ص۳۶۱، ۳۳۵)

اولاد:- عزیز مصر کے انتقال کے بعد عزیز کی بیوی زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوگیا تھا، زلیخا کے بطن سے حضرت یوسف علیہ السلام کے تین بچے ہوئے تھے، (۱) افرائیم، (۲) میشا (۳) اور رحمت نامی ایک لڑکی، افرائیم کی نسل میں حضرت موسیٰ کے خادم حضرت یوشع بن نون ہیں (جو حضرت موسیٰ کے بعد نبی ہوئے) اور رحمت مشہور صابر پیغمبر حضرت ایوب کی بیوی ہوئیں۔

"وولد ليوسف من امرأة العزيز ثلاثة اولاد، افرائيم، و ميشا (وكان من اولاد افرائيم يوشع بن نون صاحب موسىٰ عليه السلام) و رحمت بنت يوسف امرأة ايوب المبتلى عليه السلام". (مظہری ج۵ص۲۰۴)

اہم اخلاقی مسائل:- حضرت یوسف علیہ السلام کا عجیب وغریب قصہ ارباب بصیرت کے لئے اپنی آغوش میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے، دراصل یہ قصہ ایک واقعہ نہیں بلکہ فضائل اخلاق کی ایسی زریں داستان ہے جس کا ہر پہلو موعظت و بصیرت کے جواہر سے لبریز ہے، قوت ایمانی، استقامت، ضبط نفس، صبر شکر، عفت، دیانت وامانت، عفو ودرگذر، جذبۂ تبلیغ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق اور اصلاح وتقویٰ جیسے

اخلاق فاضلہ اور صفات کاملہ کا ایک نادر سلسلۃ الذھب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں منقش نظر آتا ہے، مگر ان میں سے یہ چند امور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

(۱) اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اس کا ماحول بھی پاک، مقدس اور لطیف ہو تو اس شخص کی زندگی اخلاق کریمانہ میں نمایاں اور صفات عالیہ میں ممتاز ہوگی۔ اور وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی بہترین مثال ہے، وہ حضرت یعقوب، حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں کی اولاد تھے، اس لئے نبوت و رسالت کے گہوارہ میں نشو و نما پائی، اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی، ذاتی نیک نہادی، اور فطری بے باکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام فضائل و اوصاف حمیدہ چمک اٹھے، اور بچپن، جوانی اور کہولت کی زندگی کے تمام گوشے تقویٰ، عفت، صبر و استقامت، دیانت اور عشق الٰہی کے ایسے روشن مظہر بن گئے کہ عقل انسانی اس مجموعہ کمالات ہستی کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتی ہے۔

(۲) کسی شخص میں اگر ایمان باللہ مستقیم و مستحکم ہو اور اس پر اس کا یقین راسخ اور مضبوط ہو تو پھر راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اس پر آسان بلکہ آسان تر ہو جاتی ہیں۔ رویت حق کے بعد تمام خطرات اور مصائب ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی تمام زندگی میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔

(۳) ابتلاء و آزمائش، مصیبت و ہلاکت کی شکل میں ہو یا دولت و ثروت اور خواہشات نفسانی کے خوبصورت اسباب کی صورت میں ہر حالت میں انسان کو خدائے تعالیٰ کی جانب ہی رجوع کرنا چاہئے۔ اور اسی سے التجا کرنی

چاہئے کہ وہ امر حق پر ثابت قدم رکھے، اور استقامت بخشے۔ عزیز کی بیوی اور حسین مصری عورتوں کی ترغیبات اور ان کی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں اور پھر قید و بند کے مصائب ، ان تمام حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اعتماد اور ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہستی سے وابستہ نظر آتا ہے۔ وہ نہ عزیز مصر کے سامنے عرض رساں نظر آتے ہیں نہ فرعون کے سامنے ملتجی، وہ ان خوبرویان مصر اور عشوہ طراز ان حسن و جمال سے جی لگاتے ہیں۔ اور نہ اپنے مربی کی خوبرو بیوی سے۔ بلکہ ہر موقع پر خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کے طالب نظر آتے ہیں، رب السجن احب الي مما يدعونني اليه ، معاذ الله انه ربي احسن مثواي.

(۴) جب خدائے تعالیٰ کی محبت اور اس کا عشق قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا تمام تر مقصد وہی بن جاتا ہے۔ اور اس کے دین کی دعوت و تبلیغ کا عشق ہر وقت رگ و پے میں دوڑتا رہتا ہے۔ چنانچہ قید خانہ کی سخت مصیبت کے وقت اپنے رفیقوں سے سب سے پہلا کلام یوسف کا یہی تھا۔ ”يا صاحبي السجن ء ارباب متفرقون خير ام الله الواحد القهار“.

(۵) دیانت و امانت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو انسان کی دینی و دنیوی سعادتوں کی کلید کہنا چاہئے۔ عزیز مصر کے یہاں یوسف علیہ السلام جس طرح داخل ہوئے تھے واقعہ کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دیانت و امانت ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے وہ عزیز مصر کی نظروں میں بلند و باوقار اور محبوب بنے پھر مصر کی حکومت کے مالک ہو گئے۔

(۶) خود اعتمادی انسان کے بلند اوصاف میں سے ایک بڑا وصف ہے۔ خدا تعالیٰ

نے جس شخص کو یہ دولت بخشی ہے وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گذر کر دنیوی و دینی رفعت و بلندی حاصل کرسکتا ہے، خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم ''عزت نفس'' بھی ہے، جو شخص خودداری اور عزت نفس سے محروم ہے وہ انسان نہیں ایک مضغۂ گوشت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت نفس کے تحفظ کا یہ عالم ہے کہ برسوں کے بعد جب قید خانہ سے رہائی کا حکم ملتا ہے اور بادشاہ وقت کا پیغام سرمدی حاصل ہوتا ہے، تو مسرت و شادمانی کے ساتھ فوراً اسکو لبیک نہیں کہتے بلکہ صاف انکار کردیتے ہیں کہ میں اس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آؤں گا۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہوجائے کہ مصری عورتوں نے مکروفریب کے جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اس کی اصل حقیقت کیا ہے، " **فلما جاء ہ الرسول قال ارجع الی ربک فاسئلہ مابال النسوۃ التی قطعن ایدیھن**" ۔

(۷) صبر ایک عظیم الشان ''خلق'' ہے، اور بہت سی برائیوں کیلئے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے، قرآن میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے مراتب علیا اور درجات رفیعہ کا مدار اسی فضیلت پر رکھا ہے۔

حقیقت میں صبر ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان برائیوں سے باز رہ سکے اور نفس ان کی طرف اقدام سے رک جائے۔ اس لئے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے، اور تمام حیوانات سے اس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہئے کہ ان اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب ''صبر'' کو منسوب کیا جاتا ہے، وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرم گاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے، اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اس کو "صبر" ہی کہتے ہیں، اور اس کی ضد کا نام جزع وفزع ہے، اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اس کا نام "ضبط نفس" ہے، اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں، اور اگر میدان جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے، اور اس کی ضد کا نام "جبن" (بزدلی) ہے، اور اگر غیظ وغضب کے حالات پر صبر ہے تو اس کو "حلم" کہتے ہیں۔ اور اس کی ضد کو "تذمر" (بے قابو ہونا) کہا جاتا ہے، اور اگر حوادثات زمانہ پر صبر ہے تو اس کام "وسعت صدر" (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے، اور اس کی مخالف صفت کو "ضجر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں، اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کا نام "کتمان سر" (پردہ پوشی) ہے، اور اگر بقدر کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں، اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام قسموں کا بیان جامع ایجاز واعجاز کے ساتھ قرآن عزیز کی اِس آیت میں کیا گیا ہے۔

" والصابرین فی الباساء والضراء وحین البأس اولئک الذین صدقوا واولئک هم المتقون". (بقرہ ۱۷۷) (اور ہر قسم کی مصیبتوں اور میدان جنگ کی ہولناکیوں میں صبر کرنے والے دراصل یہی صادق ہیں اور یہی متقی وپرہیزگار ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صبر ورضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جس کو "مثل اعلیٰ" کہا جاتا ہے، مثلاً:

(۱) بھائیوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر۔

(۲) آزاد ہونے کے باوجود غلام بن جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالف اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی۔

(۳) عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پر فریب ترغیبات پر صبر۔

(۴) قید خانہ کے مصائب پر صبر۔

(۵) عزیز مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکر گذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز۔

(۶) مملکت مصر کے حاکم مطلق ہونے پر صبر یعنی ظلم، کبر، شیخی سے پرہیز۔

(۷) ایذاء رساں بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیار صبر یعنی وسعت قلب کا ثبوت "لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم"۔

(۸) اخلاق حسنہ میں "شکر" بھی بہترین خلق ہے، اس لئے کہ یہ اخلاق الٰہیہ میں سے بہت بلند خلق ہے، قرآن عزیز میں ہے: "واللہ شکورٌ حلیم" انسانی اوصاف میں "شکر" ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ منعم حقیقی کی نعمت کا اعتراف کیا جائے، اور اس پر مسرت و شادمانی کا ظہار ہو اور اس کو محسن و منعم کے مرغوب اور پسندیدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے، قرآن عزیز میں ہے "فاذکرونی اذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون" (پس تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا، اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو) ما یفعل اللہ بعذابکم "ان شکرتم و آمنتم" (اللہ تم پر عذاب نہ لائے گا، اگر تم اس کے شکر گذار اور اس پر ایمان والے رہے) "لئن شکرتم لازیدنکم" (اگر تم شکر گذار ہو تو ہم (تمہاری نعمتوں میں) اضافہ

کرتے رہیں گے)، مگر افسوس یہ ہے کہ انسانی دنیا میں حقیقی شکر گزار اور سپاس گزار بہت کم ہیں، ''وقلیل من عبادی الشکور''. (سبا:۱۳)

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بھی بدرجۂ کمال عطا فرمائی تھی، ان کی زندگی کے حالات پڑھو اور اندازہ کرو کہ کس طرح جگہ جگہ شکر اور سپاس گزاری کا مظاہرہ نمایاں نظر آتا ہے، خصوصاً ختم قصہ پر ان کی جو دعا مذکور ہے، وہ ان کے اس وصف کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے، ''رب قد آتیتنی من الملک و علمتنی من تاویل الاحادیث فاطر السمٰوات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرة توفنی مسلما والحقنی بالصالحین''۔

(۹) حسد اور بغض کا انجام حاسد اور بغض کرنے والے کے حق میں ہی مضر ہوتا ہے، اور اگرچہ کبھی محسود و مبغوض کو بھی دنیوی نقصان پہونچ جانا ممکن ہے، لیکن حاسد کسی حال میں بھی فلاح نہیں پاتا، اور خسر الدنیا والآخرة کا مصداق ہی رہتا ہے، اِلّا یہ کہ تائب ہو جائے اور حاسدانہ زندگی ترک کر دے، برادران یوسف علیہ السلام کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا انجام بھی، مگر چشم بصیرت شرط ہے۔

(۱۰) صداقت، دیانت، امانت، صبر اور شکر جیسے صفاتِ عالیہ سے متصف زندگی ہی حقیقی اور کامیاب زندگی ہے، اور اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے بلکہ اس سے بھی بدتر'' اولٰئک کالأنعام بل هم أضل'' (یہ متمرد اور سرکش انسان) چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔

(۱۱) حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ اور صفاتِ عالیہ کی مدحت و منقبت میں سب سے اہم وہ جملہ ہے جو نبی اکرم ﷺ نے ان کے حق میں فرمایا: الکریم بن الکریم بن الکریم، یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم

السلام یعنی وہ سلسلۂ نسب چار پشتوں سے کرامت نبوت سے مستفیض ہے، ایک اور روایت میں ہے: أكرم الناس يوسف نبي الله بن نبي الله بن نبي الله بن خليل الله عليهم السلام۔

(بخاری شریف، کتاب التفسیر ۳۳۷۴) (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۳۶ تا ۳۴۲)

ذٰلِکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْکَ ج وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوْا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ .

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب ٹھہرانے لگے اپنا کام اور وہ فریب کرنے لگے۔

ترکیب:- جملہ ذلک من أنباء الغیب.....مستانفہ، جملہ نوحیہ ..... محلاً مرفوع ذلک مبتداء کی خبر ثانی، جملہ ما کنت لدیھم .....معطوف ہے، ذلک من أنباء الغیب پر، جملہ أجمعوا..... محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ ھم یمکرون .....محلاً منصوب حال واقع ہے، جملہ یمکرون .....محلاً مرفوع خبر ہے مبتداء (ھم) کی۔

معارف وحقائق

ذلک من أنباء الغیب نوحیہ إلیک :ذلک مبتداء، من انباء الغیب اس کی خبر، نوحیہ حال بھی ہوسکتا ہے اور خبر ثانی بھی، اور یہ بھی درست ہے کہ خبر اول کی ضمیر سے حال واقع ہو، لدیھم میں ھم ضمیر کا مرجع برادران یوسفؑ ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی یہ تفصیل جو ماقبل میں بیان کی گئی، یہ اخبار غیبیہ میں سے ہے کہ جس پر مطلع ہونے کا ذریعہ صرف وحی الٰہی ہے اور آپ ﷺ اس وقت وہاں موجود بھی نہ تھے جبکہ برادران یوسف ان کو اپنے مکر و فریب سے کنویں میں ڈالنا طے کر چکے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اثبات:- درحقیقت اس آیت میں

رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اثبات ہے، کیونکہ زمانہ گزشتہ کے کسی واقعہ پر اس کے تمام جزئیات کے ساتھ مکمل اور صحیح طریقہ پر واقف ہونے کا ذریعہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ جاننے والوں سے اسے سنا گیا ہو، یا واقعہ اگر کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو پڑھ کر معلوم کیا گیا ہو، یا یہ کہ وقوع واقعہ کے وقت آدمی بذات خود وہاں موجود ہو، یا بذریعہ وحی الٰہی اس کا علم حاصل ہوا ہو، یہاں اگر تھوڑا سا غور وتدبر کیا جائے تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں پہلے تینوں ذریعے مفقود ہیں، کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ آپ ﷺ کی ولادت سے ہزاروں سال پہلے کا ہے، لہٰذا آپ ﷺ کے وقوع واقعہ کے وقت وہاں موجود ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں، اور پورا عرب اس بات سے واقف تھا کہ آپ ﷺ امی محض ہیں، آپ ﷺ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، اس لئے بائبل وغیرہ میں پڑھ کر بھی جاننے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اور کسی سے سن کر جاننے کا بھی کوئی موقع آپ ﷺ کو حاصل نہیں ہوا کیونکہ ملک شام کا ایک سفر آپ ﷺ نے بچپنے میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ کیا تھا مگر راستہ سے واپس چلے آئے تھے، اور دوسرا سفر بسلسلۂ تجارت چند دنوں کا کیا تھا، جس میں کسی یہودی عالم سے ملاقات اور بات چیت کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اور پھر یہود تو خود بھی قرآن کی بیان کردہ تفصیلات سے ناواقف تھے، اس لئے بھلا ان کے بتانے کا بھی کیا سوال پیدا ہوتا، اب صرف بذریعہ وحی الٰہی معلوم ہونے کی صورت باقی رہ گئی، یعنی پورا واقعہ آپ کو وحی الٰہی سے معلوم ہوا ہے، اور جس انسان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آتی ہے وہ اللہ کا نبی ورسول ہوا کرتا ہے، لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی ورسول ہیں۔

قرآن کریم نے یہاں صرف اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ آپ وہاں موجود

نہ تھے،''وما کنت لدیھم إذ جمعوا أمرھم وھم یمکرون'' کسی دوسرے سے سننے یا کتاب وغیرہ میں پڑھ کر معلوم کر لینے کا تذکرہ نہیں کیا تو اس کی وجہ اصل میں وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی کہ آپ ﷺ کے امی محض ہونے کے بارے میں پورا عرب واقف تھا، اور وہ آپ ﷺ کے اسفار وغیرہ سے بھی واقف تھے کہ کوئی ایسا سفر ہوا نہیں جس میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ قائم ہوا ہو، اس لئے یہاں صرف آپ ﷺ کے جائے واقعہ پر موجود نہ ہونے کے ذکر پر اکتفاء فرمایا، البتہ ایک جگہ اس کا ذکر بھی موجود ہے، ارشاد ہے: وما کنت تعلمھا أنت ولا قومک من قبل ھٰذا یعنی نزول قرآن سے پہلے نہ آپ ﷺ اس واقعہ سے واقف تھے اور نہ آپ ﷺ کی قوم۔

بلاغت:- " وما کنت لدیھم " فی الآیة فن لطیف یسمیٰ فی علم البیان بالاحتجاج النظری ، بعضھم یسمیه المذھب الکلامی ، وھوأن یلزم الخصم ما ھو لازم لھٰذا الاحتجاج ، والمعنی أن ھٰذا النبأ غیب لم تعرفه إلا بالوحی لأنک لم تحضر إخوة یوسف حین عزموا علیٰ ماھموا به أن یجعلوه فی غیابة الجب وھم یمکرون به ، ومن المعلوم الذی لا یخفیٰ علیٰ مکذبیک انک مالقیت أحداً سمع ذلک فتعلمته منه ، وقال بعض المحققین ان ھٰذا تھکم بمن کذبه ، وذلک من حیث أنه تعالیٰ جعل المشکوک فیه کونه علیه السلام حاضرا بین یدی اولاد یعقوبؑ ماکرین فنفاه بقوله "وماکنت لدیھم".

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ، وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ .

اور اکثر لوگ نہیں ہیں یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے، اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ یہ تو اور کچھ نہیں مگر نصیحت سارے عالم کو۔

ترکیب:- جملہ "ما أكثر ..... معطوف ہے، جملہ ما كنت لديهم پر، جملہ حرصت ..... جملہ معترضہ، اور جواب شرط یہاں محذوف ہے جس پر ماقبل کا جملہ دلالت کر رہا ہے، تقدیر یہ ہوگی، "لو حرصت علىٰ ايمان أكثر الناس فما هم بمؤمنين "جملہ ماتسئلهم ..... معطوف ہے، جملہ ما أكثر الناس پر، جملہ إن هو إلا ذكر ..... برائے بیان علت۔

معارف و حقائق

ماقبل سے ربط اور شان نزول:- "وما أكثر الناس ولو حرصت بمؤمنين" اس آیت کا ماقبل سے ربط اور شان نزول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو یہود اور کفارِ مکہ نے مشترکہ طور پر تعنتاً آپ ﷺ سے آپ کی رسالت ونبوت کا امتحان لینے کے لئے پوچھا تھا، رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا یقین تھا کہ واقعہ کے صحیح صحیح بیان کر دینے پر وہ ایمان ضرور لائیں گے، مگر بیان واقعہ کے بعد بھی جب وہ ایمان نہ لائے تو آپ کو بے حد رنج ہوا، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

إعلم أن وجه اتصال هذه الآية بما قبلها أن كفار قريش وجماعة من اليهود طلبوا هذه القصة من رسول الله ﷺ علىٰ سبيل

التعنت وأعتقد رسول الله ﷺ أنه إذا ذكرها فربما آمنوا، فلماذكرها أصروا علىٰ كفرهم فنزلت هٰذه الآية. (کبیر ج۱۸ص۱۷۸)

وما أكثر الناس الآية کا مفہوم:- وما أكثر الناس: آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت ونبوت کی واضح دلیلوں کے باوجود اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، خواہ آپ ﷺ کے دل سے یہ بات کتنی ہی لگی ہوئی کیوں نہ ہو، کیوں کہ ایمان کی دولت علم اور دلائل سے نہیں بلکہ توفیق خداوندی سے ملا کرتی ہے، لہٰذا آپ اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے رہیے اور ان کے ایمان نہ لانے پر رنج وغم ہرگز نہ کیجئے۔

انبیاء علیہم السلام طالب اجرت نہیں ہوتے:- "وما تسئلهم عليه من أجر إن هو إلا ذكرٌ للعالمين" آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ تو اخلاص کے ساتھ احکامات خداوندی کے ان تک پہونچانے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں اور اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ اس پیغام رسانی پر ان سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کر رہے ہیں، (جبکہ قریش مکہ کا یہ حال تھا کہ بغیر اجرت وہ کسی کام کے کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے) اور پھر قرآن تو ایک عمومی نصیحت ہے کہ پوری دنیا کو اس نے عبرت ونصیحت کا پیغام دے رکھا ہے اور اس پر کسی اجرت کا بھی مطالبہ نہیں ہے، تو جو اس پر ایمان لائے گا اس کے لئے رحمت وبصیرت اور دنیا وآخرت دونوں میں منافع بخش ہوگا، اور جو اس کا انکار کرے گا وہ دنیا وآخرت دونوں میں ذلیل ورُسوا ہوگا۔

بلاغت:- "وما تسئلهم عليه من أجر" هٰذا علىٰ حذف مضاف أى وما تسئلهم علىٰ تبليغ القرآن من أجر. (صفوۃ ج۲ص۶۵)

(گیارہویں رکوع کی تفسیر مکمل ہوئی، بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ)

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝ أَفَأَمِنُوْا أَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمان اور زمین میں جن پر گذر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے، اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں، کیا نڈر ہو گئے اس سے کہ آ ڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آپہونچے قیامت اچانک اور ان کو خبر نہ ہو۔

ترکیب:- جملہ کاین من آیة.....مستانفہ، جملہ یمرون.....محلاً مرفوع خبر ہے مبتداء (کاین) کی، جملہ هم عنها معرضون .....محلاً منصوب حال واقع ہے، جملہ مایؤمن أکثرهم.....معطوف ہے جملہ کاین پر، جملہ هم مشرکون.....محلاً منصوب حال واقع ہے، جملہ هم لا یشعرون.....محلاً منصوب حال واقع ہے، جملہ لایشعرون .....محلاً مرفوع خبر ہے (هم) مبتداء کی۔

غاشیة: اسم فاعل واحد مؤنث، ہر طرف سے گھیرنے والی، عقوبت اور چھا جانے والا عذاب، بغتةً اچانک۔

معارف وحقائق

دنیا کی ہر چیز خدا کی وحدانیت پر دال ہے:- "کاین من آیة" کاین بمعنی کثیر ہے، یمرون میں میں ضمیر کا مرجع وہ کفار ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے

منکر ہیں، علیھا وعنھا میں ھا ضمیر کا مرجع وہ آیات ہیں جن کا وہ دن رات مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، وھم عنھا معرضون جملہ حالیہ ہے، اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ اکثر لوگ دلائل توحید میں غور وفکر سے غافل ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ اگر یہ کافر ان دلائل میں غور وفکر نہیں کرتے، جو آپ ﷺ کی نبوت ورسالت پر دلالت کرتی ہیں، اور آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کی تصدیق نہیں کرتے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ یہ عالم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت وحکمت کے دلائل سے بھرا پڑا ہے، یہ آسمان وزمین، چاند، سورج، ستارے، سمندر، پہاڑ، شجر وحجر، جنگل ومیدان، چرند وپرند، اعلیٰ قسم کے باغات وغیرہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے، وہی کامل القدرت اور کامل حکمت والا ہے۔

وفی کل شیٔ لہ آیۃ تدل علیٰ أنہ واحد

اور کافرین کھلی آنکھوں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن ان میں غور وتدبر کرکے خدا کی وحدانیت اور اس کی قدرت واُلوہیت کا اقرار کرلیں یہ ان سے نہیں ہو پاتا، پھر اگر وہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کی دلیلوں میں غور تدبر نہیں کرتے، تو کون سی تعجب کی بات ہے۔

''یعنی: أنہ لاعجب إذا لم یتأملوا فی الدلائل الدالۃ علیٰ نبوتک، فان العالم مملوء من دلائل التوحید والقدرۃ والحکمۃ ثم انھم یمرون علیھا ولا یلتفتون إلیھا''. (کبیر ۹/۱۸/۱۷۸)

یخبر تعالیٰ عن غفلۃ أکثر الناس عن التفکر فی آیات اللہ ودلائل توحیدہ بما خلقہ اللہ تعالیٰ فی السمٰوات والارض من کواکب زاھرات ثوابت وسیارات، وأفلاک دائرات، والجمیع

مسخرات وكم في الارض قطع متجاورات ، وحدائق وجنات ، وجبال راسيات ، وبهار زاخرات ، وأمواج متلاطمات ، وقفار شاسعات ، وكم من أحياء وأموات ، حيوان ونباتات ، وثمرات متشباهات ، ومختلفات في الطعوم والروائح والالوان والصفات ، وغير ذٰلک". (ابن کثیر ج۲ص۷۶۴)

وما يؤمن أكثرهم بالله إلا وهم مشركون کا مفہوم:-

پہلی آیت میں ان کافرین کا بیان تھا جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہ تھے اور اس آیت میں ان مشرکین کا بیان ہے جو خدا کے وجود اور اس کی قدرت والوہیت کے قائل ضرور ہیں مگر ساتھ ہی خدا کی عبادت وغیرہ میں دوسروں کو شریک بھی قرار دیتے ہیں، اور اس کی عبادت وبندگی کے ساتھ ساتھ ان شرکاء کی بھی عبادت وبندگی کرتے ہیں، ان سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے تو جواب دیتے ہیں کہ اللہ ان کا خالق ہے، اور جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آسمان سے پانی کون برساتا ہے تو بھی یہی جواب دیتے ہیں کہ اللہ برساتا ہے مگر اس کے باوجود وہ پتھروں کے بنے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہیں، اور بارش کو پتھر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

"وما يؤمن أكثرهم بالله" أي يقرون بوجوده و خالقيته " إلا وهم مشركون" يعني في حال من الاحوال إلا في حال إشراكهم في العبادة غيره تعالىٰ به ، فانهم كانوا إذا سئلوا من خلق السمٰوات والارض قالوا :الله، وإذا سئلوا من ينزل من السماء ماءً قالوا: الله ، ومع ذٰلک كانوا يعبدون الحجارة ويقولون مطرنا بنوء كذا".

اور صحیحین کی روایت میں مذکور ہے کہ مشرکین اپنے (حج وعمرہ کے) تلبیہ میں

لبیک لاشریک لک، إلا شریکاً وھو لک تملکه وما ملک، کہا کرتے تھے، اور صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ مشرکین نے جب لبیک لاشریک لک کہا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بس بس یہی کافی ہے، اور اس پر کسی زیادتی کی ضرورت نہیں ہے، اور ارشاد خداوندی ہے کہ:

إن الشرک لظلمٌ عظیمٌ بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے، (لقمان:۱۳)

اور شرک عظیم یہی ہے کہ عبادت میں خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، چنانچہ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اسی نے تم کو پیدا کیا ہے۔

وفی الصحیحین ان المشرکین کانوا یقولون لبیک لاشریک لک، إلا شریکاً وھو لک تملکه وما ملک، وفی صحیح مسلم أنھم کانوا إذا قالوا البیک لاشریک لک، قال الرسول علیه السلام (قد قد) أی حسب حسب، لاتزیدوا علیٰ ھٰذا، (مسلم۱۱۸۵) وقال اللہ تعالیٰ إن الشرک لظلمٌ عظیمٌ وھٰذا ھو الشرک الأعظم یعبد مع اللہ غیرہ، کما فی الصحیحین عن ابن مسعود قلت: یا رسول اللہ! أی الذنب أعظم؟ قال "أن تجعل للہ ندّاً وھو خلقک". (بخاری ۴۴۷۷، مسلم ۸۶)

مذکورہ روایات کا حاصل یہ ہے کہ توحید خالص کے بغیر خدا کو ماننے کا دعویٰ مثل نہ ماننے کے ہے، چنانچہ وہ لوگ خدا اور رسول دونوں کے منکر ہیں، جو توحید خالص

پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

بنی اسماعیل میں بت پرستی کو سب سے پہلے رواج دینے والا شخص:-

ابو منذر ہشام الکلبی الکوفی متوفی ۲۰۴ھ کی کتاب الاصنام میں ہے کہ بنی اسماعیل نے بھی رفتہ رفتہ دوسری قوموں کی طرح بت پرستی شروع کر دی اور امت نوح کے بتوں کو اختیار کیا، اور گو دین ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی طرح وہ تعظیم کعبہ اور حج و عمرہ اور طواف وغیرہ پر قائم رہے، لیکن تلبیہ حج و عمرہ میں شرک کو داخل کر دیا اور خدائے واحد کے تلبیہ کے بجائے نبی نزار نے تلبیہ یوں شروع کر دیا، **لبیک لاشریک لک ، إلا شریکاً وھو لک تملکہ وما ملک** ،اسی طرح مضرور بیعہ کے بھی مشرکانہ تلبیے نقل کیے ہیں اور آگے لکھا ہے کہ اول شخص جس نے عرب میں دین اسماعیل کے بجائے مذہب شرک رائج کیا، اس کا نام عمرو بن ربیعہ معروف بہ لحی بن حارثہ تھا، اور وہ قبیلہ ازد کا تھا، خزاعہ کا مورث اعلیٰ، سیرت ابن ہشام میں عمرو بن لحی مذکور ہے۔ (تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۶۵۳/۵۴)

مذکورہ تفصیلات ان قوموں کی ہیں جو ابھی دین اسلام سے یا تو آشنا نہ تھیں یا یہ کہ بالکل ابتدائی مراحل میں تھیں، مگر آج زمانہ دراز گذر جانے کے باوجود بھی ان کے بقایا دنیا میں موجود ہیں، وہ دعویٰ تو بڑے کرّ و فر کے ساتھ اسلام اور اپنے مسلمان ہونے کا کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کی بت پرستی اور شرک میں وہ مکمل طور پر مبتلا ہیں، زمانہ جاہلیت کی بت پرستی اور شرک کا تذکرہ کرنے کے بعد صاحب روح المعانی تحریر فرماتے ہیں:

> اور انھیں میں سے قبر کی پوجا کرنے والے اور ان کے لئے نذریں ماننے والے لوگ بھی ہیں، جو ان سے نفع و ضرر کو وابستہ سمجھتے ہیں۔

"ومن اولئک عبدة القبور والناذرون لها المعتقدون للنفع والضرر منهن الله تعالیٰ أعلم بحاله فیها وهم الیوم أکثر من الدود. (روح ۷/۱۳/۶۷)

بلاغت :- "وهم عنها معرضون"، "إلا وهم مشرکون" فیه من المحسنات البدیعیة "السجع" وهو توافق الفاصلین فی الحرف الاخیر". (صفوۃ ج۲ص۶۵)

"أفأمنوا أن تاتیهم غاشیة" قرآن کریم کی اور بھی متعدد آیات اسی معنی ومفہوم پر دلالت کرتی ہیں، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

أفامن الذین مکروا السیئات أن یخسف الله بهم الارض او یاتیهم العذاب من حیث لایشعرون ٥ أو یاخذهم فی تقلبهم فماهم بمعجزین ٥ أو یاخذهم علیٰ تخوف فإن ربکم لرؤف رحیم ٥ (سورۃ النحل :۴۵/۴۶/۴۷) أفامن أهل القریٰ أن یاتیهم بأسنا بیاتاً وهم نائمون ٥ أوأمن أهل القریٰ أن یاتیهم بأسنا ضحیً وهم یلعبون ٥ أفامنوا مکر الله فلا یأمن مکر الله إلا القوم الخاسرون٥ (اعراف ۹۷/۹۸/۹۹)

عقلمندی کا تقاضا:- حاصل ان آیات کا یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت ورسول اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت کا انکار کرکے اپنے کو عذاب خداوندی سے محفوظ ومامون سمجھ لینا انتہائی درجہ کی حماقت وبے وقوفی ہے، کیونکہ کفر کے لئے عذاب لازم ہے، خواہ وہ عذاب اسی دنیا میں آجائے یا قیامت کے دن اس کا وقوع ہو، لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کفر وشرک کو ترک کرکے توحید خالص کو اختیار کیا جائے تاکہ دنیا وآخرت دونوں کے عذاب سے نجات حاصل ہوسکے، اور پھر اس

عذاب سے غفلت اور بے خوفی تو ایک لمحہ کے لئے بھی جائز و درست نہیں ہے، جس کے آنے کا کوئی وقت متعین نہ ہو اور جس کا کوئی علم نہ ہو، بلکہ وہ اچانک غیر شعوری پر حالت غفلت میں آجانے والا ہو، حضرت قتادہ نے غاشیۃ کا ترجمہ پڑنے والی آفت کیا ہے، اور ضحاک نے فرمایا کہ اس سے مراد آسمانی بجلیاں اور غیبی حوادث ہیں، ''غاشیۃ'' قال قتادہ وقیعۃ ، وقال الضحاک یعنی الصواعق والقوارع '' أفامنوا میں استفہام انکاری ہے، یعنی عذاب خداوندی سے انکار ہرگز مناسب نہیں ہے، ''استفہام انکاریعنی لاینبغی لھم ذٰلک النسیان والامن''. (مظہری ج۵ص۲۰۶)

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ أَدْعُوْ إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط
وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥

کہہ دے یہ میری راہ ہے، بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے، اور میں نہیں ہوں شریک بتانے والوں میں۔

ترکیب:- جملہ قل .....مستانفہ، جملہ هٰذه سبيلي .....محلاً منصوب مقولہ ہے قول کا، جملہ أدعو إلى الله.....مستانفہ برائے بیان، جملہ اتبعني.....صلہ ہے موصول (ما) کا، جملہ (أسبح) سبحٰن .....محلاً منصوب معطوف ہے، جملہ هٰذه سبيلي پر۔

معارف و حقائق

"قل هٰذه سبيلي أدعو إلى الله" بصيرة بینائی، سمجھ، دلیل، واضح رہے کہ بصیرت کا استعمال صرف دل کی بینائی کے لئے ہوتا ہے، آنکھ سے دیکھنے اور نظر کرنے کے لئے نہیں ہوتا، بصیرت کے مختلف معانی آتے ہیں، عقل، سمجھ، عبرت، دلیل و حجت، سبحٰن پاک ہے، سبحٰن مصدر ہے بمعنی تسبیح، یہ ہمیشہ منصوب ہوتا ہے اور اس کے لئے اضافت لازم ہے، اور وہ مفرد اسم ظاہر کی طرف مضاف ہو، جیسے سبحٰن الله یا اسم ضمیر کی جانب "سبحٰنه أن يكون له ولد" اور "سبحٰنك لاعلم لنا" میں۔

"أدعو إلى الله" سبيلي کی یا سے حال ہوسکتا ہے، مگر اس کا مستانفہ ہونا واضح اور ظاہر ہے، "علىٰ بصيرة" حال ہے أدعوا کے فاعل سے، یعنی میں تم کو اللہ

کے راستہ کی جانب دعوت دے رہا ہوں اس حال میں کہ میرے پاس اس کی واضح دلیل موجود ہے، ''ومن اتبعنی ''''ادعوا'' کے فاعل پر معطوف ہے، اس وجہ سے ضمیر منفصل (انا) سے اس کی تاکید لائی گئی ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ وہ مبتداء محذوف الخبر ہو، یعنی میرے متبعین بھی دعوت الی اللہ دے رہے ہیں، ''علیٰ بصیرة'' کا خبر مقدم اور (أنا) کا مبتداء مؤخر ہونا بھی درست ہے، اور ''ومن اتبعنی'' اس پر معطوف ہے۔

''یجوز أن یکون مستانفاً وهو الظاهر ، وأن یکون حالا من الیاء ،و ''علیٰ بصیرة'' حال من فاعل (أدعوا) أی أدعوا کائناً علیٰ بصیرة قوله '' ومن اتبعنی '' عطف علیٰ فاعل '' أدعوا'' ولذٰلک أکد بالضمیر المنفصل فی قوله '' أنا '' ویجوز أن یکون مبتدأ والخبر محذوف ، أی ومن اتبعنی یدعوا ایضاً ، ویجوز أن یکون ''علیٰ بصیرة'' خبراً مقدماً و'' أنا '' مبتدأ مؤخرا، و''من اتبعنی '' عطف علیه.

لفظ سبیل مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ عبداللہ کی قرأت میں'' هٰذه سبیلی '' کے بجائے'' هٰذا سبیلی '' مذکور ہے، قرأ عبد الله هٰذا سبیلی ''بالتذکیر''. (الدر المصون ج۶ ص۵۶۱)

توحید خالص کا مفہوم:- ''قل هٰذه سبیلی'' آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ کافرین ومشرکین سے علی الاعلان یہ بات کہہ دیجئے کہ توحید خالص اللہ کو ایک ماننا اور اس کی قدرت وألوہیت اور ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ قرار دینا ہی میرا طریقہ اور راستہ ہے، اور میں تم کو اسی کی دعوت دیتا ہوں، میرے پاس اللہ کی قدرت وألوہیت اور اپنی رسالت ونبوت کی بین اور واضح دلیل موجود ہے، اور میرا اتباع کرنے والوں کے پاس بھی دلیل کامل موجود ہے، انھوں نے

دلیل وحجت اور برہان وبصیرت کے ساتھ میرا اتباع اختیار کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ طریق الی اللہ کی دعوت دینا بے حجت اور بے دلیل نہیں ہے، لہٰذا اس کے اختیار کرنے سے تمہارے لئے کوئی مانع نہیں ہونا چاہئے اور ''ومن اتبعنی'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح دلیل وحجت کے ساتھ میں تم کو دعوت الی اللہ دے رہا ہوں اسی طرح میرے متبعین بھی دلیل وحجت کے ساتھ دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

''وسبحٰن اللہ'' اور اللہ ہر قسم کے شرک سے پاک ہے، نہ تو اس کی ذات میں اس کا کوئی شریک اور ساجھے دار ہے اور نہ صفات میں، اس کا عطف أدعو پر ہے، یعنی میں اس کی پاکی بیان کرتا ہوں اور تمام لوگوں کو اسی کی دعوت دیتا ہوں۔'' وما أنا من المشرکین ''یعنی میں تمہارے عقیدۂ شرک سے مکمل طور پر بیزار اور بری ہوں، اپنی نبوت ورسالت کی تبلیغ سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں تم کو اپنی بندگی کی دعوت دوں البتہ میری نبوت ورسالت کا اقرار خدا کی بندگی کا راستہ دکھانے والا ہے، اس لئے میں تم کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ پہلے میری نبوت ورسالت کا اقرار کرو تاکہ خدا کے سچے بندے بن سکو اور توحید خالص کو عملی طور پر اختیار کر سکو۔

ومن اتبعنی سے مراد صحابہ ﷺ ہیں:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ''ومن اتبعنی'' سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں، وہ بہترین طریقہ اور راہ ہدایت پر گامزن تھے، علم کا معدن اور ایمان کا خزانہ تھے، اور اللہ کا لشکر تھے، اور حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص راہِ سنت کو اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ ان کے طریقہ کو اختیار کرے جو اس دنیا سے جا چکے، اور وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں، جو اس امت کے سب سے زیادہ پاک باطن تھے، ان کا علم انتہائی گہرا تھا اور تکلف وبناوٹ ان میں نام کو نہ تھی، اللہ نے اپنے نبی کی رفاقت

اور اپنے دین کی نشر واشاعت کے لئے ان کو منتخب فرمایا تھا، تم اپنے عادات واطوار اور اخلاق کو ان کے عادات واطوار اور اخلاق کے مشابہ بناؤ، کیونکہ وہ صراط مستقیم پر گامزن تھے۔

''قال ابن عباس یعنی به أصحاب محمدؐ کانوا علیٰ أحسن طریقة، وأقصد هداية، معدن العلم، وکنز الایمان، وجند الرحمن، وقال ابن مسعود : من کان مستناً فلیستن بمن قد مات، اولئک أصحاب محمدؐ کانوا خیر هٰذه الامة أبرها قلوباً، وأعمقها علماً، وأقلها تکلفاً، قوم إختارهم الله لصحبة نبیه ﷺ ونقل دینه فتشبهوا بأخلاقهم وطرائقهم فهم کانوا علی الهدی المستقیم.

(مظہری ج۵ص۲۰۷)

فریضۂ دعوت کی انجام دہی اسی کا حق ہے جو بصیرت تامہ رکھتا ہو:-

آیت کریمہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دوسروں تک دین اسلام کی تبلیغ اسی کے لئے جائز اور مستحسن ہے جو خود راہ راست پر ہو، علم ویقین کی دولت اسے حاصل ہو اور بصیرت تامہ رکھتا ہو۔

هٰذا یدل علیٰ أن الدعا إلی الله إنما یحسن ویجوز مع هٰذاالشرط وهو أن یکون علیٰ بصیرة ممایقول وعلیٰ هدی ویقین. (کبیر۹/۱۸/۱۷۹)

مدعی اتباع کے لئے پیغام رسانی لازم ہے:-

''قل هٰذه سبیلی أدعو إلی الله علیٰ بصیرة أنا ومن اتبعنی'' کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ میرا اتباع کرنے والے ہیں وہ بھی دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، چنانچہ کلبی اور ابن زید کہتے ہیں کہ ہر اس شخص پر فریضۂ دعوت الی اللہ لازم ہے جو رسول

اللہ ﷻ کی اتباع کا دعویدار ہے، (بشرطیکہ وہ اپنے دعویٰ اتباع میں سچا بھی ہو یعنی صرف مدعی اتباع نہ ہو بلکہ اتباع کے مقتضیات پر بقدر استطاعت عمل پیرا بھی ہو)۔

" قال الكلبي وابن زيد حق علىٰ من اتبعه أن يدعو إلىٰ مادعا إليه". (مظہری ج۵ص۲۰۷)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُّوحِيْ إِلَيْهِمْ مِّنْ أَهْلِ الْقُرىٰ ط أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ط أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی ملک کی کہ دیکھ لیتے کہ کیا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنے والوں کو کیا اب بھی نہیں سمجھتے۔

ترکیب:- جملہ ما أرسلنا ..... معطوف ہے جملہ مستانفہ قل پر، جملہ "نوحی إليهم ....." محلاً منصوب صفت ہے (رجالاً) کی، جملہ لم يسيروا..... معطوف ہے جملہ أرسلنا پر، جملہ ينظروا ..... معطوف ہے جملہ يسيروا پر، جملہ "كان عاقبة ....." محلاً منصوب مفعول بہ ہے، جملہ دار الآخرة خير..... مستانفہ، جملہ إتقوا ..... صلہ ہے اسم موصول الذين کا، جملہ "تعقلون ....." معطوف ہے جملہ مستانفہ مقدرہ پر، تقدیر عبارت یہ ہے، اجهلتم فلا تعقلون.

معارف و حقائق

"وما أرسلنا من قبلك إلا رجالاً نوحي إليهم من أهل القرى" إلا رجالاً میں کافرین کے اس قول کی تردید ہے کہ (آپ کا رب اگر چاہتا تو البتہ ملائکہ کو ہماری ہدایت کے لئے نازل فرما دیتا) اور ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کی نبوت کی نفی بھی مقصود ہے۔

"رد لقولهم "لوشاء ربک لأنزل ملائكة" نفی له ، وقيل المراد نفی إستنباء النساء ونسب ذلک إلی ابن عباسؓ. (روح ۱۳/۷ ۶۸)

نوحی إليهم: حفص اور عاصم کی قرأت میں نوحی نون کے ساتھ ہے، اور باقی قراء نے اسے یوحی یاء کے ساتھ مبنی للمجہول پڑھا ہے۔ (کبیر ۱۸۰/۱۸/۹)

وماارسلنامن قبلک الآية کا مفہوم:- آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جتنے بھی انبیاء ورسل دنیا میں بھیجے ہیں وہ سب کے سب انسان، مرد اور ہماری آبادی کے رہنے والے تھے، جنگلی اور خانہ بدوش نہ تھے، البتہ ان کا امتیاز یہ تھا کہ ان کے پاس ہماری طرف سے وحی بھیجی جاتی تھی، اور جب معاملہ یہ ہے کہ سابقہ تمام انبیاء انسان ہی تھے تو پھر آپ ﷺ کے بارے میں ان کو تعجب اور انکار کیوں ہے؟

"إلا رجالاً" سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی عورت نبی بنا کر نہیں بھیجی گئی، اور "من أهل القریٰ" سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اہل بادیہ یعنی جنگل اور خانہ بدوش لوگوں میں سے کوئی نبی نہیں ہوا۔

" والآية تدل علیٰ أن الله مابعث إلی الخلق من النسوان وأيضاً لم يبعث رسولاً من أهل البادية". (کبیر ۱۸۰/۱۸/۹)

ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔

(ابن کثیر ج ۲ ص ۷۶۷)

آبادی میں رہنے والوں کو نبی بنا کر بھیجنے کی علت یہ ہے کہ صحرائی اور خانہ بدوشوں کے مقابلہ میں وہ اعلم واحلم ہوتے ہیں۔

" إن أهلها كما قال ابن زيد وغيره : وهو ممالا شبهة فيه أعلم

وأحلم من أهل البادية". (روح ۱۳/۷ ۶۸)

تنبیہ:- "وجاء بكم من البدو" سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کنعان بھی تو صحرا اور جنگل ہی تھا جیسا کہ لفظ بدو سے معلوم ہو رہا ہے، اس لئے کہ کنعان کو بدو مصر کے تمدن و حضارت کے مقابلہ میں کہا گیا ہے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی وہاں ایک بڑی آبادی تھی اور اس کی حیثیت کسی قصبہ سے کم ہرگز نہیں تھی۔

"أفلم يسيروا في الارض فينظروا كيف كان عاقبة الذين من قبلهم" یعنی ذرا دنیا کی سیر کریں اور پچھلی امتوں کے ان سرکش و نافرمان کافرین کے کھنڈرات کو دیکھیں کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان کا کیا انجام ہوا کہ وہ صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دئے گئے، ان کے اس انجام بد کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کریں اور رسول اکرم ﷺ کی تکذیب و مخالفت سے تائب ہو کر دین صحیح کو اختیار کریں۔

"ولدار الآخرة" یعنی دارِ آخرت کی حالت یا اس کی ساعت یا اس کی زندگی، اور دار آخرت سے مراد جنت ہے، یہاں لفظ حالة یا ساعة یا حياة محذوف ہے، اور "ولدار الآخرة" کی ترکیب ایسی ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے صلاة الاولیٰ أي صلاة الفريضة الاولیٰ، ایسے ہی یہاں بھی مراد دار الحالة الآخرة أو الساعة الآخرة أو الحياة الآخرة ہے۔ (کبیر، ابن کثیر، مظہری)

آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے:- مطلب یہ ہے کہ دنیا کی چند روزہ فانی زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی دائمی زندگی بدرجہا بہتر ہے جو بشکل جنت ان لوگوں کو ملے گی جو دنیا میں کفر و شرک اور معاصی سے اجتناب

کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنا شیوہ بناتے ہیں۔

" أفلا تعقلون" تو کیا تم عقل وخرد سے بالکل خالی ہو چکے ہو اور اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو، اور آخرت کی بہتری پر دلائل نقلیہ وعقلیہ کے قائم ہونے کے باوجود دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کی بہجت وخوشحالی پر فریفتہ ہو کر اسے آخرت کی زندگی پر ترجیح دیے جا رہے ہو، یعنی اگر تم اپنی عقلوں کا صحیح استعمال کرتے تو پھر ایسا ہرگز نہ کرتے۔

قراء کی ایک جماعت نے تعقلون کے بجائے " أفلم يسيروا" کی رعایت ومناسبت سے یعقلون پڑھا ہے، "وقرأ جماعة يعقلون بالياء رعياً لقوله سبحانه " أفلم يسيروا". (روح ٦٨/١٣/٧)

حَتّٰى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ ط وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ .

یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہونچی ان کو ہماری مدد پھر بچادیا جن کو ہم نے چاہا، اور پھرتا نہیں عذاب ہمارا قوم گنہگار سے۔

ترکیب:- جملہ ''استیئس الرسل.....'' محلاً مجرور مضاف الیہ، جملہ ''ظنوا .....'' مجرور معطوف ہے جملہ استیئس الرسل پر، جملہ ''قد کذبوا .....'' محلاً مرفوع خبر ہے (أنّ) کی، جملہ جاء ھم نصرنا.....'' جواب ہے شرط غیر جازم کا، جملہ فنجی من نشاء.....'' معطوف ہے جملہ جواب شرط پر، جملہ نشاء.....'' صلہ ہے اسم موصول (من) کا، جملہ'' لایرد باسنا.....'' مستانفہ۔

معارف وحقائق

ماقبل سے ربط:- ''حَتّٰى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ'' اس آیت کا تعلق آیت ماقبل ''وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا'' سے ہے، مطلب یہ ہے کہ موجودہ کافرین کو تاخیر عذاب سے خوش اور مطمئن نہیں ہونا چاہئے کیونکہ پچھلی بدکار ونافرمان قوموں نے بھی اپنے انبیاء کی جو کہ انسان ہی تھے تکذیب کی تھی اور عذاب الٰہی کے آنے میں تاخیر ہوئی، یہاں تک کہ جب ان میں مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت پیدا ہوگئی، اور امام بیضاوی لکھتے ہیں کہ حتیٰ غایت ہے کلام محذوف کی، اصل کلام یہ

ہے کہ زمانہ دراز تک عذاب کے نہ آنے اور تباہی و بربادی سے محفوظ رہنے سے ان موجودہ کافرین کو فریب میں مبتلاء نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ ان سے پہلی قوموں اور امتوں کو طویل مہلتیں دی جا چکی ہیں (یعنی قوم نوح، ہود اور صالح وغیرہ کو) یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان کے ایمان سے مایوس ہو گئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مدتِ دراز سے یہ کفر و سرکشی میں ڈوبے ہوئے عیش و آرام کی زندگی گذار رہے ہیں اور ان پر کسی قسم کی اُفتاد نہیں پڑ رہی ہے۔

''وظنوا أنهم قد كذبوا'' اہل کوفہ اور ابو جعفر کی قرأت بتخفيف الذال ہے، اس کے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ اللہ کے پیغمبروں کو یہ گمان ہو گیا کہ اس نے ہم سے کئے ہوئے وعدے کے خلاف کیا، اپنا کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا، یہ معنی چونکہ غلط اور انبیاء علیہم السلام کی شان کے خلاف ہیں اس لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تخفیف الذال والی قرأت کا انکار کر دیا اور اسے بتشدید الذال پڑھا ہے۔

''عن ابن شهاب قال : أخبرني عروة بن الزبير عن عائشةؓ أنها قالت وهو يسألها عن قول الله تعالىٰ "حتىٰ إذا استيئس الرسل" قال ، قالت : أكذبوا أم كذّبوا؟ قالت عائشةؓ : كذّبوا ، قلت فقد استيقنوا أن قومهم كذبوهم فما هو بالظن ؟قالت :أجل لعمري لقد استيقنوا بذٰلك بربها ، قلت فما هٰذه الآية ؟ قالت : هم اتباع الرسل الذين آمنوا بربهم وصدقوهم ، فطال عليهم البلاء ، واستاخر عنهم النصر"حتىٰ إذا استيئس الرسل "ممن كذبهم من قولهم وظنت الرسل ان اتباعهم قد كذبوهم جاء هم نصر الله عند ذٰلك ، حدثنا ابو اليمان ، أنبأنا شعبة عن الزهري قال : أخبرنا عروة فقلت لها :

لعلها قد كذبوا مخففة ؟ قالت معاذ الله". (ابن کثیر ج۲ص۷۹۹)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جواب کا حاصل:- حضرت عروہ کے سوال پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کے گمان کا تعلق اللہ سے نہیں بلکہ اپنے متبعین سے ہے کہ رسول جب اپنی قوم کے مکذبین کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور مصائب میں مبتلاء ہونے اور تاخیر نصرت کی بنا پر جب انھیں یہ گمان ہونے لگا کہ اب تو ان کے متبعین بھی انکار کر دیں گے یعنی مایوسی جب اس کیفیت کو پہونچ گئی تو پھر اللہ کی نصرت و مدد اس طرح آئی کہ کفار ہلاک و برباد کر دئے گئے، اور مومنین کو نجات کے ذریعہ ان پر غلبہ عطا کر دیا گیا، لیکن تخفیف الذال والی قرأت متواتر ہے اگر چہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہو، اور ان تک تواتر کے ساتھ یہ قرأت نہ پہونچی ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ تخفیف والی قرأت کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ معنی یہ ہیں کہ پیغمبروں نے یہ گمان کر لیا کہ ہم نے نصرت الٰہی کے آنے کی جو تعیین کی اس میں ہمارے فہم نے غلطی کی، یا یہ کہ قوم نے ہم سے جو ایمان لانے کا وعدہ کیا تھا تو وہ غلط وعدہ تھا اور وہ اب ایمان نہیں لائیں گے، یا یہ کہ ظنوا کی ضمیر کافرین کی جانب راجع ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایمان والوں کے حق میں خدا کی نصرت و اعانت اور کافرین پر عذاب کی تاخیر اس حد کو پہونچ گئی کہ کافرین یہ خیال کرنے لگے بلکہ انھیں اس کا یقین ہو گیا کہ انبیاء نے ہم کو جو توحید کی دعوت دی تھی اور ایمان نہ لانے کی صورت میں جس عذاب کی دھمکی دی تھی وہ جھوٹ اور "ڈھکوسلہ" تھا، یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں پر ایمان لانے والوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ پیغمبروں نے ہم سے جو فتح و نصرت اور کافرین کی ہلاکت کا وعدہ کیا تھا وہ غلط نکلا، اور معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا، مذکورہ تفصیل جو ذکر کی گئی

تخفیف الذال والی قرأت پر مبنی ہے، اور اگر کذبوا کو بتشدید الذال پڑھا جائے جیسا کہ ابو جعفر اور کوفیین کے علاوہ دوسرے لوگوں نے پڑھا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی قرأت بھی یہی ہے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء نے اندازہ سے عذاب کا جو وقت مقرر کیا تھا اس وقت پر جب عذاب نہیں آیا تو ان کو یہ خطرہ ہو گیا کہ جو ایمان لا چکے ہیں وہ بھی ایمان سے پھر نہ جائیں کیونکہ ہم نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا، اس وقت اللہ نے انبیاء علیہم السلام سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دکھایا کہ کافرین کو بذریعہ عذاب ہلاک و برباد کر دیا اور انبیاء و مومنین کو عذاب سے بچالیا، اس طرح مومنین کو کافرین پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ (ماخوذ از تفسیر مظہری ج ۵ ص ۲۰۸)

" جَاءَ هُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ" (فنجّی) کو ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے ایک نون، جیم کی تشدید اور یاء پر فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس صورت میں یہ لفظ فعل ماضی مجہول باب تفعیل سے ہوگا اور من محلاً مرفوع ہوگا، اور ان کے علاوہ دوسرے قراء نے اسے باب افعال سے دونون، جیم کی تخفیف اور یاء کے سکون کے ساتھ ننجی پڑھا ہے یعنی باب افعال سے مضارع متکلم کا صیغہ (معروف) من اس صورت میں محلاً منصوب ہوگا، (من) سے مراد انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے حضرات ہیں چونکہ نجات پانے والے یہی تھے اس لئے صراحتاً اس کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ مبہم طور پر من نشاء فرمایا، (مظہری ج ۵ ص ۲۰۸) "هم الرسول والمومنون به".

(روح ۷/۱۳/۷۲)

عذاب الٰہی وقت موعود پر آ کر رہتا ہے:- "وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ" یعنی ہمارا عذاب وقت موعود پر آ کر رہتا ہے وہ مجرمین یعنی کافرین سے دفع کر دیا جائے ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ واقع ہو کر رہتا ہے خواہ بدیر سہی،

آیت کے اس ٹکڑے میں رسول اللہ ﷺ کے ہم عصر کافرین کے لئے کھلی ہوئی دھمکی اور وعید موجود ہے کہ اگر وہ اپنے جرم کفر وشرک سے باز نہ آئے تو عذاب الٰہی سے ہرگز محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

" ولا یخفیٰ مافی الجملة من التهدید والوعید لمعاصری النبی ﷺ ". (روح ۷/۱۳/۷۳)

(**تنبیہ (۱)**) انبیاء علیہم السلام سے خطاء اجتہادی کا واقع ہوجانا مستبعد نہیں ہے البتہ دوسرے مجتہدین کی طرح ان کو خطا پر باقی نہیں رکھا جاتا، بلکہ مطلع کرکے اسے ختم کردیا جاتا ہے، چنانچہ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ کا یہ خواب دیکھنا کہ میں بیت اللہ کا طواف کررہا ہوں، پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ روانہ ہوجانا، لیکن عمرہ ادا نہ کرسکنا، انبیاء کی خطاء اجتہادی کی نظیر ہے، البتہ ان کو اس خطا پر باقی نہیں رکھا جاتا، چنانچہ اسی واقعہ میں ہوا یہ کہ ۷ھ میں آپ ﷺ نے صحابہ کو لیکر عمرہ فرمایا اور ۸ھ میں مکہ فتح ہوکر آپ کے قبضہ میں آگیا اور آپ ﷺ کے خواب کی تعبیر واضح طور پر سامنے آگئی۔

(بیان القرآن ج۵ ص۱۰۳)

(**تنبیہ (۲)**) اللہ کی غیر محدود رحمت ومہربانی سے مایوس ہونا کفر ہے لیکن ظاہری حالات واسباب کے اعتبار سے ناامیدی کفر نہیں، یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ فلاں چیز کی طرف سے جہاں تک اسباب ظاہری کا تعلق ہے مایوسی ہے، لیکن حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے مایوسی نہیں، آیت "حتیٰ إذا استیئس الرسل "میں یہی مایوسی مراد ہے، جو ظاہری حالات وآثار کے اعتبار سے ہو، ورنہ پیغمبر خدا کی رحمت سے کب مایوس ہوسکتے ہیں۔

(**تنبیہ** (۳)) کفر کا وسوسہ کفر نہیں، نہ کسی درجہ میں ایمان یا عصمت کے منافی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہم اپنے دلوں میں ایسی چیزیں (بے اختیار) پاتے ہیں جن کے زبان پر لانے سے ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایسا پاتے ہو؟ عرض کیا ہاں، فرمایا "ذاک صریح الایمان" یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے۔

"عن أبی هریرةؓ قال : جاء ه (أی النبی ﷺ) أناس من أصحابه فقالوا یا رسول الله نجد فی أنفسنا الشیٔ نعظّم أن نتکلم به مانحب أن لنا وأنا تکلمنا به قال أو قد وجدتموه ، قالوا نعم ،" قال ذاک صریح الایمان ". (ابوداؤد ص ۶۹۷)

فائدہ:- حدیث پاک کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وسوسہ کا آنا ایمان کی علامت ہے، یا یہ کہ وسوسہ خالص ایمان ہے، کیوں کہ وہ تو شیطان کے مکر و تسویل کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، تو پھر اسے ایمان یا خالص ایمان کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وسوسہ کو قبول نہ کرنا، اسے دل میں نہ بٹھانا اور رد کر دینا، اور اس قدر برا سمجھنا کہ زبان سے اس کا ادا کرنا بھی انتہائی گراں معلوم ہو یہ ایمان اور خالص ایما کی علامت ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ط مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو، کچھ بنائی ہوئی بات نہیں، لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔

ترکیب:- جملہ ''قَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَاب.....'' جواب ہے قسم مقدر کا، جملہ ''ما كان حديثا .....'' مستانفہ، جملہ ''يفترى.....'' محلاً منصوب صفت ہے (حديثاً) کی، جملہ ''يومنون .....'' محلاً مجرور صفت ہے لقوم کی ''لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَاب'' ھم ضمیر راجع ہے انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی جانب یا حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے قصہ کی جانب۔

" أى فى قصص الأنبياء وامتهم أو فى قصة يوسف وإخوته".

(مدارک ج۲ ص۲۴۰)

معارف وحقائق

لقد كان فى قصصهم الآية کا مفہوم:- مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے قصوں یا حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے واقعہ میں ان صاحب عقل وخرد لوگوں کے لئے بڑی عبرت ونصیحت ہے جن کو اللہ

نے عقل سلیم سے نوازا ہے، اور جن کی عقلیں محسوس پرستی سے خالی ہیں، کیا فرمانبرداری کے نتیجہ میں کنویں کی تاریکی سے نکال کر تخت شاہی پہ پہونچا دینا، اور صبر کے نتیجہ میں عزت وسلامتی کا اعلیٰ مقام عطا کر دینا اور مکر وفریب کی پاداش میں ذلت ورسوائی کے گڈھے میں ڈھکیل دینا کم عبرت آفریں ہے۔

" أی لذوی العقول السلیمة المبراة عن شوائب الأنف والرکون الی الحس، حیث نقل من غیابة الحب إلیٰ عنایة الحب ومن الحصیر الی السریر فصارت عاقبتة الصبر والسلامة والکرامة، ونهایة المکر الخزی والندامة". (مظہری ج۵ص۲۰۹، مدارک ج۲ص۲۴۰)

"مَا كَانَ حَدِيْثاً يُفْتَرى" یعنی قرآن اور اس میں بیان کردہ واقعات منزل من اللہ ہیں، محمد ﷺ کے وضع کردہ نہیں ہیں، جیسا کہ کفار کا خیال ہے۔

"مَاكَانَ الْقُرْآنُ حَدِيْثاً مفتَرى كما زعم الكفار". (مدارک)

مطلب یہ ہے کہ قرآن بذات خود اور اس میں جو واقعات بیان کئے گئے وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، خصوصاً قصۂ یوسف علیہ السلام تو وہب بن منبہ کی روایت کے مطابق پچھلی تما آسمانی کتابوں میں موجود ہے، اس کے باوجود یہ کہے جانا کہ قرآن محمد ﷺ کا کلام ہے کہاں کی عقلمندی ہے؟

" قال وهب إن الله تعالیٰ لم ینزل کتاباً إلا وفیه سورة یوسف تامةً کما هی فی القرآن والله أعلم". (مظہری)

(مگر وہب بن منبہ کا یہ قول محل نظر ہے جس کی وضاحت ماقبل میں کی جا چکی ہے)

"وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ" اس سے مراد تورات وزبور اور تمام آسمانی کتابیں ہیں جو انبیاء سابقین پر نازل ہوئی تھیں۔

ضروریات دین کے تمام اصولی مباحث قرآن میں موجود ہیں:-

"وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ" مطلب یہ ہے کہ ضروریات دین کی تمام چیزیں خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات ومعاملات اور اخلاق ومعاشرت سے یا حکومت وسیاست سے، اصولی اعتبار سے تمام کی تمام قرآن میں موجود ہیں، خواہ براہ راست یا حدیث رسول، اجماع امت یا قیاس کے واسطہ سے، کیونکہ حدیث سے ثابت شدہ مسئلہ بھی ثابت بالقرآن ہی ہے، ارشاد خداوندی ہے، "وما أرسلنا من رسولٍ إلا ليطاع" (سورہ نساء ۶۴) ہم نے رسول کو اسی لئے بھیجا تا کہ اس کی اطاعت کی جائے، وقال تعالیٰ: أطيعوا الله وأطيعوا الرسول" (مائدہ ۹۲) کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول کا، وقال تعالیٰ: ماأتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا" (سورہ حشر ۷) رسول جس کام کے کرنے کا حکم دیں اسے اختیار کرو اور جس کام سے منع کر دیں اس سے باز رہو، اور اجماع امت سے ثابت ہونے والے احکام بھی قرآن ہی کا حکم ہیں، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: "ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدى ويتبع غير سبيل المومنين نوله ماتولىٰ" (سورہ نساء ۱۱۵) ظہور ہدایت کے بعد جو شخص رسول سے کٹ جائے گا اور مومنین کے راستہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو اسی کی اختیار کردہ راہ پر پھیر دیں گے، اور قیاس صحیح سے ثابت شدہ مسئلہ بھی ثابت بالقرآن ہی ہے ارشاد خداوندی ہے: "فاعتبروا يا أولي الابصار"۔ (سورہ نحل ۶۴)

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ کا مفہوم:- اور قرآن ضلالت وگمراہی اور شرک وکفر کی تاریکی سے نکال کر راہ راست اور نور ایمان کی روشنی عطا کرنے والا ہے، اور دنیا وآخرت دونوں کی کامرانیوں سے نوازنے والا ہے ان لوگوں

کو جو اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں۔

قرآن کی ہدایت ورحمت تو پوری دنیا کے لوگوں کے لئے عام ہے مگر اس کے ہدایت ہونے سے نفع یاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس پر ایمان لے آئیں، اس لئے خاص طور پر انھیں کا تذکرہ فرمایا۔

" هدیً " من الضلالة " ورحمة " ینال بها خیر الدارین " لقوم یومنون " یصدقون تصدیقا معتدا به وخصوا بالذکر المنتفعون بذلک". (روح ۱۳/۷، ۱۴/۷)

" ولٰکن تصدیق " عام قراء نے " تصدیق " اور اس کے بعد تینوں جملوں کو منصوب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ یہ کان مقدر کی خبر ہیں، تقدیر عبارت " ولکن کان تصدیق " ہوگی، اور حمران بن اعین، عیسیٰ کوفی اور عیسیٰ ثقفی نے " تصدیق " اور اس کے مابعد کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ وہ مبتداء مضمر کی خبر بن رہے ہیں، تقدیر عبارت " ولکن هو تصدیق " ہوگی، " أی: الحدیث ذو تصدیق " اور عربوں سے اس قسم کی ترکیب میں نصب اور رفع دونوں مسموع ہے۔

ذوالرمة کہتا ہے ؎

وما کان مالی من تُراث ورثته ولادیةً کانت ولا کسب ماثم
ولٰکن عطاء الله من کل رحلةٍ إلیٰ کل محجوب السرادق خِضْرَمِ

اور لوط بن عبید کا شعر ہے ؎

وانی بحمد الله لامال مسلم أضدت ومعطی الیمین محالف
ولٰکن عطاء الله من مال فاجرٍ قصی المحمل مُعورٍ للمقارف

(الدر المصون ج۶ ص۵۷۰)

دونوں شعروں میں عطاء منصوب اور مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے، شیخ ابو منصور ماتریدی فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے، قریش اور اہل مکہ کی ایذاؤں پر صبر کی تلقین ہے، کیونکہ برادران یوسف علیہ السلام تو دین میں ان کے موافق تھے، اور ایک باپ کی اولاد تھے، اس کے باوجود انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مکر فریب کیا اور کتنی تکلیف پہونچائی جبکہ وہ اپنے فعل کی شناعت وقباحت سے واقف تھے، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی ایذاؤں پر صبر کیا اور ان کو معاف کردیا، تو آپ ﷺ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ اپنی قوم کی ایذاؤں پر صبر کریں کیونکہ یہ تو کافر وجاہل ہیں، اور اپنے فعل کی شناعت وقباحت سے ناواقف ہیں۔

" قال الشيخ ابو منصور في ذكر قصة يوسفؑ وإخوته تصبير رسول الله ﷺ علىٰ أذى قريش كان يقول إن إخوة يوسفؑ مع كونهم موافقا له في الدين وكانوا أبناء رجل واحد، عملوا بيوسف ماعملوا من الكيد والمكر، وهم يعملون قبح صنيعهم فصبر يوسفؑ علىٰ ذٰلك وعفا عنهم، فأنت أحق أن تصبر علىٰ أذى قومك فإنهم كفار جهال لايعلمون قبح صنيعهم". (مظہری ج۵ ص۲۰۹)

آج بروز جمعہ، بتاریخ ۲۸ رصفر مطابق ۲ رجون ۲۰۰۰ء، سورہ یوسف کی تفسیر مکمل ہوئی۔

فالحمد لله حمداً كاملاً والصلوٰة والسلام علىٰ سيدنا ومولانا محمد ﷺ دائماً۔

انوار احمد اعظمی خیرآبادی، خیرآباد، ضلع مئو

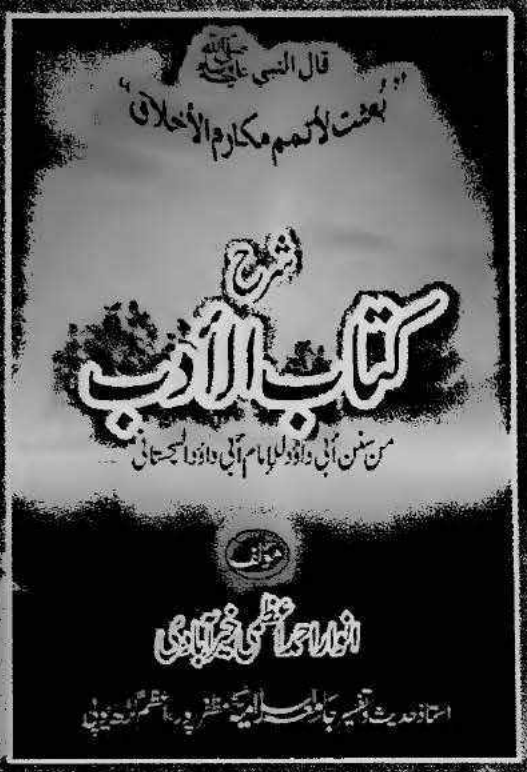

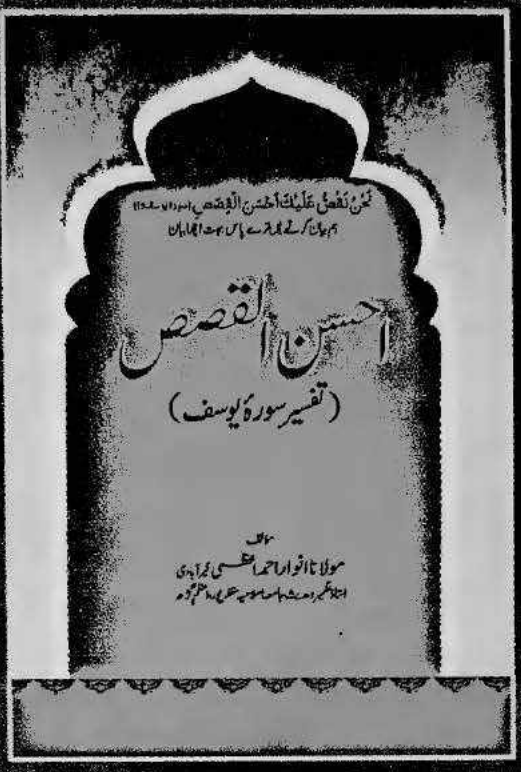

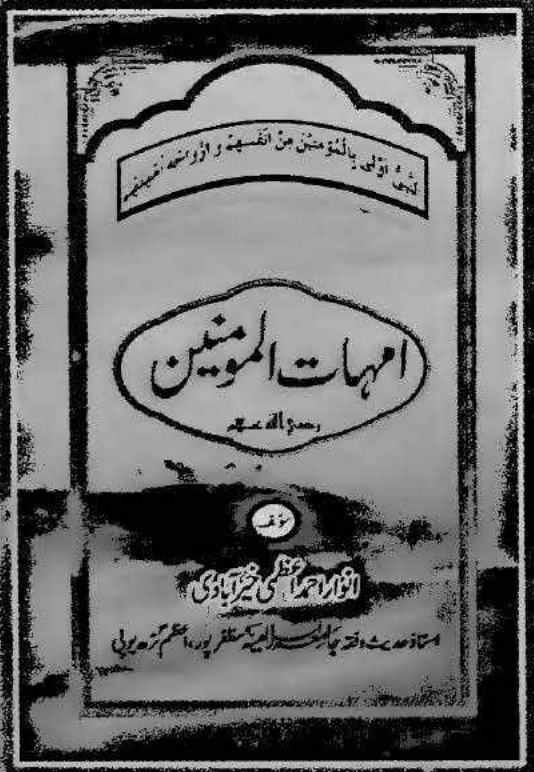

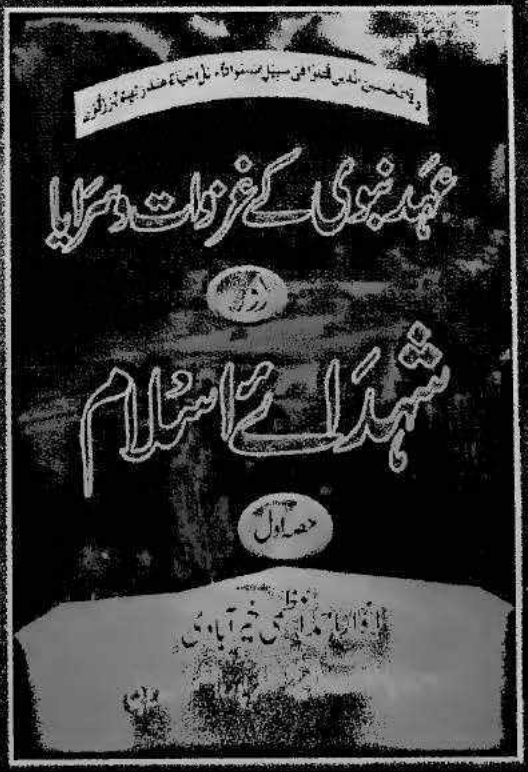

Designed & Printed by: Farid Book Depot (Pvt. Ltd.) 011-23279998